خوبصورت کہانیوں کا انتخاب
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ

اپنی روایت کے عین مطابق آپ کا
پسندیدہ ماہنامہ
پاکیزہ
اپریل ۱۹۸۰ء میں اپنا ساتواں
سالگرہ نمبر
پیش کر رہا ہے
اس سالگرہ نمبر کی تیاریاں جاری ہیں۔ بہنیں اپنی نگارشات جلد از جلد بھجوا دیں
پاکیزہ کا "سالگرہ نمبر" ہمیشہ ہی نئی روایتیں قائم کرتا ہے
انشاءاللہ یہ سالگرہ نمبر بھی آپ کی توقعات پر پورا اترے گا
پاکیزہ، پوسٹ بکس نمبر ۶۶۲، کراچی
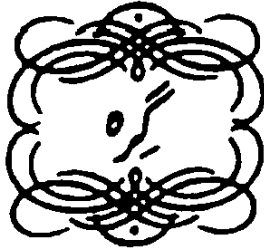
ڈائجسٹ

ترکی فرماں روا سلطان سلیم کے عہد کی ایک دلگداز داستان جو کئی داستانوں پر مشتمل ہے۔ تیسری داستان
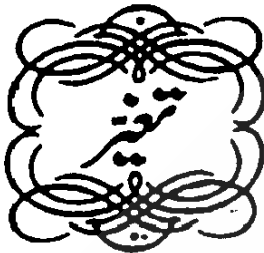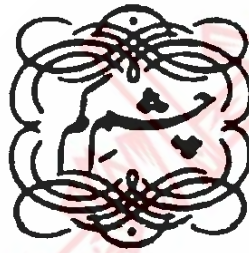
ایک نطین مجرم کی عبرت اثر کہانی جس کے پاس جانے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت موجود تھا امریکی قلمکار ہنری ایلس کی دل پذیر تحریر

نگاہ کی کمزوری سے لوگوں کو بڑے نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں مگر بعض اوقات اس خامی سے فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں

وقت کے ساتھ پرانی روایتوں کے بت ٹوٹ رہے ہیں۔ تعصب بھی ختم ہو رہا ہے امریکا کے مایہ ناز مصنف بل پرونزی کی تحریر

ترقی کی خواہش ہر آدمی میں ہوتی ہے لیکن یہ حد سے بڑھ جائے تو شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے امریکا سے تازہ ترین ایک شاہکار کہانی

اپنے پسندیدہ عجیب و غریب چور نک ویلوٹ کے لیے نک نے اپنی فیس بڑھا کر پچیس ہزار ڈالر کر دی ہو امریکی ادیب ایڈورڈ ڈی ہاک کے قلم سے نکلا ہے

مشرق کی سب سے پُراسرار سرزمین مصر پر کھیلا جانے والا ڈراما۔ ریاض عالم کی ہوشربا سرگزشت آپ کے پسندیدہ قلمکار ش صغیر ادیب نے اس سلسلے کو لکھا ہے

(۶۲)

جلد ۱۰ شمارہ ... مارچ ... قیمت: ... روپے — زرسالانہ: ... روپے — خط وکتابت کا پتہ ...

نگران:- معراج رسول
مدیر اعلیٰ:- اقبال پاریکھ
مدیر:- ماہ جبیں ایم اے
مصور:- فرہنگ قمر
منتظم اعلیٰ:- غلام کبریا

پبلشر: ماہ مبین ایم اے - مقام اشاعت: ۱۴/۲-۳-۴-۱۰ ناظم آباد کراچی پرنٹر: منظور احمد خان مطبوعہ: جاوید پریس آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

فروری کے شمارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ اپریل کا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ اس وقت یہ بات اختیار میں معلوم ہوتی تھی اور نمبر کے لئے تیاری بھی کر لی گئی تھی مگر کاغذ نے ہمارے سارے پروگرام کو متزلزل کر دیا ہے۔ اب یہ ممکن نہیں رہا کہ اپریل کا شمارہ خاص نمبر ہو۔ آپ نے خاص شمارے سے یقیناً توقعات وابستہ کر لی ہوں گی۔ آپ کو نمبر کے ملتوی ہونے سے جو ذہنی کوفت ہوئی ہے اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کاغذ کے دام غیر معمولی بڑھ گئے ہیں اور آثار ایسے ہیں کہ آئندہ ایک دو مہینے میں دام مزید بڑھیں گے ہم نے اس شمارے تک کوشش کی ہے کہ پرچے کی قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے اور اس کے لئے ہمیں نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ اگر نقصان برداشت سے باہر ہو گیا تو قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو جائے گا۔

جدہ سعودی عرب سے جاوید اختر تحریر فرماتے ہیں: "اس دفعہ فرعون کی قسط میں کچھ جان تھی۔ سسپنس کا ٹائیٹل اس دفعہ بھی اور پچھلی مرتبہ بھی سخت مایوس کن تھا اور اس دفعہ تو تخیل ایک معروف پرچے کے کسی گزشتہ شمارے سے مطابقت رکھتا ہے۔ پلیز ذرا ٹائیٹل پر توجہ دیں۔ محی الدین نواب کی کہانی "حیا آتی ہے" کافی دلچسپ تھی۔ خیران کی کیا بات ہے۔ جیسی ہیڈلے چیز کے ناول نے پرچے میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آپ اس خوبصورت انتخاب پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ خاص نمبر میں چیز کا ناول شامل ہونا چاہئے۔ ورنہ احتجاجاً پرچہ نہیں خریدا جائے گا۔ الیاس سیتاپوری کی سلسلے وار کہانی "خدنگِ جستہ" بھی اچھی لگی پسند آئی۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر وہ مکمل اور مربوط کہانی لکھا کریں۔ دیوتا اور فرعون ہی کیا کم ہیں انتظار کرنے کے لئے۔ باقی کہانیاں اچھی تھیں ایک کہانی "سدا سہاگن" کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی کیا وہ پرچہ ہمیں مل سکتا ہے؟ ہم نے کہانی کی بے پناہ تعریف سنی ہے۔ غالباً ایم اے راحت نے لکھی تھی۔"

جاوید اختر ــــ ٹائیٹل آپ کو پسند نہیں آیا، معذرت چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب ہمارے لئے ٹائیٹل بناتے ہیں۔ وہ دوسروں کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے کسی ٹائیٹل کے خیال میں توارد ہو گیا ہو۔ اس پرچے کا ٹائیٹل بہت اچھا ہے۔ حسبِ سابق اپنی رائے سے مزید مطلع کیجئے گا ــــ نواب صاحب کی کہانی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ خاص شمارے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے۔ چیز کا ناول آپ جاسوسی ڈائجسٹ کی آئندہ اشاعت میں پڑھ سکیں گے۔ آپ کا پیغام الیاس صاحب تک پہنچا دیا گیا ہے ــــ "سدا سہاگن" محی الدین نواب کی معرکتہ الآرا کہانی تھی۔ اس کہانی کے بارے میں اب بھی ہمیں خطوط ملتے رہتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح وہ شمارہ آپ کے لئے حاصل کر لوں۔ ملتے ہی ایئر میل سے بھیج دوں گا۔

فروری کے شمارے میں محی الدین نواب کی تاثرانگیز کہانی ــــ "حیا آتی ہے" کے بارے میں لاتعداد خطوط موصول ہوئے ہیں۔ کچھ قارئین کے اسمائے گرامی یہ ہیں ــــ محمد رزاق حیدر آباد۔ سلیم قریشی فیصل آباد۔ جاوید فاضل کراچی۔ رخسانہ اقبال کراچی۔ فرحت نسیم لاہور۔ نسیم مغل پشاور۔ کاظم رضا ملتان۔ یونس کریم سکھر۔ سعید ہاشم کوئٹہ۔ شکیل احمد کراچی۔ فرزانہ نور محمد کراچی۔ شگفتہ نسیم کراچی۔ راؤ خورشید ملتان۔ دردانہ وسیم راولپنڈی۔ غلام مصطفےٰ گوجرانوالہ۔ نذیر احمد شبیر شاہ کراچی۔ منیر حسین شگفتہ کراچی۔ یٰسین مولی لندن۔ اکبر حمید کوئٹہ۔ انعام الحق چترال۔ صوفیہ اکرام جدہ سعودی عرب۔ نسیم بٹ وہاڑی۔ صغیر کمال طیر کراچی۔ ہاشم رضا گجرات۔ قیوم بٹ گوجرانوالہ۔ رانا حامد احمد لاہور۔ صفیہ اکرام کراچی۔ جاوید کاظمی لاہور۔ نور محمد مغل نواب شاہ۔ اقبال حسین آزاد کراچی۔ منصور کمال ایبٹ آباد۔ حکیم احمد گجرات۔ سلیم ناصر لاہور۔ محمد قوی کراچی۔ نذر الاسلام کراچی۔ مستنیز الاسلام دمام سعودی عرب۔ اقبال ہاشمی کوئٹہ۔ عبدالستار چوہان کراچی۔ سلیم ہارانی سکھر۔ حنیف عزیز کراچی۔

خالد رفیع طاہر لاہور سے لکھتے ہیں: "اس مرحلے پر خاص نمبر کا پروگرام مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہماری جیب کا بھی خیال کیجئے...... الیاس سیتاپوری کی کہانی خدنگِ جستہ بے حد دلچسپ ہے۔ انہیں میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ فرہنگ قمر کو خوبصورت چہرے تراشنے پر دلی مبارکباد۔ مجھے آپ کے پرچے سے دلی لگاؤ ہے۔ کچھ باتیں ویسے ہی دلچسپ معلوم دیتی ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ لاہور میں عید کے دوسرے روز کو ٹڈو اور تیسرے روز کو مردہ کہتے ہیں۔ میں یہ پڑھ کر حیران ہوا تھا کہ آخر کراچی میں کیا کہتے ہوں گے۔ لاہور آنا ہو تو ملاقات کیجئے گا۔ کچھ دیر سسپنس کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں گے۔ ایک بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ہم ڈاکٹروں میں صنفِ نازک سے کشش رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے جو کہانیاں عام لوگوں کو پسند آتی ہیں، وہ ہم پسند نہیں کرتے۔"

خالد رفیع طاہر! چلئے آپ کی بات ہو گئی۔ ہم نے خاص نمبر ملتوی کر دیا ہے۔ آپ کی دلی مبارکباد الیاس سیتاپوری اور فرہنگ قمر تک پہنچا دی گئی ہے۔ کراچی میں عید کے دوسرے روز کو باسی عید کہتے ہیں۔ لاہور آیا تو ضرور ملوں گا۔ صنفِ نازک کی کشش ختم ہونے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا تو خیال ہے کہ ڈاکٹر حضرات سے کچھ زیادہ ہی لڑکیوں کی طرف کھنچتے ہیں میرے دوست کے ایک بھائی اپنے کالج کی پانچ لڑکیوں سے بیک وقت عشق فرما رہے ہیں۔ نرسوں کے معاملے میں بھی آپ لوگ خاصے بدنام ہیں۔ ممکن ہے یہ بات آپ خود میں محسوس کر رہے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جی جان سے پڑھائی میں لگے ہوئے ہیں۔ بہرحال اس موضوع پر بالمشافہ گفتگو بہتر رہے گی ورنہ یہ دونوں صفحے اسی کی نذر ہو جائیں گے۔

فیصل آباد جیل سے سلیم شہزاد گجراتی صاحب! بھائی آپ چھ مئی ۸۰ء سے اکتوبر ۸۰ء تک کے شمارے طلب کئے ہیں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے پاس پرانے شمارے نہیں ہوتے۔ اپنے دوست سے کہئے کہ وہ کسی الکٹری کی دکان سے یہ پرچے حاصل کر لیں۔ آپ کی مبارکباد ان سطور کے ذریعے الیاس سیتاپوری، ش م جمیل اور ناہید سلطانہ اختر تک پہنچ جائے گی۔ میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ پر اپنا کرم فرمائے اور آپ اپنی موجودہ اذیت سے نجات حاصل کر سکیں۔

خوشاب سے محمد صدیق طاہر عابد کا خط ہے لکھتے ہیں: "سسپنس کا سرورق اگر بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تو ممنون رہوں گا۔ فرہنگ قمر سے کہانیوں کے انداز کے مطابق تصویریں بنوائی جائیں تو مہربانی ہوگی ــــ ضیاء تسنیم بلگرامی کو ہمارے بزرگوں کی داستانِ حیات سنانے کے متعلق لکھنے پر ان کا شکریہ۔"

محمد طاہر صدیق عابد صاحب! یہ صرف آپ کا نام ہے یا آپ کے سارے دوستوں کا؟ اگر آپ کا نام ہے تو ازراہِ کرم اسے مختصر کرنے کی کوشش کریں۔ سرورق کے لئے ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہر مرتبہ خوب سے خوب تر ہو۔ پھر بھی اگر آپ کو شکایت ہے تو ہم اسے دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ فرہنگ قمر کی تصویریں کہانیوں کے عین مطابق ہوتی ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں اجاگر کرنے کے لئے وہ پوری پوری رات تصویروں پر کام کرتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کو کس تصویر پر اعتراض ہے۔ ضیاء تسنیم بلگرامی صاحبہ تک آپ کا پیغام پہنچ گیا ہے۔

کراچی سے سید ارشد علی لکھتے ہیں: "سرورق میں کچھ خوشگوار تبدیلی ہونی چاہئے کیونکہ صورت سے ہی کسی شے کے اوصاف واضح ہوتے ہیں۔"

سید ارشد علی ــــ کس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں آپ؟ آپ نے اس بارے میں تو کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔

محمد سلیم صادق، ڈھنڈو ڈھیری (یہی نام ہے نا!) آپ کے ارسال کردہ لطیفے بہت گھسے پٹے ہیں۔ ذرا اچھے اچھے اور نئے نئے لطیفے ارسال کریں تو شائع ہو جائیں گے۔

عدنان، نواب شاہ ــــ آپ کو ساس سے اتنی چڑ کیوں ہے؟ میرا خیال ہے ابھی آپ کی شادی نہیں ہوئی ورنہ ساس کے موضوع پر آپ بھی کچھ لطیفے ارسال کر چکے ہوتے۔

خان پور سے اعجاز احمد چوہدری صاحب! بلاعنوان کہانی کے لئے کوپن ہر ماہ کی دس تاریخ تک قبول کئے جاتے ہیں، ہو سکتا ہے آپ کا کوپن دیر سے پہنچا ہو۔ دوسری بات یہ کہ نتیجہ ہماری مرضی سے نہیں نکلتا بلکہ ججوں کے فیصلے کے مطابق نکالا جاتا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ججوں کا فیصلہ آخری ہوا کرتا ہے۔

اس ماہ جگہ کی کمی کے سبب بلاعنوان کا نتیجہ نہیں دیا جا رہا۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ دونوں مہینوں کا نتیجہ ایک ساتھ شائع کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی جن خطوط کے جواب نہیں دیئے جا سکے، ان سے معذرت کے ساتھ اقبال چاہتے ہوئے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ

خون آشان

الیاس سیتاپوری

زکریا اپنے گھوڑے کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اڑ چکی تھی، وہ سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس لیے راستے میں چند گھڑ سواروں کو گھٹ بھاگتے دیکھا تو اسے شبہ گزرا کہ شاید انہی میں وہ مخبر چری قاصد شامل ہیں جو سنان پاشا کا خط لے کر سلطان کے پاس سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے ہلاک کر دیا جائے تو وہ یقینی طور پر سلطان کی خدمت میں سب سے پہلے پہنچے گا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہا کہ ممکن ہے ان میں سنان پاشا کے نامہ بر نہ ہوں۔

رات کو اسے رک جانا پڑتا تھا۔ پورے ملک میں سرائے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ ان میں قیام کر سکتا تھا مگر وہ عموماً کسی مسجد میں ہی رہنا پسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ سوچتا تھا کہ اگر وہ خود دوسرے نامہ بروں کو ہلاکت کے بارے میں سوچ سکتا ہے تو دوسرے بھی اسی طرح سوچ سکتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ کہیں اور کسی وقت بھی ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

مسجدوں میں اسے جن نظروں سے دیکھا گیا وہ کبھی کبھی پریشان کن ہو گیا تھا۔ اس سے لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے مگر وہ نہایت مختصر اور گول مول جواب دے کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اس کو ایک بات پر بڑی حیرت تھی۔ جھیل وان کے کنارے جو کچھ پیش آیا تھا، اس کا راہ میں ملنے والی آبادیوں کو کوئی علم نہ تھا۔ وہ راہ کی صعوبتیں جھیلتا ہوا اعانہ بازی سے چند میل جنوب میں دریائے سقریہ کی ایک ساحلی بستی میں دم لینے کے لیے رک گیا۔ معلوم نہیں کیوں زکریا نے سوچا کہ یہاں کسی مسجد میں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اس کو کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کی سرائے میں گیا۔ سرائے نہایت مختصر تھی۔ دس بارہ تنگ و تاریک کوٹھریاں، ان کے سامنے ایک طولانی مسقف دالان۔ اس دالان میں مسافر اپنے گھوڑے باندھتے تھے۔ گھوڑے کی لید اور گھاس دانے کی ملی جلی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سرائے کے سامنے ایک دو منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ نچلے حصے میں سرائے کے مالک کے ملازم رہتے تھے اور بالائی حصے میں خود مالک سرائے رہتا تھا۔ اس کا اپنا مکان تو بستی ہی میں تھا مگر وہ .... صبح سے شام تک یہیں رہتا تھا۔ مغرب کے وقت بستی میں چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہیں رہ جاتا تھا۔

زکریا سرائے میں پہنچا اور سرائے کے مالک سے ملاقات کی۔ زکریا نے پوچھا۔ "برادرِ عزیز! کیا کوئی کوٹھری خالی ہے؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ "کوئی کوٹھری خالی نہیں ہے۔ اگر چند گھنٹے پہلے آ جاتے تو کئی کوٹھریاں خالی مل جاتیں۔"

زکریا کا ماتھا ٹھنکا۔ پوچھا۔ "چند گھنٹوں میں کون کون آ گیا یہاں؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ "تین نوجوان مسافر جو قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ یہ کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔ اگر تم چاہو تو کل تمہیں ایک کے بجائے تین کمرے مل جائیں گے۔"

زکریا خوف سے سہم گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "ان تینوں نوجوان مسافروں کے گھوڑے کہاں ہیں؟"

سرائے کے مالک نے دالان کی آخری تین کوٹھریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رہے ان کے گھوڑے۔ اگر تم چاہو تو میں ان نوجوانوں سے تمہارے لیے درخواست کروں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تمہیں اپنے ساتھ ٹھہرا سکتا ہے۔"

زکریا نے بے دلی سے جواب دیا۔ "نہیں، میں کسی کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔"

سرائے مالک کی طمع نے زور مارا۔ "بہر حال تم کل تک میرے ساتھ رہ سکتے ہو، اوپر والے کسی ایک کمرے میں۔ میں اس کا کرایہ تم سے وہی لوں گا جو ان کوٹھریوں کا لیتا ہوں۔"

زکریا کو یہاں ٹھہرنے میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مسجد ہی کو ترجیح دینا چاہی مگر ارادہ کرتے کرتے باز رہا اور سرائے مالک سے کہا۔ "میں ایک شرط پر اس بالائی کمرے میں رہ سکتا ہوں۔"

سرائے مالک نے جواب دیا۔ "بغیر سنے ہی میں تمہاری شرط مان لوں گا کیونکہ کاروبار نفع کے لیے کیا جاتا ہے اور نفع حاصل کرنے والے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے گاہکوں کی شرائط سننے کے بعد قبول کرے۔"

زکریا نے کہا۔ "پھر بھی میری یہ خواہش ہے کہ تم میری بات ضرور سن لو۔ میں بھی قسطنطنیہ جا رہا ہوں اور یہ تینوں بھی قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں میری بابت کچھ بھی نہ معلوم ہو۔ میں کل صبح ان تینوں سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

سرائے مالک نے متجسسانہ نظروں سے زکریا کو دیکھا اور جواب دیا۔
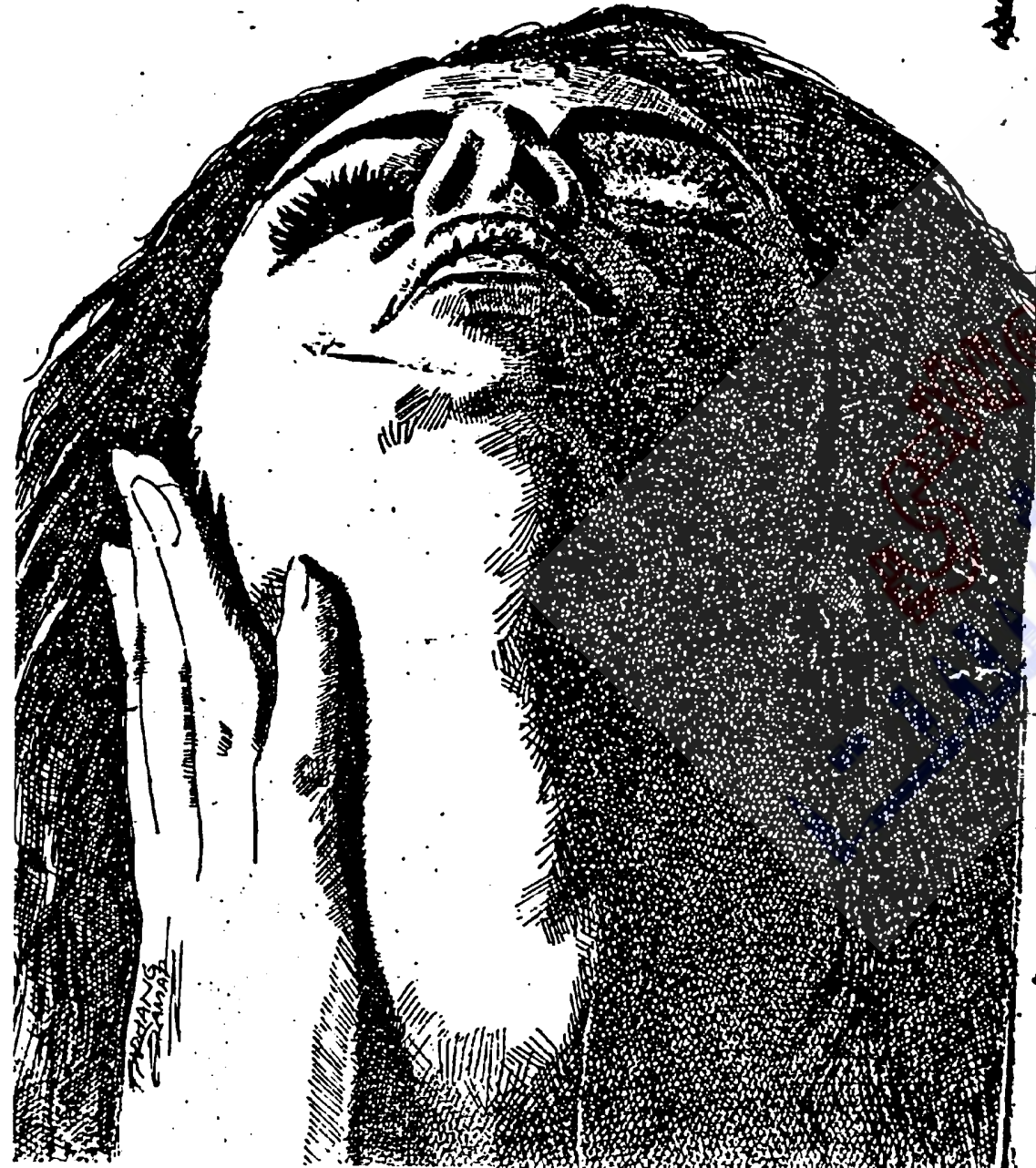
"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کل صبح چلے جاؤ گے یا کل شام کو جاؤ گے۔ میری دلچسپی تو اس میں ہے کہ تم سرائے کا کرایہ فوراً ہی ادا کر دو اور جب تک رہو کرایہ پیشگی ادا کرتے رہو۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "میں آپ کی یہ باتیں مان لوں گا اور سرائے کا کرایہ پیشگی ادا کر دوں گا۔"

مالک سرائے نے کہا۔ "تب پھر کیا ہے۔ کرایہ پیشگی دے دو اور شان سے رہو سرائے میں۔"

زکریا نے کہا۔ "لیکن یہ وعدہ کرو کہ میری آمد کا ان تینوں کو علم نہیں ہوگا۔"

سرائے مالک ہنس دیا۔ بولا۔ "صاحبزادے! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں۔۔۔ غیر ذمہ دار شخص نہیں ہوں۔"

زکریا نے کہا۔ "جناب والا! میں نہیں جانتا کہ تم ذمہ دار شخص ہو یا غیر ذمہ دار شخص۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان تینوں کو میری موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔"

سرائے مالک بھی چڑ گیا تھا۔ بولا۔ "صاحبزادے! اگر تم مجھے اعتبار کے لائق نہیں سمجھتے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے لیے میرے پاس کوئی کمرہ نہیں۔ کہیں اور انتظام کر لو جا کر۔"

سرائے مالک کے اس دوٹوک اور خشک جواب نے زکریا کو مشتعل کر دیا لیکن اس وقت وہ اس حیثیت میں نہیں تھا کہ اپنے اشتعال کا اظہار کرتا۔

سرائے مالک اپنے نچلے کمرے میں جا گیا اور اندر سے دروازہ بند کرنے لگا۔ زکریا نے بات بگڑتے دیکھی تو خوشامد سے کہا۔ "واہ جناب! میری ذرا سی بات کا برا مان گئے۔ خیر۔ اگر میرے لیے کمرہ نہیں ہے تو نہ سہی مگر یہ وعدہ ضرور کرو کہ میرا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔"

سرائے کے مالک نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کو اندر سے بند کر لیا۔ زکریا کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر دروازہ تھپتھپایا۔ اندر سے دروازہ کھل گیا اور وہاں سے سرائے مالک کے بجائے کوئی اور بوڑھا شخص نکلا۔ بے مروتی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "سرائے مالک سے ملنا ہے، وہ کہاں چلا گیا؟"

بوڑھے نے کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے، مجھ سے کہہ دے۔ اب وہ تجھ سے نہیں ملے گا۔"

زکریا نے کہا۔ "اس سے کہہ دو، میں بہر قیمت ایک رات یہاں پر گزاروں گا۔ میں اس کا پیشگی اور دوگنا کرایہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

بوڑھا کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ اسی وقت پیچھے سے سرائے مالک نمودار ہو گیا۔ اس نے زکریا کی بات سن لی تھی۔ بولا۔ "صاحبزادے! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو! کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے اور اپنے آپ کو راز میں کیوں رکھنا چاہتے ہو! میں تم سے یہ ساری باتیں پوچھ بھی نہیں سکتا۔ میرا کام تو یہ ہے کہ اپنے مسافروں کو آرام پہنچاؤں۔ میرا یہ کام ہرگز نہیں کہ اپنے مسافروں کی جاسوسی کروں اور ایک کی خبر دوسرے تک پہنچاتا پھروں۔"

زکریا نے کمرے کا کرایہ دوگنا، پیشگی ادا کر دیا۔ سرائے مالک اس کو اوپر لیے چلا گیا۔ اس کا گھوڑا نیچے باندھ دیا گیا۔ زکریا کو جو کمرہ دیا گیا تھا وہاں سے سرائے کی کوٹھریاں بہت صاف نظر آتی تھیں۔ اس نے یہیں سے ان تینوں کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس کی طرح قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ لیکن وہ تینوں اپنی اپنی کوٹھریوں میں بند تھے۔ اس نے ان کے گھوڑوں کی جھلک ضرور دیکھ لی۔ جو دالان میں کھڑے جگالی کر رہے تھے اور اپنے اپنے کانوں اور دُموں کو حرکت میں لا کر مکھیاں اڑا رہے تھے۔

شام سے ذرا پہلے سرائے مالک کے ساتھ ایک شخص اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس سے درخواست کی کہ زکریا رات کا کھانا اس کے مریدوں کے ساتھ کھائے۔

سرائے مالک اس شخص کا بڑا احترام کر رہا تھا۔ اس نے زکریا کو بتایا کہ یہ شخص جس کا نام عثمان ہے۔ اس علاقے کا پیر ہے۔ اس کے سینکڑوں مرید ہیں جو خانقاہ کے لئے اپنی اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی پیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور پیر عثمان اس رقم کو مسافروں کی ضیافت اور قرض داروں بیواؤں اور یتیموں پر خرچ کر دیا کرتے ہیں۔ پیر عثمان نے زکریا کو مجبور کیا کہ وہ رات کا کھانا خانقاہ میں کھائے۔ زکریا انکار کر دینا چاہتا تھا مگر سرائے مالک نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ زکریا کو شبہ تھا کہ اس ضیافت میں سرائے میں مقیم تینوں لڑکوں کو بھی مدعو کیا گیا ہوگا اور وہ ان تینوں کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے پیر عثمان سے معذرت کرنا چاہی۔ "پیر و مرشد! میں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس لیے پوری رات آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ مجھے معاف کر دیا جائے؟"

پیر عثمان نے جواب دیا۔ "نوجوان! میں جانتا ہوں تو معذرت کیوں کر رہا ہے۔ سرائے مالک نے ساری بات پہلے ہی بتا دی ہے۔ اس لیے میں نے ان تینوں کو ضیافت میں نہیں بلایا ہے۔ انہیں کل صبح بلا لوں گا آج تیری باری ہے۔"

اب زکریا انکار نہیں کر سکا۔ ضیافت قبول کر لی۔ پیر عثمان یہ کہہ کر چلے گئے کہ مغرب کے بعد ان کا ایک مرید آئے گا اور زکریا کو لے جائے گا۔ پیر عثمان کے چلے جانے کے بعد زکریا نے سنان پاشا کے اس خط کو پھر ٹٹول کر دیکھا جو اس کے دائیں بازو پر تعویذ کی طرح بندھا ہوا تھا۔ تینوں نوجوانوں کی بابت طرح طرح کے خیالات آ آ کر ستا رہے تھے۔ خیالات کا سیل مڑا تو ناہید کی طرف چلا گیا۔ صفی الدین کی محبتیں اور اس کا آخری سمال یاد آ گیا۔ اس نے سوچا اگر کسی طرح ناہید کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس کے باپ صفی الدین کو خود زکریا نے قتل کیا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ زکریا کو جھرجھری آ گئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مغرب کے بعد جب رات کی سیاہی غالب آ گئی اور سرائے کی کوٹھریوں اور سرائے مالک کی دو منزلہ عمارت میں شمعیں روشن ہو گئیں تو زکریا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر نیچے ان کوٹھریوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جن میں تینوں نوجوان ٹھہرے ہوئے تھے مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہاں ان کے کھلے دروازوں سے اندر روشن شمعوں کی روشنی باہر گھوڑوں پر پڑ رہی تھی۔ جب وہ نیچے دیکھ رہا تھا اسی وقت سرائے مالک، پیر عثمان کے مرید کے ساتھ اندر داخل ہوا اور زکریا کو مطلع کیا کہ پیر عثمان نے اپنا مرید بھیج دیا ہے۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

زکریا نے مرید کو بغور دیکھا۔ یہ دبلا پتلا غیر معمولی لمبا ادھیڑ عمر شخص زکریا کا بغور دیکھنے میں مشغول تھا۔ زکریا نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی ذی مرتبہ شخص نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ معمار، حداد یا لوہار ہوگا۔

زکریا اس شخص کے ساتھ نہایت احتیاط سے نیچے اترا۔ اپنے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اچک کر سوار ہو گیا۔ مرید اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور پھر یہ دونوں بستی کے جنوبی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ دریائے سقریہ کے اونچے اونچے درختوں کے اندر سے روشنیاں چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں اور تاروں کی سوئی سوئی مدھم روشنی میں خانقاہ اور اس سے ملحقہ مسجد کے مینارا اور قبے درختوں کے اوپر سر اٹھائے جھانک رہے تھے۔ یہ دونوں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے اور کچھ دیر بعد ایک پھاٹک سے گزر کر چہار دیواری میں داخل ہو گئے۔ یہ پیر عثمان کی خانقاہ اور ان کی مسجد کی چہار دیواری تھی، اس چہار دیواری کے اندر چاروں طرف ایک ایک دائرے میں بہت سارے حجرے بنے ہوئے تھے۔ پیر عثمان کے مرید نے ان حجروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ حجرے مریدوں اور مہمانوں کے لیے ہیں۔ اگر تم سرائے کے بجائے یہاں آ جاتے تو مزے میں رہتے، ہم مہمانوں کو اللہ کی مہربانی سمجھتے ہیں۔"

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہار دیواری کے بیچ میں خانقاہ تھی اور خانقاہ سے متصل مسجد۔ خانقاہ کے باہر گھوڑوں کو باندھنے کے لیے درختوں کے تنے گڑے ہوئے تھے۔ زکریا اور ساتھی مرید نے اپنے گھوڑوں کو انہی تنوں سے باندھ دیا۔ خانقاہ کے دروازے پر پیر عثمان زکریا کی پیشوائی کو موجود تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر زکریا سے ہاتھ ملایا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر پھیر لیے۔ زکریا کو ان کے اس حسن اخلاق پر شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ پیر عثمان نے کہا۔ "مرحبا اے نو وارد مرحبا۔"

زکریا نے شرمندگی سے عرض کیا۔ "آپ کے انکسار اور خوش اخلاقی نے مجھے آپ کا بندۂ بے دام کر دیا ہے۔"

پیر عثمان نے زکریا کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اسی طرح خانقاہ کے اندر لیے چلے گئے۔ وہاں بہترین قالین بچھے ہوئے تھے اور چھت سے عراقی شیشے کے جھاڑ لٹکے ہوئے تھے اور خاص اس جگہ، جہاں پیر عثمان کی نشست تھی۔ پانچ بڑے چراغ دان روشن تھے۔ انہیں اصطلاحاً البیوس کہا جاتا تھا۔ منارے کی شکل کے البیوس تانبے کے تین پایوں پر گلاس کی طرح رکھے ہوئے تھے انہیں پگھلی ہوئی چربی سے بھر دیا گیا تھا گلاس کے بیچ میں منار جیسی شے سے بتی نکلی ہوئی روشن تھی۔ آس پاس پگھلی ہوئی چربی اس روشن بتی کو توانائی فراہم کر رہی تھی۔ اس البیوس میں تانبے کا ایک برتن بھی نصب تھا جس میں اوپر تک چربی بھری ہوئی تھی اور اس برتن سے متصل ایک قینچی رکھی تھی جس سے بتی کی خرابی دور کی جاتی تھی۔ ان پانچوں البیوس (چراغ دانوں) کے پاس ایک آدمی بیٹھا تھا۔ جسے عرف عام میں الجراجی (الچراغچی) کہا جاتا تھا۔

پیر عثمان جب البیوس کے پاس پہنچے تو وہاں موجود مریدوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور جب تک پیر عثمان بیٹھ نہیں گئے وہ سب کھڑے رہے۔ مریدوں کے جسم قباؤں میں اور پاؤں موزوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی کمر میں پٹیاں تھیں۔ جن میں خنجر لگے ہوئے تھے اور سروں پر سفید اونی ٹوپیاں تھیں ہر ٹوپی کے اوپر بیچوں بیچ میں دو انگلی قطر کا کپڑا لگا ہوا تھا۔

پیر عثمان کے پاس ہی زکریا بیٹھ گیا۔ خانقاہ کے خدام نے پیر عثمان کے اشارے پر کھانے کے برتن رکھنا شروع کر دیے۔ کھانے کے ساتھ ہی پھلوں کے ٹوکرے رکھ دیے گئے۔ زکریا پیر عثمان کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھا۔

پیر عثمان نے لقمہ توڑا تو بقیہ حاضرینِ ضیافت نے بھی اتباع کی۔ اور کھانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ زکریا کو یہ کھانے بہت اچھے لگے۔ اس نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا پھر پھلوں پر بھی دندان آزمائی کی۔

جب ضیافت سے فرصت ملی تو پیر عثمان نے زکریا سے پوچھا "نوجوان! مجھے تجھ سے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن کیا تو بتائے گا کہ تو اتنی عجلت میں قسطنطنیہ کیوں جا رہا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کی ضیافت سے شکر گزار ہو کر آپ جو پوچھیں گے بتا دوں گا تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ براہِ کرم آپ اس نوع کے سوال نہ کریں۔"

پیر عثمان نے پھر سوال کیا۔ "کیا تیرا تعلق سلطان کے خاص دستے سے ہے؟"

زکریا نے چڑ کر جواب دیا۔ "پھر وہی، پہلے جیسا سوال۔ افسوس کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔"

پیر عثمان نے کہا۔ "تو میرا مہمان ہے اس لیے میں تیری تلخیاں بھی گوارا کر لوں گا۔ لیکن یاد رکھ کہ اگر تو نے کسی کو اپنا رازدار نہ بنایا تو رازداری کا یہ بار تیری صحت کو برباد کر دے گا۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! آپ جس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو اپنے اصولوں پر جان تو دے دینا چاہیے لیکن اصول شکنی نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کا مہمان ہوں۔ آپ کو یہی معلوم رہنا چاہیے اور کچھ نہیں۔"

پیر عثمان کے ایک مرید نے غصے میں کہا۔ "پیر و مرشد کی موجودگی میں اس قسم کی باتیں کرنا گستاخی میں داخل ہے۔ اگر تو ہمارے پیر کا مہمان نہ ہوتا تو میں اس گستاخی کی سزا فوراً دیتا۔"

پیر عثمان نے مرید کو سرزنش کی۔ "خبردار! زبان کو قابو میں رکھو۔ یہ نوجوان ہمارا مہمان ہے اور ہمیں اس کے بارے میں تجسس سے کام نہیں لینا چاہیے۔" پھر زکریا سے پوچھا۔ "نوجوان کیا تو سماع میں دلچسپی رکھتا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "سماع سے کسے دلچسپی نہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے سوالوں کے جواب نہ دے کر میں بڑی زیادتی کر رہا ہوں۔"

پیر عثمان نے اپنے مرید کو حکم دیا۔ "مطربوں کو بلایا جائے۔"

اس حکم کے ساتھ ہی گانے والوں کی ایک ٹولی آ گئی۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال رکھے تھے۔ زکریا کے گداز دل پر یہ سماں قیامت ڈھانے لگا۔ خوش آواز گانے کے فن سے واقف مطربوں نے عاشقانہ کلام شروع کر دیا۔ ساز بجانے والوں نے ان کی دھن کے مطابق ساز چھیڑے اور سننے والوں کے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی۔ زکریا کا سینہ ناہید کے عشق کی آگ سے دہک اٹھا۔ اس کو اپنے وجود پر غصہ آ رہا تھا۔ سلطان کی تابعداری اور فرماں برداری میں وہ کام کر گیا تھا۔ جس کی کوئی تلافی نہیں تھی۔

مغنی عشق، جنون اور دیوانگی کی مدح سرائی کر رہا تھا اور بار بار یہ بتلا رہا تھا کہ زندگی بے بندگی سراپا شرمندگی ہے۔ بندگی کیا ہے؟ اپنے محبوب کی پرستاری۔

زکریا کا دل بھر گیا اور وہ رونے لگا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھا۔ وہ اپنے وجود پر شرمندہ تھا۔ بار بار یہی جی میں آ رہا تھا کہ وہ یہیں سے جھیل وان کے کنارے واپس جائے اور ناہید کو تلاش کر کے اس کے قدموں میں سر رکھ دے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔

خوابناک ماحول میں مطربوں کی پرسوز آوازیں زکریا کو زیادہ متاثر کرتی رہیں۔ پیر عثمان زکریا کے کرب و اضطراب کو شدت سے محسوس کرتا رہا۔ اس نے زکریا کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "نوجوان! اس زندگی اور دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ انسان کے لئے کچھ بھی نہیں۔ بس اس کا وہی کچھ ہے جو اسے میسر آ جائے یا حاصل کر لے۔ تو دنیا کی فکر میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔"

زکریا کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ وہ اپنی داستانِ عشق کسی کو سنا کر اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا پیر عثمان کو اپنا رازدار بنا کر اس سے دعاؤں کی درخواست کرنا چاہیے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر محتاط ہو گیا کہ اس طرح اس کی حیثیت کا راز طشت از بام ہو جائے گا اور سلطانی ہرکارے اس کے آس پاس سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ جو اس کو گرفتار کر کے سلطان کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ اور اس طرح وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

پیر عثمان نے پوچھا۔ "نوجوان! تو کیا سوچنے لگا؟"

زکریا گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "پیر و مرشد! مجھے صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی یہاں سے چلا جانا ہے، اس لیے میں اب سرائے واپس جانا چاہتا ہوں تاکہ آرام کر لوں اور صبح تازہ دم ہو کر اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔"

پیر عثمان نے اس کو شانوں پر زور دے کر بٹھا دیا۔ بولا۔ "ابھی نہیں، کچھ دیر اور۔"

زکریا مجبوراً بیٹھ گیا۔ لیکن وہ جتنی دیر بھی بیٹھا دل پریشان اور اچاٹ ہی رہا۔ نصف شب کے بعد وہ خانقاہ سے باہر نکلا۔ پیر عثمان کے اشارے پر دو مرید خانقاہ کے دروازے تک اس کو چھوڑنے گئے۔ باہر ایک مشعل بردار پہلے ہی سے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ مشعل کی روشنی میں گھوڑے تک پہنچنے اور اس پر سوار ہونے میں سہولت ہوئی۔ رات کے سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں بڑا شور کر رہی تھیں۔ سرائے کے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کی رفتار بالکل کم کر دی تاکہ اس کے ٹاپوں کی آواز زیادہ شور نہ کرے۔ سرائے کی کوٹھریاں بند ہو چکی تھیں اور شاید اندر کے چراغ بھی گل کر دیے گئے تھے۔ مگر آخری تین کوٹھریوں کے دروازے اس وقت بھی کھلے ہوئے تھے اور ان کے اندر گردشِ شمعوں کی روشنی باہر تک آ رہی تھی۔ اس روشنی میں ان کے گھوڑے صاف نظر آ رہے تھے۔

زکریا دو منزلہ عمارت کے دروازے پر آہستہ سے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر دربان اتنا چوکنا بیٹھا تھا کہ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ زکریا نے اپنا گھوڑا اس کے حوالے کر دیا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں تین نوجوانوں کو بیٹھے دیکھا۔ اس کو خطرے اور وقت کی نزاکت کا اتنا شدید احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ اپنے پیش قبض پر چلا گیا لیکن ابھی وہ اپنی پیش قبض نکال بھی نہیں سکا تھا کہ تینوں نوجوان بجلی کی طرح کوند کر اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو بے بس کر دیا۔ زکریا نے چیخ کر کہا۔ "یہ بزدلی ہے کہ تم تینوں ایک غافل شخص پر حملہ کر کے اس کو بے بس کیے دے رہے ہو۔"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "ہم تینوں تیرے پاس لڑنے جھگڑنے نہیں آئے تھے اور اگر تیرا ہاتھ تیری اپنی پیش قبض پر نہ گیا ہوتا تو ہم تجھ پر یوں نہ ٹوٹ پڑتے۔"

زکریا نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے اور تم تینوں میرے لئے جذبۂ خیر سگالی رکھتے ہو تو میری پیش قبض اپنے قبضے میں لے کر مجھ کو چھوڑ دو اور اطمینان سے بات کرو۔"

ان تینوں نے زکریا کی پیش قبض اپنے قبضے میں لے لی اور زکریا کو چھوڑ دیا۔ زکریا نے سکون کی سانس لی اور ان تینوں کے مقابل بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ "یہ میرے کمرے کو تم تینوں کے لیے کمرہ کس نے کھولا تھا؟"

ایک نے جواب دیا۔ "سرائے مالک نے۔ اس ملک میں کوئی بھی شخص ہمارے حکم کو نہیں ٹال سکتا۔"

زکریا نے پوچھا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "سنان پاشا کا خط کہاں ہے؟"

زکریا کے پورے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بولا۔ "کون سا خط؟ کون سنان پاشا؟"

دوسرے نے اس کا مذاق اڑایا۔ "تو گویا تو سنان پاشا سے بھی واقف نہیں، عجیب بات ہے۔"

زکریا نے کہا۔ "جنابِ والا! تمہیں میری بابت یقیناً کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

پہلے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "کیا خیال ہے؟ ہم تینوں اس کی تلاشی کیوں نہ لے لیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

زکریا تڑپ کر پیچھے ہٹا اور کرنے میں لگی ہوئی تلوار اتار لی اور فضا میں لہرانے لگا۔ بولا۔ "خبردار جو کوئی آگے بڑھا اور میری تلاشی لینے کی کوشش کی۔"

وہ تینوں آپس میں شکلیں دیکھنے لگے۔ گویا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔

ایک آگے بڑھا اور بڑی ملائمت سے کہا۔ "تو تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ اس تلوار کو پھینک دے اور پُرامن ماحول میں بات کرنے کی کوشش کر۔ ورنہ اگر ہم تینوں لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے تو تُو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "کوئی پروا نہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں اگر مروں گا تو تم تینوں میں سے دو کو تو میں ٹھکانے ضرور لگا دوں گا۔"

ایک نے پوچھا۔ "یہاں کب تک رہو گے؟"

زکریا نے انہیں دھوکا دیا۔ "پرسوں تک۔ میں کل آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس شخص نے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں تجھ سے بات ابھی نہیں کرنی چاہیے۔ صبح مناسب رہے گی۔"

بقیہ دونوں نے بھی اس کی تائید کی اور زکریا کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ ایک نے زکریا سے کہا۔ "اچھا تو صبح بات ہو جائے گی۔ ہم جاننا چاہتے کہ کیا صفی الدین کا مہمان تو ہی تھا اور صفی الدین نے تجھ ہی کو اپنی بیٹی ناہید کے لیے پسند کر لیا تھا۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "میں وہ نہیں ہوں تمہیں میری بابت غلط فہمی ہوئی ہے۔"

تیسرے نے پوچھا۔ "کیا سنان پاشا نے سلطان سلیم کے نام تجھے کوئی خط نہیں دیا؟"

زکریا نے انکار کیا۔ "نہیں نہیں۔ میں نے کہہ جو دیا کہ تم تینوں کسی غلط فہمی کے شکار ہو۔"

وہ تینوں خاموشی سے نکل گئے۔ زکریا نے احتیاط کے ساتھ کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور بستر پر گر کر ان تینوں کی بابت غور کرنے لگا۔ اس کو یہ تینوں ینی چری کے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ پھر یہ کون تھے؟ یہ بڑا الجھا دینے والا سوال تھا۔ صفی الدین اور ناہید کا ان کی زبان سے ذکر بڑا معنی خیز اور الجھن کا مسئلہ تھا۔ وہ پوری رات نہیں سو سکا۔ ابھی رات کا ایک پہر باقی تھا کہ وہ سرائے سے باہر نکلا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دریائے سقریہ کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

رات کو دریا پار جانے کے لیے کوئی کشتی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں اداپنازری کی طرف بڑھتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اداپنازری میں داخل ہو گیا۔ یہاں بحیرۂ اسود کے ساحل پر کشتیاں تیار کھڑی تھیں۔ یہاں ہی سے اس کشتی میں بیٹھ گیا جو سب سے پہلے روانہ ہونے

والی تھی کشتی میں مسلمان عیسائی اور یہودی مسافر شانے سے شانہ ملائے سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے زکریا کو بڑے غور سے دیکھا۔ انہیں اس کے چہرے پر معلوم نہیں کیا نظر آ رہا تھا۔

زکریا دوسروں سے کٹا ہوا الگ الگ سفر کرتا رہا۔ کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنے کے بعد وہ حیدر پاشا کے سامنے سے گزر کر باسفورس میں داخل ہو گیا۔ اب اس کے سامنے قسطنطنیہ تھا۔ وہ جلد سے جلد سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ کشتی نے اسے قسطنطنیہ کے ساحل پر اتار دیا۔ ساحل پر کیچڑ تھا۔ یہاں سے گزر کر ساحلی چوبی مکانوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آت میدان میں داخل ہو گیا۔ اب اس کو ینی چری کی اقامتی درس گاہ کی عمارتیں صاف نظر آنے لگیں۔ اس نے آت میدان میں نو عمر اور نو آموز ینی چری طلبہ کو گھوڑے دوڑاتے دیکھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ کمرے کا خدمت گار زکریا کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پوچھا: ”زکریا تم کب آئے؟“

زکریا نے جواب دیا: ”ابھی ابھی، جاؤ استاد ارسلان کو بتا دو کہ زکریا آگیا ہے اور اسی وقت سلطان سے ملنا چاہتا ہے۔“

خدمت گار بھی بھاگ کر استاد ارسلان کو بلا لایا۔ استاد نے اپنے شاگرد کو سینے سے لگا لیا اور اشارتاً سوال کیا: ”کیا اکیلا ہی آیا ہے تو؟“

زکریا نے جواب دیا: ”ہاں استادِ محترم۔ میں اکیلا ہی آیا ہوں۔“

استاد ارسلان نے مذبذب لہجے میں پوچھا: ”کیا تو اسی وقت سلطان سے ملنا چاہتا ہے اور اس کام کا کیا ہوا؟ جس کے لئے تم سب کو بھیجا گیا تھا؟“

زکریا نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے کپڑے نکالنے لگا۔ بولا: ”سلطان جو کچھ چاہتا تھا ہو گیا۔ نہایت کامیابی سے۔ سلطان اقبال مند ہے۔ ہر کام اس طرح ہو گیا کہ اپنی کامیابی پر ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔“

استاد ارسلان نے دبے دبے پوچھا: ”سلطان کے نام کسی کا کوئی خاص پیغام؟“

زکریا نے جواب دیا: ”ہاں سنان پاشا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

استاد ارسلان نے بے چینی سے کہا: ”وہ پیغام کہاں ہے؟ میں دیکھ تو لوں۔“

زکریا نے بے مروتی سے جواب دیا: ”افسوس کہ میں وہ پیغام آپ کو نہیں دکھا سکتا، استادِ محترم۔“

استاد ارسلان کھسیا گیا: ”اچھا پھر تو غسل کر کے دوسرا لباس پہن لے۔ اس کے بعد ہم دونوں سلطان کے پاس چلیں گے۔“

زکریا نے غسل کر کے لباس بدلا۔ اس کے دائیں بازو پر سنان پاشا کا مختصر خط اس وقت بھی تعویذ کی طرح بندھا ہوا تھا۔ اس نے اس تعویذ نما خط کو چھو کر دیکھا اور خاموش رہا۔ پھر یہ دونوں سلطان کی خدمت میں چل پڑے۔

سلطان اپنے دوسرے صحن والے دیوان میں بیٹھا اپنے رعایا کے مقدمات چلا رہا تھا۔ صحن کے دربانوں نے ان دونوں کو سلطان کے قریب ترین آدمیوں میں جان کر مروت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ایک دربان نے ان دونوں کو نہایت احترام اور ادب سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں انتظار کے لئے ایک کمرے میں بٹھا کر خود سلطان کے پاس چلا گیا۔ سلطان نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا جس کا مطلب تھا کہ بقیہ مقدمات کل زیرِ غور آئیں گے۔

اس کے فوراً بعد استاد ارسلان اور زکریا کو طلب کیا۔ دونوں نے اندر داخل ہوتے ہی سلطان کے قریب پہنچ کر اس کی کھلی ہوئی عبا کو بوسہ دیا۔ اور ادب سے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت زکریا نے اپنے داہنے بازو سے سنان پاشا کا خط کھولا اور سلطان کے حوالے کر دیا۔ سلطان نے نہایت اطمینان سے خط کھول کر پڑھا اور پوچھا: ”زکریا! جب تو وہاں سے چلا تھا تو کیا واقعی ترکی سرحدوں پر آباد منافقوں کا قلع قمع کر دیا گیا؟“

زکریا نے جواب دیا: ”جی سلطانِ محترم! اس نامے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ اس تفصیل کی اجمال ہے جو جھیل وان کے کنارے منافقوں کے ساتھ پیش آیا۔“

سلطان نے کہا: ”سنان پاشا نے اپنے اس خط میں تو کچھ بھی نہیں لکھا جب کہ ہمیں اس کا ایک خط جو کل مل چکا ہے ہمیں معرکے کی بڑی تفصیل بتا چکا ہے۔“

زکریا کا دل ڈوبنے لگا۔ ”کیا سنان پاشا کا کوئی دوسرا خط اس سے پہلے ہی سلطان کو مل چکا ہے؟“

سلطان نے جواب دیا: ”ہاں کل ہی، اب تو جا سکتا ہے۔“ پھر استاد ارسلان سے کہا: ”ارسلان! اس کو بتلا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے اس کو میرا قرب کتنی آسانی سے میسر آ جاتا ہے۔ ایک غیر معمولی شخص کسی غیر معمولی شخص ہی کو اپنا قرب بخش سکتا ہے۔“

استاد ارسلان نے جواب دیا: ”سلطانِ معظم کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

اس دن ان دونوں کو سلطان کا قرب چند لمحوں کے لئے میسر ہوا تھا۔

■

استاد ارسلان نے زکریا سے وہ سارے واقعات سنے جو اسے جھیل وان کے کنارے پیش آئے تھے۔ لیکن اس نے صفی الدین اور ناہید کے بارے میں وہ سب نہیں بتایا جو ان دونوں کی نسبت سے پیش آیا تھا۔ استاد ارسلان نے بے دلی سے کہا: ”زکریا! جب تجھے بار بار منع کیا گیا تھا کہ تو اپنے کام سے کام رکھے گا اور عشق و محبت سے گریز کرے گا تو یہ تیرا کیا سنا جا رہا ہے کہ تو نے ایک لڑکی سے عشق شروع کر دیا تھا۔“

زکریا کو ذرا سی پریشانی ہوئی کیونکہ جس بات کا اس نے استاد ارسلان سے ذکر ہی نہ کیا ہو۔ اس کا انہیں کس طرح علم ہو گیا؟ اس نے جواب دیا۔ ”استادِ محترم! میں نوجوان ہوں اور میرے سینے میں نہایت حساس اور جذباتی دل ہے۔ اگر میں ناہید کی طرف متوجہ نہ ہوتا تو خود مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ استادِ محترم! میں نے سلطان کی خاطر وہ کچھ کیا جو کسی دوسرے نوجوان کے بس کا نہیں ہے۔“

استاد ارسلان نے جواب دیا: ”صاحبزادے! سلطان کی چاکری، سلطان کی صحبت میں رہنا اور سلطان کی خواہش اور مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ یہ سارے ہی غیر معمولی کام ہیں۔ ہم سب غیر معمولی کام انجام دے رہے ہیں۔“

زکریا نے دل برداشتہ ہو کر عرض کیا: ”استادِ محترم! جھیل وان کے کنارے مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا ہے وہ کانٹے کی نوک کی طرح دل میں ٹوٹ گیا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً کانٹے کی یہ نوک مجھے تڑپاتی جلاتی رہتی ہے۔“

استاد ارسلان نے کہا: ”زکریا! تو خوش قسمت ہے کہ اس ماحول سے نکلنے کا موقع تو مل گیا۔ ایک میں ہوں کہ جب سے یہاں آیا ہوں۔ بس دو بار کہیں اور آ پایا ہوں۔ اے کاش! میں بھی کہیں آ جا سکتا۔“

زکریا کو استاد ارسلان کی باتوں نے زندہ رہنے اور سلطان کی خدمت کرتے رہنے کا شاندار درس دیا تھا۔ اب زکریا کو پہلے سے زیادہ محنت و مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ صبح فجر کی نماز سے دو گھنٹے پہلے بستر چھوڑ دیتا تھا اور باہر نکل کر ادھر ادھر بھاگتا دوڑتا رہتا۔ اس میں اس کے چند ہم عمر ہم سفر بھی ہوتے۔ یہ سب دو گھنٹے مسلسل بھاگتے رہتے۔ اس کے بعد سستا کر غسل کرتے اور وضو کر کے نماز فجر ادا کرتے۔ نماز کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر زکریا آت میدان میں گھڑ سواروں کی مشق میں مشغول ہو جاتا۔ اس سے فارغ ہوتا تو اپنے کپڑے خود دھوتا اور انہیں دھوپ میں پھیلا کر یار دوستوں میں گھل جاتا اور ان سے خوش گپیاں کرنے لگتا۔

جمعہ کی نماز کے بعد زکریا نے اپنے استاد ارسلان سے پوچھا: ”استادِ محترم! اب کیا صورت حال رہے گی؟“

زکریا کا یہ فقرہ ابھی پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ ایک شخص نمازیوں کو پھلانگتا ہوا استاد ارسلان اور زکریا کے پاس پہنچ گیا۔ اور پھر ان دونوں سے باری باری کان میں کہا: ”آج ظہر کے بعد سلطان معظم نے آپ دونوں کو یاد فرمایا ہے۔ اس لئے اس وقت کسی کام میں نہ الجھ جانا۔“

زکریا نے استاد ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”سلطانِ معظم سے عرض کر دینا کہ یہاں کس کی اتنی مجال ہے کہ سلطان کا پیغام سن کر بھی ان سنی کر دے۔“

وہ شخص کہتا ہوا چلا گیا: ”مجھے یہی پیغام اوروں کو بھی دینا ہے اس لئے چلتا ہوں۔“

استاد ارسلان کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ آہستہ سے کہا: ”احمق! اگر تو یہ نہ بھی کہتا۔ میں تب بھی تجھ کو پکڑ نہ لیتا۔“

نماز کے فوراً بعد یہ دونوں دوسرے صحن کی طرف چلے گئے دوسرے صحن کے بڑے دیوان میں ———— ساٹھ ستر آدمی موجود تھے جنہیں سلطان کا قرب حاصل تھا اور سلطان ان پر اعتبار کرتا تھا۔ ان میں فوجی بھی تھے اور اقامتی درس گاہ کے استاد بھی زیرِ تعلیم طلبہ بھی تھے۔ اور وہ لوگ بھی تھے جن کے مشورے تجربوں کے بعد ٹھوس، مفید اور قابلِ قبول ٹھہر چکے تھے۔ سلطان کی جگہ خالی تھی۔

زکریا نے ان لوگوں میں شناسا چہرے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان میں کئی ایسے آدمی موجود تھے جنہیں وہ وان جھیل کے کنارے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ انہی میں وہ نامہ بر بھی موجود ہوگا جو غداروں کی بیخ کنی کی خوش خبری لے کر اس سے پہلے ہی سلطان تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہ غیر معمولی بات بھی محسوس کر لی کہ حاضرین میں سے اکثر لوگ زکریا کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے اور دیکھ چکنے کے بعد ہنستے مسکراتے چہرے آپس میں باتیں کرنے لگتے۔

ایک شخص دوسروں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا زکریا کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا: ”کیوں میاں صاحبزادے! یہ میں اپنے سامنے کس شخص کو دیکھ رہا ہوں؟“

زکریا نے پوچھا: ”کیا آپ مجھ ناچیز سے باتیں کرنا پسند کریں گے؟“

اس نے عاجزی سے جواب دیا: ”میں تو یہاں تیرے پاس آیا ہی اس لئے ہوں کہ میں تجھ سے باتیں کرنے کی عزت حاصل کر لوں۔“

زکریا نے جواب دیا: ”جناب! میں نے تو ایسا کوئی بھی کام نہیں کیا جس سے آپ لوگوں سے عزت اور حرمت حاصل کر سکوں۔ ابھی تو میں طالب علمی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پھر میرا ذکر آپ تک کس طرح پہنچ گیا؟“

اس شخص نے کہا: ”جو نوجوانی میں کسی کا عاشق ہو کر خود پر قابو رکھے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنی محبوبہ کا خیال نہ کرے تو وہ نوجوان دوسروں سے بڑا ہی ٹھہرے گا۔“

زکریا جھینپ گیا۔ سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ لیکن اب وہ خوش ضرور تھا کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا بڑا شہرہ تھا اور اسے بہت سراہا جا رہا تھا۔

اتنے میں سلطان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور لوگ احتراماً اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سلطان کے دیوان میں داخل ہوتے ہی آہستہ سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور چپ ہو گئے۔ سلطان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا پورے دیوان میں اتنی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ بس کبھی کبھی کسی کی زور زور سے سانسیں لینے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ زکریا نے سلطان کے آس پاس موجود لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ان میں وہ تین نوجوان بھی موجود ہیں جو اسے ادا پنار سے پہلے دریا کے ستروہ کی ایک ساحلی سرائے میں ملے تھے۔ وہ تینوں نوجوان تو اسے کہیں بھی نہیں نظر آئے۔ لیکن سلطان کے بائیں جانب سنان پاشا کو دیکھ کر

بہت حیران ہوا۔ سنان پاشا کو تو وہ جھیل وان کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ پھر یہ اتنی جلدی یہ یہاں کیسے آیا؟

سلطان نے سنان پاشا کو حکم دیا کہ وہ حاضرین کو ایران کے بادشاہ اسمٰعیل صفوی کی شرارتوں اور ارادوں سے باخبر کرے۔

سنان پاشا نے اپنا منہ حاضرین کی طرف کر لیا اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"ایران کا بادشاہ اپنی عقل اور قوت کے بارے میں غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہو گیا ہے۔ جب وہ کسی سے جنگ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف عیاری اور سازش کا ماحول تیار کرتا ہے گویا وہ اپنے مخالف کے چاروں طرف سازشوں کا جال پھیلا دیتا ہے اور جب اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اگر اب وہ اپنے دشمن پر تیغ اور تفنگ سے حملہ آور ہو گا تو سازشوں کے جال میں اس کا پھنسا ہوا دشمن تاب مقابلہ نہیں لا سکے گا اور بآسانی سرنگوں ہو جائے گا۔ تب وہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اس نے ایک ایسا ہی جال سلطان معظم کے خلاف تیار کیا تھا جس کو بحمد للہ تار تار کر دیا گیا۔ اب سرحد پار سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ اسمٰعیل صفوی حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان معظم کے بھتیجے ترکی پر حکومت کے اصل حق دار ہیں اور انہیں حکومت ملنا چاہیئے۔ حالانکہ خدا کی نظر میں جو حکومت کا حقدار تھا حکومت اس کے حوالے کر دی۔ اب ایران کے بادشاہ یا کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ خدائی فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر دے اور اگر ایسا کوئی کرے گا تو خدا کے غضب کا نشانہ بنے گا۔"

سلطان سنان پاشا کی اس مختصر سی تقریر سے بہت خوش ہوا اور حاضرین سے خود مخاطب ہوا۔ "چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدائی فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیرنے والے جاہل اور گستاخ کو سزا دوں۔ اور یہ میں اس لئے بھی کروں گا کہ اس کام کے لئے خدا ہی نے مجھ کو مامور کیا ہے۔"

پیری پاشا سلطان کے داہنی طرف کھڑا تھا۔ بوڑھا جہاں دیدہ تجربہ کار وزیر اعظم۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سلطان معظم، آپ کو جو کچھ کرنا ہے، اس طرح کیجیئے جس طرح خدا کرتا ہے، قدرت کرتی ہے فطرت کرتی ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "یعنی، با لوضاحت بیان کر۔"

پیری پاشا نے کہا۔ "خدا جو کچھ کرتا ہے اس کا کسی کو وقت سے پہلے علم نہیں ہوتا۔ لمحہ بھر بعد کیا ہونے والا ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سارے کام انتہائی کامیابی اور تسلسل سے جاری ہیں۔ لیکن اگر خدا اپنے ارادوں اور فیصلوں کا قبل از وقت ہی اعلان کر دیا کرے تو سلطان معظم خود ہی غور فرمالیں کہ اس کے کاموں میں کیسا خلل پیدا ہونے لگے گا۔"

پیری پاشا کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔ اس نے تحسین آمیز نظروں سے پیری پاشا کی طرف دیکھا۔ بولا۔ "خدا نے اس بوڑھے کو غیر معمولی عقل دے دی ہے۔ اس کی عزت تو کرنا ہی پڑے گی۔"

ایک فوجی سردار نے سوال کیا۔ "کیا سلطانِ معظم نے ایران پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے؟"

پیری پاشا نے سلطان کی طرف سے جواب دیا۔ "اگر تیری بات کا یہ جواب دیا جائے کہ ایران پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں تو تو کیا کرے گا؟"

فوجی سردار نے جواب دیا۔ "اگر میری بات کا جواب "ہاں" میں ملے گا تو میں جنگ کی تیاری شروع کر دوں گا اگر جواب "نہ" میں ملا تو میں معمول کے مطابق رہوں گا۔"

پیری پاشا نے کہا۔ "تیرا یہ اندازِ فکر غلط ہے۔ ہم سب کو ہر وقت چوکنا اور چوکس رہنا چاہیئے، ـ ـ ـ ـ ـ ـ کیونکہ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہم پر ہمارا دشمن کب حالتِ جنگ مسلط کر دے۔ جب تک ہم زندہ ہیں حالتِ جنگ میں ہیں۔"

سلطان نے پیری پاشا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیا۔ بولا۔ "زیادہ عقلمند ہونا بھی خطرناک ہے۔ کیونکہ عقل چنیں و چناں میں مبتلا کر کے قوتِ عمل کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ میں سیدھی سادی بات جانتا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ایران پر حملہ کر دوں کیونکہ جنگی معاملات میں جارح دافع سے زیادہ فائدے میں رہتا ہے۔ میں اسمٰعیل صفوی کو ـ ـ ـ اس کے گھر سے نہیں نکلنے دوں گا۔"

سلطان کا خیال تھا کہ اس تجویز کا جوش و خروش سے استقبال ہو گا اور پُرمسرت اور ولولہ انگیز چہرے اس کی تائید کریں گے۔ لیکن اس نے دیکھا حاضرین فکرمند ہو گئے تھے اور تشویش اور اندیشے ان کے چہروں سے ہویدا تھے۔

سلطان نے ایک بار پھر حاضرین میں جوش پیدا کرنا چاہا۔ "اسمٰعیل کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اس کی نظریں ایشیائے کوچک پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ ہمارے علاقے کو ہتھیانا چاہتا ہے۔ وہ یہاں ناقابلِ برداشت ذہنی اور عقائدی انقلاب لانا چاہتا ہے اور میں شاہِ ایران کو اس کے ارادوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے قطعی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شاہِ ایران سے دو دو ہاتھ کروں۔ میں مذبذب اور متردد لوگوں کو اپنی صفوں سے نکال باہر کروں گا۔ مجھے ایسے آدمی درکار ہیں جو ابراہیم خلیل اللہ کی طرح آگ میں بے خطر کود پڑنا جانتے ہوں۔ ایسے سرفروش جنہیں کاندھوں پر اپنے سر وبال محسوس ہوتے ہوں۔"

حاضرین کے چہروں پر تشویش بدستور موجود رہی۔ اسی عالم میں حاضرین کی آخری صف میں ایک شخص ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان کی تیز نظروں نے اس ہاتھ کو دیکھ لیا اور حکم دیا۔ "اس شخص کو آگے آنے دیا جائے۔"

یہ شخص جب سلطان کے قریب آیا تو اسے سبھی نے پہچان لیا۔ یہ سلطان کا دربان عبداللہ تھا۔

سلطان نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "سلطان معظم! میں اور میرے ساتھیوں نے

یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ سلطانی جھنڈے تلے شاہِ ایران کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں گے جب تک کہ فتح نہ حاصل کر لیں گے یا پھر سلطان پر اپنی جانیں نثار کر دیں گے۔"

سلطان نے عبداللہ کی پیش کش پر اس کو صلہ عطا کیا، شاباش جوانمرد بہادر اور جاں نثار اسی طرح بات کرتے ہیں۔"

عبداللہ چند قدم اور بڑھ گیا اور سلطان کے روبرو گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ سلطان نے پیری پاشا کو حکم دیا کہ عبداللہ کو ایک ضلع کا حاکم بنا دیا جائے۔

اسی وقت عجلت میں ایک ضلع کی حکومت کا پروانہ تیار کیا گیا اور عبداللہ چشم زدن میں دربان سے سنجاق (حاکم ضلع) بن گیا۔ حاضرین کو اچانک احساس ہوا کہ ایک دربان ان پر سبقت لے گیا۔ ہر طرف ہاتھ اٹھنے لگے اور جاں نثاری کا اعلان ہونے لگا۔ زکریا بھی آگے بڑھا اور گزارش کی "سلطانِ معظم! میری خدمات تو ہر وقت ہی حاضر ہیں اور میں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ جاں نثاری کا نیا عہد یا اعلان کروں۔ میں تو حضور کے خانہ زادوں میں سے ہوں جو حکم ملے گا اس کی تعمیل اپنا ایمان سمجھوں گا۔"

استاد ارسلان کو بھی کچھ خیال آ گیا۔ عرض کیا "سلطانِ عالی شان! گو کہ یہ ناچیز ابھی تک تدریس و تربیت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ لیکن اب یہ خانہ زاد عسکری خدمات دینا چاہتا ہے۔"

سلطان نے زکریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تیری جاں نثاری مسلّم اور ثابت۔ مجھے تیرے جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ میری نظر میں وہ نوجوان منفرد اور یکتا ہے جو اپنے فرائضِ منصبی پر اپنی محبت اور محبوب تک کو قربان کر دے۔ لیکن اس سے بھی بڑی یہ بات ہے کہ عشق کا روگ لگایا ہی کیوں جائے۔ کام کام بس یہی نصب العین ہونا چاہئے۔ جہاں تک عشق کا تعلق ہے۔ یہ کسی ہانڈی کے ابال جیسی شے کا نام ہے۔ اس کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو روکا نہ جائے تو اس ابال میں انسان کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ جاہل عاقبت نااندیش اور اس کے مضر نتائج سے بے خبر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو برباد کر لینے کے بعد پچھتاتے ہیں۔"

اس کے بعد سلطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ حاضرین دم بخود سلطان کی سحر انگیز باتوں میں گم تھے۔ آخر سلطان استاد ارسلان کی طرف مخاطب ہوا۔ اس نے ارسلان کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ سلطان کے قریب پہنچا تو حاضرین سے کہا "جب ارسلان جیسے معلّم جاں نثاری کا اعلان کر دیں تو مجھے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔" پھر ارسلان سے پوچھا "کیا تو اپنے کام سے مطمئن نہیں ہے؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا "میں اپنے فرائضِ منصبی کی یکسانی اور یک رنگی سے پریشان ہوں اور یہ کہ میں نے سالہا سال سے اپنے اس ماحول کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میں باہر نکل کر سلطان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے اعلان کیا کہ معلّم ارسلان کو سر رکنی وزراء میں شامل کر لیا جائے۔ پھر پیری پاشا سے کہا "اور یہ تقرری ابھی اسی وقت ہونا چاہیئے۔"

استاد ارسلان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ وہ وزارت کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ قسطنطنیہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ وہ سنان پاشا زکریا اور اسی قسم کے دوسرے عہدیداروں کی طرح دور دراز علاقوں میں جانے کا خواہشمند تھا اور یہ کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سلطان کی نظر میں وزیر کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ پیری پاشا کے سوا کوئی بھی وزیر اپنی وزارت سے خوش نہیں تھا۔ سلطان سے قربت رکھنے کی وجہ سے وزیر کے سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکی رہتی تھی۔

استاد ارسلان نے دیکھا پیری پاشا جلدی جلدی پروانۂ وزارت کی تیاری میں مشغول ہے تو اس نے سلطان کی خدمت میں عاجزی سے درخواست کی "سلطانِ معظم! میں اپنے کو وزارت کا اہل نہیں پا رہا۔"

سلطان ایک دم برہم ہو گیا۔ تیوریاں پر بل پڑ گئے اور ناک پھولنے لگی۔ مشتعل لہجے میں بولا "معلّم ارسلان! تجھے کچھ ہوش بھی ہے کہ تو نے کیا کہا ہے۔ میں تجھے منصبِ وزارت بخش رہا ہوں اور تو الٹا یہ کہ میری پیش کش کو ٹھکرا دیا کہ تو اس کا اہل نہیں ہے۔ گویا میری نظریں تجھے اور تیری اہلیت کو لیاقت کو سمجھنے اور پرکھنے سے قاصر رہی ہیں۔ میں تیری یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔"

استاد ارسلان نے گذارش کی "حضورِ والا! میری یہ منشا ہرگز نہ تھی جو غلط فہمی میں سمجھی گئی ہے۔ میں کسی ایسے منصب کا طلب گار ہوں جس کا تعلق میدانِ جنگ سے ہو۔ دشمن کے ملک سے ہو یا کوئی ایسا کام ہو جو سینکڑوں یا ہزاروں میل دور رہ کر انجام دیا جا سکتا ہو۔"

سلطان نے پیری پاشا سے پوچھا "کیا پروانۂ تقرری تیار ہو گیا؟"

پیری پاشا نے جواب دیا "جی سلطانِ معظم تیار ہے۔"

سلطان نے حکم دیا "اس کے حوالے کیا جائے۔"

استاد ارسلان نے رحم کی التجا کی "سلطانِ معظم رحم۔ مجھے منصبِ وزارت نہیں چاہیئے۔ میں وزیر نہیں بننا چاہتا۔ مجھے تو کوئی بیرونی دنیا سے متعلق منصب عطا فرمایا جائے۔"

سلطان نے عبداللہ دربان کو آواز دی "عبداللہ! گو تو سنجاق ہو چکا ہے۔ مگر اس وقت تجھے اپنی سابقہ خدمت انجام دینا ہو گی تو اپنے چند ساتھیوں کو بھیج لے تاکہ اس معلّم کو منصبِ وزارت قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔"

حاضرین کو پتہ نہ تھا کہ سلطان استاد ارسلان کو اس قسم کی سزا دے گا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا کہ سب ہی مذبذب رہے۔ دربان عبداللہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر دوبارہ حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اس کو حکم دیا "عبداللہ اپنے ساتھیوں سے کہہ دے کہ وہ اس معلّم کو دبوچ لیں اور دو تو معلّم کو دبوچے رہیں اور ایک معلّم کے دونوں پاؤں پکڑ لے۔"

عبداللہ کے ساتھیوں نے اجل موت کی طرح استاد ارسلان کو دبوچ لیا اور ایک نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ سلطان نے اپنا کوڑا دربان

عبداللہ کی طرف پھینک دیا۔ معلّم کے دونوں تلوے کوڑے کے سامنے کر دیے گئے۔

سلطان نے حکم دیا "معلّم کے تلوؤں پر اس وقت تک کوڑے لگائے جاتے رہیں جب تک یہ منصبِ وزارت قبول کرنے کا اعلان نہ کر دے۔"

استاد ارسلان کے دونوں تلوؤں پر کوڑے برسنے لگے۔ اس کی کرب ناک چیخوں سے حاضرین کی طبیعتیں مکدر ہو گئیں۔ استاد ارسلان چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ "مجھے منصبِ وزارت قبول ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

اس کے دونوں تلوے لہو لہان ہو گئے۔ جب استاد ارسلان بے دم ہو گیا تو سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

سلطان نے استاد ارسلان سے پوچھا "کیا بات ہے جوان! کیا تجھے منصبِ وزارت پسند نہیں ہے؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا "مجھے منصبِ وزارت دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

پیری پاشا نے اسی وقت استاد ارسلان کو پروانۂ وزارت عطا کیا لیکن شرم کے مارے استاد ارسلان اپنی نظریں نہیں اٹھا رہا تھا۔ سلطان نے حاضرین کو متنبہ کیا "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میرے آدمی دون ہمتی کا مظاہرہ کریں۔ جو جس مقام پر ہے یا جسے جو مقام بخشا گیا ہے وہ اس پر پورا اترے اور کام جاری کرے۔"

سنان پاشا نے عرض کیا "اس ناچیز نے تو اپنی زندگی سلطان کو ہبہ کر دی ہے۔ میں ہر وقت اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔"

سلطان نے حاضرین کو حکم دیا "اب تم جا سکتے ہو۔ میں عنقریب اپنی افواج کو ملک کے مشرقی حصوں میں پہنچا دوں گا۔ تم سب اپنے اپنے محاذ سنبھالنے کی تیاریاں کرو۔"

حاضرین دل برداشتگی سے اٹھے اور سلطان کی طرف پشت کیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

⁂

زکریا کو اپنے استاد ارسلان کی بڑی فکر تھی، اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ اب اس کا تعلق براہِ راست سنان پاشا سے ہو گیا تھا۔ سلطان کے حکم کے مطابق سلطانی فوجیں درۂ دانیال کے سامنے یورپی ساحلی شہر میں جمع ہونے لگیں۔ زکریا کا میدانِ جنگ میں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کا خیمہ سلطان کے چاروں طرف نصب خیموں میں شامل تھا کیونکہ ینی چری سلطان کے معتمد ترین لوگ تھے۔

سنان پاشا نے زکریا کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور اس کو بتایا کہ سلطان کا حکم ہے کہ اب وہ سنان پاشا کے پاس ہی رہے گا۔ زکریا نے دیکھا سنان پاشا کے خیمے میں اس جیسے چند نوجوان اور موجود تھے اور ان سب کو زکریا کی طرح سنان پاشا کے قریب ہی رہنا تھا۔ زکریا کو سنان پاشا پسند نہیں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سنان پاشا کے پاس رہنے سے انکار کر دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس انکار کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

سنان پاشا زکریا اور دوسرے نوجوانوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا اور رات گئے تک واپس نہیں آیا۔ ان لوگوں نے سنان پاشا کی عدم موجودگی میں کھانا کھایا اور سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ اس سرزمین پر حشرات الارض کی کثرت ہے۔ یہ بات زکریا اور اس کے ساتھی نوجوان کو بھی معلوم تھی۔ انہیں سونے کے لئے بستر زمین ہی پر بچھانا تھا لیکن زکریا اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنا بستر لکڑیوں کے ایک چوکھٹے میں لوہے کے ڈوروں سے سی دیا اور اس چوکھٹے کو خیمے میں جھولے کی طرح معلق کر دیا۔

سنان پاشا رات کے پچھلے پہر سلطان کے خیمے سے واپس آیا۔ اور زکریا کو جھولے میں سویا دیکھ کر بہت ہنسا۔ اس نے زکریا کو بیدار کر دیا۔ اور کہا "تجھے میری واپسی تک بیدار رہنا چاہئے تھا۔"

زکریا نے آنکھیں ملتے ہوئے سنان پاشا کو دیکھا تو فوری طور پر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے کون مخاطب ہے۔ اس نے سنان پاشا کی بات بھی اچھی طرح نہیں سنی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے سنان پاشا کو پہچان لیا تو گھبرا کر نیچے اترنے لگا۔ عجلت اور گھبراہٹ میں خود کو نہ سنبھال سکنے کی وجہ سے وہ نیچے گر گیا۔ سنان پاشا کو ہنسی آ گئی لیکن اس نے ہنسی کو بمشکل ضبط کیا اور پوچھا "سونے کا یہ کون سا انداز ہے؟"

زکریا نے جواب دیا "جنابِ والا مجھ کو معلوم ہوا کہ یہاں حشرات

الارض کی فراوانی ہے۔ میں زمین پر بستر بچھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔"

سنان پاشا نے کہا: "ہم جنگ کے لیے نکلے ہیں۔ اپنے سروں کو ہتھیلی پر لے کر، پھر یہ خوف کیا معنی؟"

زکریا نے جواب دیا: "جناب والا! میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن زندگی کو اس وقت تک قیمتی اور قابل حفاظت سمجھتا ہوں جب تک جان دینے کے لیے کوئی بڑا مقصد سامنے نہ ہو۔ بے مقصد خواہ مخواہ حشرات الارض میں اپنی زندگی گنوا دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

سنان پاشا نے منہ بنایا: "ارسلان نے تجھے باتیں بنانے کا ماہر کر دیا ہے۔ بظاہر تو نے مجھے لاجواب کر دیا ہے لیکن میں ان نوجوانوں کو ناپسند کرتا ہوں جو خطرات سے کھیلنا نہ جانتے ہوں۔"

زکریا نے بھی منہ بنایا اور بیزاری سے جواب دیا: "خطرات کو آنے دیجیے۔ اس وقت میں دوسروں سے آگے آگے نظر آؤں گا۔ کیوں کہ میں بزدل نہیں ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنی قیمتی زندگی سلطان پر نچھاور نہ کر سکوں۔"

سنان پاشا نے خیمے کے محافظ کو طلب کیا اور اس سے بقیہ نوجوانوں کی بابت سوال کیا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ سب سوئے ہوئے ہیں۔ سنان پاشا نے حکم دیا۔ "ان سب کو جگا دیا جائے۔"

چنانچہ ان سب کو جگا دیا گیا اور ان سب کو ایک بڑے خیمے میں اکٹھا کر دیا گیا۔ سنان پاشا نے ان کو بتایا کہ انہیں سفر کی تیاریاں کرنا ہیں۔ کیوں کہ سلطان نے صبح تک روانگی کا حکم دے دیا ہے۔

لیکن جب ان نوجوانوں میں بے چینی سی پیدا ہو گئی اور وہ سفر کی تیاریاں کرنے کے لئے جانے لگے تو سنان پاشا نے انہیں روک لیا اور کہا: "پہلے میری باتیں غور سے سن لو۔"

تمام نوجوان گوش بر آواز ہو گئے۔ زکریا کو سنان پاشا کی ہر بات بُری لگتی تھی۔ لیکن مجبور تھا۔ سنان پاشا نے کہا: "ہم سب ایران جا رہے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم فاتح رہیں گے اور فتح مندی کا نشہ شراب سے زیادہ تیز اور آپے سے باہر کر دینے والا ہوتا ہے۔ تم سب نوجوان ہو اور تم سلطان کے معتمدین میں شمار ہوتے ہو۔ ایران میں دولت اور عورت تمہارے اختیار میں ہوں گی۔ اس لئے تمہارا یہ فرض ہوگا کہ خود کو ان دونوں سے محفوظ رکھو۔ لیکن تم نے نہیں سنا کہ سلطان نے نوجوانی کے جوش و خروش کی مثال کس شے سے دی ہے؟ اگر نہیں سنا تو مجھ سے سن لو۔ نوجوانی میں عشق لازمی ہے۔ سلطان نے کہا تھا عشق ہانڈی کے ابال جیسے شے کا نام ہے اور اس کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو روکا نہ جائے تو اس ابال میں انسان کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔"

زکریا نے کہا: "پاشا! آپ کے بقول ہمیں اپنے سفر کی تیاریاں کرنا ہیں۔ اس وقت ہم سب کو روانگی سے پہلے اپنا سامان سمیٹنا چاہئے۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

سنان پاشا ایک دم گرم ہو گیا: "زکریا! اپنی حد میں رہ۔ میں سلطانی فوج کا افسر اعلیٰ ہوں۔ اور تم سب میرے تابع ہو۔ تمہیں میرا حکم ماننا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔" پھر نوجوانوں سے کہا: "دوستو! زکریا گستاخ ہے۔ لیکن اس کی بڑی بڑی اور بُری بُری باتیں ہم اس لئے گوارا کر لیتے ہیں کہ اس نے معاملات عشق میں بھی سلطان کا خیال رکھا ہے۔ تم سب کو اس معاملے میں اس کی اتباع کرنی ہے۔"

زکریا حیران رہ گیا کہ وہ سنان پاشا جسے کبھی پسند نہیں آیا۔ دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔ صفی الدین کے قتل اور ناہید سے دستبردار ہو کر وہ خاصا شرمندہ ہوا تھا مگر اب مختلف سمتوں سے جب اس کے اس فعل کو بار بار سراہا جا رہا تھا تو اسے اپنے کئے پر ندامت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ خود کو ایک غیر معمولی اور دوسرے نوجوانوں کے لئے ایک قابل تقلید نوجوان محسوس کرنے لگا تھا۔

سنان پاشا نے زکریا کو تخلیے میں طلب کر کے سمجھایا۔ "زکریا! میرے دل میں تیری بڑی عزت ہے۔ کیونکہ سلطان بھی تیری عزت کرتا ہے۔ یہ جوانی کے جذبوں سے سرشار نوجوان تیری ہی اتباع کریں گے۔"

اب زکریا سنان پاشا کے ہاتھوں مفتوح ہو چکا تھا۔ جب فوج نے یہاں سے کوچ کیا تو زکریا نے ذہنی طور پر سنان پاشا کو اپنے استاد ارسلان کی جگہ دے دی تھی۔ اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ سنان پاشا سے کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

گھوڑے کی پیٹھ پر ہوں والا پرچم سنان پاشا کے ساتھ حرکت کرتا تھا اور سلطان کی سپاہ کے اسی ہزار گھوڑے جب مشرق کی طرف بڑھے تو گویا زلزلہ سا آ گیا۔ گرد و غبار کا طوفان زمین سے اٹھ کر فضا کے بسیط میں پھیل گیا اور آبادیاں خیالے غبار میں چھپ گئیں۔ ان کے ہتھیاروں کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ خودوں میں چھپے ہوئے چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ کئی دن بعد یہ فوج دریائے سقریہ کے غربی ساحلی شہر اسکی۔۔۔ میں داخل ہو گئی۔ یہاں فوج کے کچھ حصے نے قیام کیا اور بقیہ دریا کو عبور کر کے ایاس میں داخل ہو گیا۔

سنان پاشا والی فوج ایاس میں ٹھہر گئی اور سلطان اپنی فوج کو لے کر دریائے قزل ارماق کے کنارے کنارے قیصریہ کی طرف بڑھا۔ اس نے سنان پاشا کو حکم دیا تھا کہ وہ چند دن ایاس میں ٹھہر کر دریائے قزل ارماق کو عبور کرے گا اور سیدھا سیواس پہنچ کر دم لے گا۔ پھر سلطان کا یہ عظیم الشان لشکر دریائے قزل ارماق کے دونوں ساحل پر قیصریہ سے سیواس تک پھیل جائے گا۔

سیواس جانی پہچانی جگہ تھی یہاں زکریا پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس نے سیواس والوں کو سلطانی لشکر سے خوف زدہ محسوس کیا۔ یہاں سنان پاشا نے زکریا کو حکم دیا کہ وہ اپنے جیسے نوجوانوں کو لے کر ادھر ادھر مشتبہ لوگوں کو تلاش کرے۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ سلطانی لشکر کے آس پاس کسی نہ کسی شکل میں شاہ ایران کے جاسوس سرگرم عمل ضرور ہوں گے۔ زکریا اور اس کے ساتھی نوجوان لشکر سے نکل کر عام شہریوں کے لباس میں گھومنے

پھرنے لگے۔

کئی دن سیواس کے سامنے دریائے قزل ارماق کے ساحلی علاقوں میں گھوم پھر کر وہ غربی ساحل پر اتر گیا۔ اسی ساحل پر قیصریہ تھا جہاں سلطان اپنی فوج کے ساتھ ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ قیصریہ سے ذرا فاصلے پر وہ اپنے پرجوش نوجوانوں کے ساتھ شکار کھیلنے لگا۔ اس نے ذرا سی دیر میں کئی جانور شکار کر لئے۔ شام سے پہلے پہلے وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہو گیا۔ لوگ سلطانی افواج سے خوف زدہ تھے۔ اس حالت خوفزدگی میں جب وہ بستی میں داخل ہوا تو بستی والوں نے ان کو بمشکل قبول کیا۔ انہیں یہ شبہ تھا کہ زکریا اور اس کے ساتھ بھی مشتبہ لوگ ہیں۔ لیکن زکریا نے انہیں یقین دلایا کہ اس کا لشکری سپاہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ سیواس کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے۔ اور یہ اس کے دوست احباب ہیں۔ بستی کے تاجر نے انہیں مہمان بنا لیا اور اچھی بڑی آؤ بھگت کی۔

زکریا نے رات کو اس تاجر کی چوپال میں بیٹھ کر سلطان اور اس کی سپاہ کو خوب برا بھلا کہا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ سلطان حملہ آور ٹھہرے گا اور شاہ ایران اس حملہ آور کو بالآخر وہ دندان شکن جواب دے گا کہ سلطان عمر بھر یاد رکھے گا۔

تاجر کو زکریا کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اس کے ساتھ خاندان کے اور لوگ بھی تھے اور یہ سارے ہی تاجر تھے۔ جنگی احوال نے ان کا کاروبار بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایران سے سامان تجارت لا کر ترکی کے شمالی اور مغربی علاقوں میں نکل جاتے تھے اور وہاں سے خوب خوب کماتے۔ اب سلطانی افواج نے ان کے کاروبار کو ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا۔

تاجروں کے شکوہ شکایت سے متاثر ہو کر زکریا نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ سیواس کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے اور سلطان سلیم اس کے باپ پر یہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے علاقے سے سلطان کے لئے آدمی بھرتی کرے۔ جب کہ نام نہاد جاگیردار سلطان کی جابرانہ کوششوں میں اس کا ساتھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے باپ سے اجازت لے کر چند دنوں کے لئے سیواس سے فرار ہو گیا ہے۔ جب سلطان آگے ایران کی سرحد تک پہنچ جائے گا تو زکریا اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔

تاجروں کی چوپال میں زکریا اور اس کے ساتھیوں کی شاندار ضیافت ہوئی اور ضیافت کے بعد علاقائی رقص و موسیقی کا اہتمام ہوا۔ خاندان کے بزرگوں نے انہیں زیادہ پسند نہیں کیا کیوں کہ ان کی لڑکیاں ان میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی تھیں۔ تاجروں کی کنیزوں نے مہمانوں کو اپنے بہترین رقص اور گیتوں سے بہت محظوظ کیا۔

نصف رات تک یہ محفل جمی رہی۔ اس کے بعد لوگوں کو نیند آنے لگی۔ زکریا اور اس کے ساتھیوں کو ایک پورا مکان دے دیا گیا۔ اس میں بستر لگا دیئے گئے اور میزبان شب بخیر کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہوں میں گھس گئے۔ زکریا جس مقصد سے یہاں آیا تھا، اس کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ "ہمارے میزبان زیادہ لائق اعتبار نہیں ہیں۔ ہمیں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ یہ تاجر کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔"

رات کے پچھلے پہر جب کہ صبح زیادہ دور نہیں تھی کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر چراغ کے چراغ جل رہے تھے اور ان کی مدھم روشنی اور رات کے سناٹے نے ماحول کو پراسرار اور پرخوف بنا رکھا تھا۔ زکریا کا ایک ساتھی اٹھا اور دروازے کی طرف جانے لگا لیکن زکریا نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا اور اپنے پاس بلا لیا۔ آتنی دیر میں دوبارہ دستک دی گئی۔ زکریا نے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہا: "رات کے پچھلے پہر کی دستک بڑی معنی خیز ہے۔ بلکہ کچھ اور ہی بتا رہی ہے۔ کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

تیسری بار پھر دستک دی گئی اور کہا گیا ہے کہ اکیلے ہو تو، جو جمیل خان سیواس کے جاگیردار زادے!" دروازہ زکریا کو حواس باختہ کر گیا۔ لیکن حاضر کرتا ہیں۔

زکریا اپنے ساتھی کو لے کر دروازے پر گیا اور بولا: "خرم زاد! تیرے سوال کا جواب... "تیرا پریشان ہو گئے تھے۔ اس لئے ستون کی آڑ میں چھپ کر ساتھی سے دروازے میں داخل ہوئے تو اس خیال سے مکان میں تین آدمی داخل ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ کہیں وہ سلطانی لشکر کے تیرانداز دست جاگیرزادہ کہاں چلا گیا؟"

زکریا نے انہیں خالی ہاتھ دیکھا تو ذرا اطمینان ہوا ۔۔۔ دوسری یہ بات بھی ذہن نشین رہی یا مخالفت سامنے پہنچ گیا، پوچھا: "دوستو! کیا بات ہے؟"

تینوں نے زکریا کو ستون کے پیچھے سے نمودار ہوتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا: "جاگیرزادے! یہ ستون کے پیچھے تم کیا کر رہے تھے؟"

زکریا نے جواب دیا: "تہجد پڑھ رہا تھا کیونکہ نوجوانی کی عبادت زیادہ مقبول ہوتی ہے۔"

ایک نے آگے بڑھ کر زکریا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور چراغ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا: "نوجوان! ذرا ادھر چراغ کی طرف چلو۔ وہاں تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

زکریا کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ پوچھا: "چراغ کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں جو بات کرنا ہے یہیں اسی جگہ کر لو۔"

اس نے جواب دیا: "یہاں نیم تاریکی میں باتیں کر کے مزہ نہیں آئے گا۔ روشنی میں اس کا بھی امکان ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر باتیں کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں آپس میں صورت آشنا نکل آئیں۔"

زکریا گھبرا گیا: "لیکن تم مجھے کس طرح پہچان لوگے؟ میں سیواس کے جاگیردار کا بیٹا اور تم لوگ ٹھہرے تاجر۔ دونوں میں کوئی قدر مشترک ہے ہی نہیں پھر ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

اس شخص نے کہا۔ نوجوان! میں پچھلے سال سیواس کے جاگیردار کے پاس تجارتی سامان لے کر گیا تھا۔ وہاں میں نے اس کے بیٹوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ میں اس کے خاندان کے بیشتر افراد سے واقف ہوں۔"

زکریا نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ "تو تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے تمہیں وہاں نہیں دیکھا تھا۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "نہیں یہ بات بھی نہیں۔ کیونکہ جب میں سیواس کے جاگیردار کے عزیزوں اور رشتے داروں سے مل رہا تھا تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اس کے دو بیٹے اور بھی جو شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے تم ان دو میں سے ایک ضرور ہو گے۔"

کرنا پسند کرتا ہے۔ زکریا کی جان میں جان آئی۔ پھر بھی اس نے مزید وضاحت

زکریا نے سیب اٹھا۔ تم نے مجھ کو شام کو اور پھر رات کو تو دیکھ ہی لیا ہو گا۔ دیکھیے۔ اس وقت میں وہ واہی سی رسم ہے جو باقی رہ گئی تھی اور اس کو اب پورا میں بزدل نہیں ہوں لیکن میں یہ بھی

پر پچھا ور نہ کر سکوں۔ میں آج رات ہی کو یہاں واپس آیا ہوں۔

سنان پاشا نے خیمے کے محافظے تجارت سے کر ایران کا رخ کیا تھا۔ کی بابت سوال کیا۔ اسے بتایا گیا کہ ویسی خدا بھلا کرے سلطان کا کہ وہ لوگ نے حکم دیا۔ ان سب کو جگا دیا۔ اور وہ مہم میں کامیاب اور کامران رہے

چنانچہ ان سب کو جگا دیجیے۔

اکٹھا کر دیا گیا۔ سنان پاشا نہ آئی اور وہ اپنے مخاطب کے ساتھ چراغ کی کیوں کہ سلطان۔ دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔ اس شخص کے دونوں ساتھی بھی چراغ ہی کے پاس چلے گئے۔ زکریا نے بھی ان دونوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن پہچان نہیں سکا۔ کیونکہ تینوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا، جس کو پہلے دیکھا ہو۔

زکریا کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ تینوں تاجر اس پر کسی قسم کا شک نہیں کر رہے ہیں تو اس نے تینوں سے کہا۔ "ہاں جناب! اتنی رات گئے آپ تینوں کی تشریف آوری کا مطلب؟"

ایک نے جواب دیا۔ "سیواس کے جاگیردار کے بیٹے! کیا تو یہ جانتا ہے کہ جاگیرداروں کے بیٹے کس قسم کے ہوا کرتے ہیں، اور یہ کہ سیواس کے جاگیردار نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔ پھر یہ اس کے بیٹے کہاں سے آ گئے۔"

زکریا سٹپٹا گیا۔ بولا۔ "میرا اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں تمہیں جھٹلاؤں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کو اس وقت جھوٹ بولنا چاہیے جب اس کو یقین ہو جائے کہ وہ جس شخص کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔"

ایک نے کہا۔ "تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تینوں تم سے ذرا بھی واقف نہیں۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "شاید یہ بات بھی درست ہو۔"

ان تینوں میں سے ایک شخص ان دونوں کو پیچھے ہٹا کر زکریا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پوچھا۔ "نوجوان! تم ایک بات تو بتاؤ۔"

زکریا نے کہا۔ "پوچھو، ایک نہیں دس باتیں پوچھو۔ میں جواب ضرور دوں گا۔"

اس شخص نے ایک بار پھر زکریا کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ تو سیواس کے جاگیردار کا لڑکا نہیں ہے تو تو کیا کہے گا! کیا کہے گا؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "پھر میں دلیلوں کی مدد سے تیرے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کروں گا۔"

اس شخص نے مسکرا کر کہا۔ "شاید تو مجھے نہ جھٹلا سکے کیوں کہ ہم کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔"

زکریا کو ان کی باتوں سے وحشت ہو رہی تھی۔ چڑ کر بولا۔ "صاحبان میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور پھر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ تم تینوں نے ہمیں رات کے پچھلے پہر خواہ مخواہ بیدار کر دیا۔"

ایک نے ہنس کر کہا۔ "ہم نے کم از کم تجھے تو نہیں بیدار کیا ہے۔ کیونکہ تو نے ہی ہمیں یہ بتایا ہے کہ ابھی ابھی تو تہجد پڑھ رہا تھا۔"

زکریا نے بیزاری سے کہا۔ "اچھا اگر میں تہجد پڑھ رہا تھا تو بھی میں یہ کہوں گا کہ تم نے میری عبادت میں خلل ڈال دیا۔ ایسا تمہیں نہیں کرنا تھا۔"

ان تینوں نے آپس میں اشاروں ہی اشاروں میں معلوم نہیں کیا کہا کہ ایک نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ "ساتھیو! کیا خیال ہے بات صاف صاف کر لی جائے؟"

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس شخص نے ایک بار پھر زکریا کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کے بعد کہا۔ "سیواس کے جاگیردار کے لڑکے! ہم اتنے سادہ لوح نہیں ہیں کہ زکریا کو بھی نہ پہچان سکیں۔ ہم زکریا اور اس کے ساتھیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

زکریا کو یوں لگا جیسے وہ بہت ہلکا ہو کر ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پورے وجود میں خوف کی لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ آہستہ سے جھٹلانے کی ناکام کوشش کی۔ "کون زکریا؟ تم کس زکریا کی بات کر رہے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "کم از کم میں اس زکریا کی بات کر رہا ہوں جو جھیل وان کے کنارے صفی الدین کا مہمان ہوا تھا اور جو صفی الدین کی بیٹی ناہید پر مرتا تھا اور پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ ناہید کا باپ اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کر دیا گیا۔ اور زکریا ناہید کو کچھ بتائے بغیر ہی اس طرح غائب ہوا کہ پھر کسی نے اس کی شکل تک نہ دیکھی۔"

زکریا کے دل پر آرا سا چل گیا۔ وہ اندرونی خلش سے تڑپ سا گیا۔ بے چینی سے پوچھا۔ "دوستو! تم معلوم نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ کہیں شراب تو نہیں پی رکھی ہے! اگر ان باتوں سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اسی وقت یہاں سے

چلے جائیں گے۔"

اس شخص نے زکریا کا گریبان پکڑ لیا۔ "زکریا! اب اور بیوقوف نہ بنا۔ میں صفی الدین کی قوم کا آدمی ہوں، یہ سارے تاجر، جن کا تو مہمان ہے صفی الدین ہی کی قوم کے لوگ ہیں۔ میں نے تجھے صفی الدین کے پاس دیکھا تھا لیکن تو مجھ سے واقف نہیں۔ میں نے صفی الدین اور اس کے گھر والوں سے سنا تھا کہ تو اس کی بیٹی ناہید سے محبت کرتا ہے اور ناہید بھی تجھ سے عشق کرتی ہے۔ جب صفی الدین اور میری قوم کے لوگ تیرے سپہ سالار سنان پاشا کے آدمیوں کے ہاتھوں ہلاک کر دیے گئے۔ میں اپنی تاجر برادری کے ساتھ ایران گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا اور اس المیے کا علم ہوا تو ہم سب بہت روئے۔"

اب زکریا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "پھر اب تو کیا چاہتا ہے؟ تو نے یا تیری قوم کے لوگوں نے ہمیں مہمان بنا کر رکھا، ان سے ان کا مقصد؟"

اس نے جواب دیا۔ "زکریا! پہلے تو میرا نام سن لے۔ میرا نام خرم زاد ہے۔" پھر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں میرے شریک کار ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ رات کو جب میں نے تجھے رقص و سرود کی محفل میں میر مجلس بنے دیکھا تو اسی وقت تجھ کو پہچان لیا تھا۔ میں چاہتا تو اسی وقت تیرا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سنان پاشا اور تیرے ہاتھوں جو کچھ ہو چکا تھا اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ اب جب کہ میری پوری برادری سو گئی ہے میں خاموشی سے تیرے پاس آ گیا ہوں۔"

زکریا نے پھر سوال کیا۔ "ان ساری باتوں کا لب لباب؟ مقصد؟ تو شاید یہاں انتقامی کارروائی کرنا چاہتا ہے؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ سلطان، سنان پاشا یا تم لوگوں نے میری دغاباز قوم کے ساتھ جو سلوک کیا اس میں تم سب حق بجانب ہو۔ غداروں اور دغابازوں کو کب اور کس نے معاف کیا ہے؟"

زکریا کے دل پر اس کی باتوں کا اچھا اثر ہو رہا تھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "ناہید کہاں ہے؟"

خرم زاد نے کہا۔ "پہلے میری باتیں سن لو پھر ناہید کا پتہ بھی بتا دوں گا۔"

زکریا نے کہا۔ "اب کون سی باتیں کرنا ہیں؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "زکریا! جیسا کہ میں نے بتلایا کہ ہم تاجر لوگ ہیں۔ ہمیں صفی الدین کی غلطیوں پر ندامت ہے۔ اب ہم سب سلطان کے وفادار ہیں۔ ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ جب تک جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں تم لوگ ہمیں اپنے لشکر میں تجارت کی اجازت دے دو۔ ہم لوگ اور کہیں تو جانے سے رہے۔ سلطانی عساکر ہی میں تھوڑا بہت کاروبار کر لیں گے۔"

زکریا نے کہا۔ "پہلے مجھے سوچنے دو کہ میں کس طرح تمہارا کام کر سکوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ ناہید کہاں ہے اور کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "ہمیں اپنے لشکر میں لے چلو۔ جب میری برادری کو یہ معلوم ہو گا کہ اس کو تیری وجہ سے کاروباری فائدہ پہنچا ہے تو وہ تیری احسان مند ۔ ۔ ۔ ہو جائے گی اور اس احسان مندی میں ناہید کو بھی تجھ سے ملا دیا جائے گا۔"

زکریا نے کہا۔ "صبح ہونے دو۔ تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے گا۔"

خرم زاد نے سرگوشی میں سوال کیا۔ "جب تو صفی الدین سے ملا تھا تو تیرا جو مقصد تھا۔ اس کا ہر کسی کو علم ہو چکا ہے۔ لیکن کیا تو بتا سکتا ہے کہ اس برادری کے لوگوں سے دوبارہ ملاقات کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور اس بار بھی تو اپنے بارے میں وہ نہیں بتا رہا جو ہے۔ بلکہ کچھ اور ہی بتایا ہے۔ کیا اس بار بھی کوئی اسی نوع کا منصوبہ ہے کہ آیا ہے تو، جو جھیل وان کے کنارے لے کر پہنچا تھا۔"

خرم زاد کے اس سوال نے زکریا کو حواس باختہ کر دیا لیکن حاضر دماغی نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ بولا۔ "خرم زاد! تیرے سوال کا جواب پیچیدہ نہیں ہے۔ ہم لوگ سفر کرتے کرتے پریشان ہو گئے تھے۔ اس لئے سیر و تفریح کا منصوبہ بنا لیا۔ جب اس بستی میں داخل ہوئے تو اس خیال سے اپنی اصل حیثیت بستی والوں پر ظاہر نہیں کی کہ کہیں وہ سلطانی لشکر کے سپاہیوں کی آمد سے خوف زدہ نہ ہو جائیں اور دوسری یہ بات بھی ذہن نشین تھی کہ بستی کے لوگ معلوم نہیں سلطانی اقدام کی تائید میں ہیں یا مخالفت میں۔ اس طرح میں اپنے اصلی تعارف سے انہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

خرم زاد نے سرد آہ بھری۔ "آہ میری قوم! اب آدمیوں کو اپنے تمام پیشے چھوڑ کر محض سپاہی بن جانا چاہیے۔ ہمیں بھی تجارت سے دستبردار ہو کر عسکری زندگی اختیار کر لینا چاہیے۔ کیوں کہ ایک سپاہی کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ تاجر اس سے محروم ہے۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ہے تو تم لوگ عسکری زندگی اختیار کر لو۔ میں سلطان سے تمہاری سفارش کر دوں گا۔"

خرم زاد نے کہا۔ "میں تجارت ہی سے زندہ رہ سکتا ہوں۔ میرا تجربہ، میری عزت تجارت ہے۔ اگر ہم لوگ اپنی اس زندگی سے توبہ کر لیں اور عسکری زندگی میں داخل ہو جائیں تو اس میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے ہمیں بڑی محنت کرنا ہو گی اور فی الفور ہم اس سے اتنا نہیں حاصل کر سکیں گے جتنا تجارت سے حاصل کر لیتے ہیں۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "ہاں یہ بات تو ہے۔ بہرحال اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہیں عسکری زندگی میں بھی داخل کرا سکتا ہوں۔"

خرم زاد نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ زکریا نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو سلطانی لشکر میں کس طرح داخل کیا جائے؟

زکریا اپنے ساتھیوں کو لے کر علی الصبح قیصریا کی طرف روانہ

ہونے لگا، جہاں عساکرِ سلطانی کے خیمے تھے۔ خرم زاد نے اسے تھوڑی دور تک پہنچ کر خدا حافظ کہا۔ زکریا نے رخصت ہونے سے پہلے خرم زاد سے وعدہ لیا کہ اگر اس نے ان تاجروں کا کام کر دیا تو وہ زکریا سے ناہید کی ملاقات کرا دے گا۔

زکریا بڑے پس و پیش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سلطانی لشکر میں وہ کس سے رابطہ قائم کرے کہ یہ کام ہو جائے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلطانی لشکر کو بہت سی چیزیں درکار ہوں گی، جنہیں یہ تاجر مہیا کر سکتے ہوں گے اور بظاہر یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا محسوس ہو رہا تھا۔

زکریا اور اس کے ساتھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار سلطانی عساکر کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ دورانِ سفر زکریا کو یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا تھا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق سنان پاشا کی افواج سے تھا۔ اور اب جو وہ سلطانی عساکر میں جائے گا تو سلطان کو اس پر سخت اعتراض ہوگا اور یہ بھی ممکن تھا کہ زکریا کی اس حرکت پر سلطانی عتاب نازل ہو جائے۔ اگر بیچ میں ناہید کا ذکر نہ آجاتا تو شاید وہ اس معاملے میں اتنی دلچسپی بھی نہ لیتا۔

اس نے میلوں دور سے خیموں کا شہر دیکھ لیا۔ زمین پر بچھے ہوئے خیمے گلدستے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ یہاں دور دور تک مکانات کے آثار نہیں تھے۔ اس نے ایک خیمے پر گھوڑے کی تین دموں والا پرچم دیکھا۔ یہ آہستہ آہستہ اس خیمے کی طرف بڑھا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ یہ پرچم کسی اعلیٰ منصب دار کے خیمے ہی پر لگ سکتا تھا۔ خیمے کے سامنے سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ ان سپاہیوں نے زکریا اور اس کے ساتھیوں کو روک لیا۔ وہ سلطانی سپاہ کو اس کے لباس اور وضع قطع سے پہچان سکتے تھے مگر حالتِ جنگ میں یہ شناخت بھی مشتبہ ٹھہرتی تھی۔ انہوں نے زکریا کو روک لیا اور پوچھا: "تم کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟"

زکریا نے سیدھا سچا جواب دیا: "ہمارا تعلق سنان پاشا کی افواج سے ہے۔ میں تمہارے فوجی سردار سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ایک محافظ نے انہیں حکم دیا کہ "وہ سب خیمے سے اس وقت تک دور رہیں جب تک کہ انہیں پاس آنے کی اجازت نہ دی جائے۔"

چند محافظوں نے زکریا کا راستہ روک لیا اور ایک محافظ اپنے سردار کے خیمے میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب وہ اندر سے نمودار ہوا تو ایک اور شخص اس کے ساتھ تھا۔ یہ پاشا کے لباس میں تھا۔ زکریا نے اس کو دیکھا تو چونک گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر دوڑ کر اس شخص سے چمٹ گیا اور بے اختیار بولا۔

"استادِ محترم! یہ آپ! یہ آپ یہاں کہاں؟"

یہ استاد ارسلان تھا۔ اس نے بھی زکریا کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جذباتی آواز میں پوچھا: "یہ تو یہاں کہاں؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ تجھے سنان پاشا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔"

زکریا نے بھی گلوگیر آواز میں جواب دیا: "استادِ محترم! میں نے آپ کو بہت تلاش کیا۔ لوگوں سے آپ کی بابت سوالات کیے مگر کہیں اور کسی سے بھی کوئی ایسا جواب نہ ملا جس سے میں مطمئن ہو جاتا۔"

استاد ارسلان نے پوچھا: "کیا یہ درست ہے کہ تو سنان پاشا کے حوالے کر دیا گیا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا: "ہاں یہ درست ہے مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟"

استاد ارسلان نے کہا: "سلطان کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کے ملازم وہاں نہ نظر آئیں جہاں انہیں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ تجھے تو سنان پاشا کے آس پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ تجھ کو یہاں دیکھ کر برہم ہو جائے گا۔"

زکریا نے کہا: "استادِ محترم! مجھے اندر چلنے اور پہلے میری بات سن لیجیے، اس کے بعد نصیحتیں کیجیے۔"

استاد ارسلان نے زکریا کے ساتھیوں کو باہر ہی کھڑا رہنے دیا اور خود زکریا کے ساتھ اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ جب یہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو استاد ارسلان نے کہا: "ہاں زکریا! اب اپنی روداد سنا تاکہ اس روداد کی روشنی میں تجھ کو کوئی مشورہ دیا جا سکے۔"

زکریا نے ساری روداد سنا دی اور آخر میں کہا: "استادِ محترم! ہمیں تو مشتبہ اور جاسوس صاحبان کی تلاش تھی لیکن ہمیں مل گئے تاجر۔ یہ لوگ بھی صفی الدین کے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان میں ایک خاص صفت ہے۔ یہ جب کبھی بھی کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس سے روگردانی نہیں اختیار کرتے۔ یہ اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔"

استاد ارسلان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "بس زیادہ قدآور سے دوسری باتیں کرو۔"

زکریا نے اصرار کیا: "استادِ محترم! خرم زاد نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر میں نے بحیثیتِ تاجر اس کی قوم کو سلطانی عساکر میں گھوم پھر کر سامان بیچنے کی اجازت دے دی تو وہ اس کے عوض مجھے ناہید سے ملا دے گا۔" پھر استاد ارسلان سے پوچھا: "استادِ محترم! ناہید کون ہے، کچھ یاد ہے آپ کو یا نہیں ہے؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا: "کیوں یاد کیوں نہیں! جھیل وان کے کنارے آباد صفی الدین کی بیٹی تیری محبوبہ۔ میں اس کا ذکر سن چکا ہوں۔ یہ وہی لڑکی ہے تو نے جس کی محبت کی پروا کیے بغیر صفی الدین کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اس کا سلطان پر اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ اس نے تیرے اس حزم و احتیاط کا بار بار تذکرہ کیا۔ تمام لوگوں کو تیری مثال دے دے کر یہ باور کرا دیا ہے کہ ہر کوئی زکریا کا اتباع کرنا چاہیے۔"

زکریا نے درخواست کی: "استادِ محترم! اگر خرم زاد کے ہم قوم تاجروں کو سلطانی عساکر میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے تو میرا کام بن سکتا ہے۔ میں ناہید تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

استاد ارسلان نے اس کو سمجھایا: "زکریا! نادانی نہ کر۔ تو بار بار ناہید کا ذکر نہ کر، کیونکہ جب تو نے اس کو بھلا دیا تو اب اس کا یہ بار بار ذکر کیوں ہے؟"

زکریا نے عرض کیا: "استادِ محترم! میں کس طرح آپ کو یہ یقین دلاؤں کہ ابھی تک مجھ میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ میں اب بھی اپنا سب کچھ سلطان کے حکم اور اپنے نصب العین پر قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن جب سلطان کا حکم اور میرا نصب العین دونوں ہی آڑے نہ آ رہے ہوں تو میں ناہید کو کس طرح بھلا سکتا ہوں۔"

استاد ارسلان کچھ دیر کے لیے پھر خاموش ہو گیا۔ آخر پوچھا۔ "ہاں تو خرم زاد صفی الدین اور اس کی قتل ہو جانے والی قوم کی بابت کیا کہہ رہا تھا؟"

زکریا نے جواب دیا: "وہ ہلاک ہو جانے والوں کو دغاباز اور غدار کہہ رہا تھا۔ وہ سلطان کو حق بجانب قرار دے رہا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس کی قوم کے لوگ تجارت چھوڑ کر سلطان کے زیرِ سایہ عسکری زندگی اختیار کرنے کو تیار ہیں۔"

استاد ارسلان نے کہا: "اچھا! میں یہ کرتا ہوں کہ خرم زاد اور اس کی قوم کو یہاں اپنے لشکر میں ٹھہرائے لیتا ہوں۔ میں ان کی نگرانی کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم کو دغاباز اور غدار کہنے والا کس حد تک ان کا اپنا جاں نثار اور وفادار ہو سکتا ہے۔ جو اپنی قوم کا نہ ہوا وہ کسی اور کا کس طرح ہو سکتا ہے۔"

لیکن زکریا کو بس ایک ہی بات یاد تھی، بولا: "استادِ محترم! آپ مجھ پر اعتماد کیجیے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ زیادہ وقت نہ لیجیے اور خرم زاد کی تاجر قوم کو سلطانی افواج میں تجارت کرنے کا حکم دے دیجیے۔"

استاد ارسلان نے جواب دیا: "زکریا! تو ابھی تک ناتجربہ کار ہے۔ بہرحال خرم زاد اور اس کی قوم کے لوگوں کو میرے پاس لے آ۔ میں ان سے باتیں کرنے کے بعد کچھ کروں گا۔ اس سے پہلے تو میں وعدہ تک نہیں کروں گا۔"

زکریا نے اسی وقت واپس جانے کی اجازت طلب کی، جو نہیں دی گئی۔ استاد ارسلان نے اس کو روک لیا، کہا۔

"زکریا! تو کافی دنوں بعد ملا ہے۔ اب کچھ دیر میرے پاس رہ۔ کیا تجھ کو سلطان کی وہ بات یاد ہے جو باتڈی کے ابال اور نوجوان کے جوش و خروش کی بابت کی گئی تھی؟"

زکریا نے جواب دیا: "جی استادِ محترم! مجھے وہ بات اچھی طرح یاد ہے۔"

استاد ارسلان نے کہا: "لیکن افسوس کہ تو ناہید کے تعاقب میں سلطان کی نظروں سے گرنے والا ہے۔"

استاد ارسلان نے زکریا سے بڑی باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ زکریا اس کے مرتبے اور اعزاز سے بہت خوش تھا، بولا: "استادِ محترم! اب آپ جس مقام پر فائز ہیں اس سے میں بہت خوش ہوں۔"

استاد ارسلان نے افسردگی سے جواب دیا: "لیکن میں نے جس منصب یا جس نوع کے منصب کی خواہش کی تھی، افسوس کہ وہ میں حاصل نہیں کر سکا۔ میں چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا منصب حاصل کر لوں جس سے میں سلطان سے دور آزادانہ زندگی گزار سکوں۔ میں اقامتی درس گاہ کے ماحول سے تنگ آ چکا تھا، لیکن سلطان نے مجھ کو سدگی عندائے میں شامل کر لیا۔" پھر نظریں جھکا کر شرمندگی سے کہا: "اور یہ تماشا تو ہر اس شخص نے دیکھ لیا جو وہاں موجود تھا کہ سلطان نے میرے نتھوں کو لہولہان کر دیا تاکہ میں اس کی عطا کردہ وزارت سے بھاگ نہ سکوں۔"

ذکریا نے آہستہ سے کہا: "سلطان آخر سلطان ہے، اس کی ہر بات میں ایک شان ہے۔"

استاد ارسلان نے ذکریا اور اس کے ساتھیوں کو اس دن خرم زاد کے پاس نہیں جانے دیا لیکن دوسرے دن نمازِ فجر کے فوراً بعد روانہ کر دیا اور ذکریا سے کہا: "تو خرم زاد کو یہ یقین دلا دے کہ میں اس کی سلطان سے ملاقات کرا دوں گا اور وہ جو کچھ چاہتا ہے سلطان سے اس کی منظوری دلوا دی جائے گی، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ناہید کو تجھ سے پہلے ہی ملوا دے۔"

ذکریا چلا گیا۔ اُس دن قیصریہ گرد و غبار میں ڈوبا ہوا تھا۔ تیز ہواؤں میں دھول اتنی زیادہ اڑ رہی تھی کہ ذکریا کو اپنے سامنے کی دس بیس قدم دور کی چیزیں بھی صاف نظر نہیں آتی تھیں۔ ذکریا کے ساتھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر رومال ڈال لیے تھے تاکہ آنکھیں گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔

ذکریا نے دریائے قزل ارماق کے ساحل پر کچھ لوگوں کو منتظر دیکھا۔ خرم زاد اور اس کے ساتھی تھے۔ خرم زاد نے آگے بڑھ کر ذکریا کا استقبال کیا اور بآوازِ بلند پوچھا: "دوست! میں تو مایوس ہو چلا تھا کیونکہ مجھے شبہ گزرا تھا کہ تیری بابت سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد کہیں تو خوف یا شرم سے راہِ فرار نہ اختیار کر لے۔"

ذکریا نے جواب دیا: "خرم زاد! میں تیرے کام سے گیا تھا اور اس وقت تک میرا واپس آنا فضول تھا جب تک کہ تیرا کام ہو نہ جاتا۔"

خرم زاد نے بے اختیار پوچھا: "کیا وہ کام ہو گیا ہے؟"

ذکریا نے جواب دیا: "ہاں ہو گیا، مگر میں اس وقت تک تجھے سلطان کے پاس نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ تو مجھ کو ناہید سے نہیں ملوا دے گا۔"

خرم زاد نے فکر و تشویش سے کہا: "میں نے وعدہ کیا ہے کہ تجھ کو ناہید سے ضرور ملوا دوں گا لیکن اس کے لیے تجھ کو وقت دینا ہو گا۔ ناہید یہاں نہیں ہے وہ کہیں دور ہے۔ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔"

ذکریا اداس ہو گیا۔ اس کو خرم زاد کی ہیرا پھیری پر بڑا غصہ آیا، بولا: "خرم زاد! یہ کیا مذاق ہے۔ تیری نسبت میرا کام بہت مشکل تھا لیکن میں کر آیا۔ افسوس کہ میں تجھ کو اس وقت تک سلطان کے پاس نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ تو مجھے ناہید سے نہ ملوا دے۔"

خرم زاد نے چاپلوسی اختیار کی خوشامدانہ لب و لہجہ اختیار کیا۔ "ذکریا! تو میرے ساتھ چل! میری قوم کے لوگ تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہم سب کی تجارتی موت زندگی تیری کوششوں پر منحصر ہے تو ایک ناہید کی بات کر رہا ہے ہم اپنی دس ناہید تیرے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ انہیں تمہارے گھروں میں باعزت مقام حاصل ہو، تو میرے ساتھ میری قوم میں چل دہیں ساری باتیں طے پا جائیں گی۔"

ذکریا اپنے ساتھیوں سمیت خرم زاد کی تاجر برادری میں چلا گیا۔ ان کے جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں ذکریا کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ ذکریا کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہیں۔

خرم زاد نے انہیں اسی مکان میں ٹھہرا دیا جہاں وہ ایک رات پہلے بھی بسر کر چکے تھے۔ ذکریا کے سامنے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ ایک بوڑھا دونوں ہاتھوں سے بھیڑ کو چیرتا ہوا ذکریا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک ذکریا کی صورت بغور دیکھتا رہا۔ اس کے بعد طنزیہ لہجے میں بولا: "تو یہ تو ہے ذکریا۔ تو میرے بھائی صفی الدین کا مہمان بن کر اس کی تباہی اور بربادی کا سبب بن گیا۔ اب تو ہم میں سیواس کے جاگیردار کا بیٹا بن کر آ گیا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تیرے کیا ارادے ہیں؟"

خرم زاد نے بوڑھے کو بولنے سے روک دیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا: "عمِ محترم! اب سابقہ باتیں بھلا دیجیے۔ ذکریا نے جھیل وان کے کنارے جو کچھ کیا، وہ سلطان کے حکم پر کیا اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ سلطان اپنے غداروں اور دغابازوں سے شفقت آمیز سلوک کیوں کرتا۔ ذکریا نے جو کچھ بھی کیا، اب اس کی یوں تلافی ہوئی جا رہی ہے کہ اس نے ہمارے لیے سلطانی عساکر میں تجارت کا راستہ کھول دیا ہے۔ جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیے۔"

بوڑھے نے خرم زاد کا ہاتھ اپنے منہ سے زبردستی ہٹا دیا اور بدستور برہمی سے بولا: "خرم زاد! تم نئی نسل کے ہو اس لیے اپنے دشمن سے مفاہمت کر سکتے ہو، مگر میں نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا خون پی جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا ذکریا پر حملہ آور ہو گیا مگر خرم زاد اور دوسرے نوجوانوں نے اس بوڑھے کو پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لے گئے۔ خرم زاد نے خود تو بوڑھے کو چھوڑ دیا اور دوسرے نوجوانوں کو حکم دیا: "انہیں کسی کوٹھری میں بند کر دو کیونکہ یہ بڑے میاں ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں گے۔"

خرم زاد دروازے ہی سے واپس آ گیا اور ذکریا سے معذرت کرنے لگا: "دوست! صفی الدین ان بڑے میاں کا بھائی تھا ظاہر ہے انہیں اس بات کا بڑا صدمہ ہوا ہے۔ جب ہم سب نے تمہاری زیادتی کو فراموش کر دیا ہے تو تمہیں بھی ان بڑے میاں کے پاگل پن کو معاف کر دینا چاہیے۔"

ذکریا عام حالات میں تو شاید اس ناخوشگوار واقعے کا گہرا اثر لیتا لیکن ناہید کے خیال سے وہ مفاہمت کرتا جا رہا تھا۔ اس نے جواب دیا: "خرم زاد! یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تم لوگوں کا صفی الدین سے تعلق ہے۔ میرا یہ فرض ہے کہ میں سلطان کو صورتِ حال سے مطلع کر دوں۔"

خرم زاد نے خوشامد کی: "ذکریا! اس بوڑھے کو نظرانداز کر دو، کیونکہ اگر سلطان کو ہماری بابت معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں تباہ و برباد کر دے گا۔"

ایک عورت نے آگے بڑھ کر ذکریا کو ملامت کی: "اگر تو نے یہی طے کر لیا ہے کہ ہمیں بھی تباہ و برباد کر دے تو جو تیرے جی میں آئے کر۔ ایک طرف تو تجھے ناہید کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ دوسری طرف اس کی قوم کی تباہی کے درپے ہے۔"

خرم زاد نے کہا: "ذکریا! اگر تم ہمیں سلطان سے مراعات نہیں دلانا چاہتے تو کوئی بات نہیں لیکن ہمیں تباہ و برباد تو نہ کرو۔ رحم کرو۔"

ذکریا نے تلخی سے جواب دیا: "خرم زاد! پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہے ورنہ میں نے تو تم سب کے لیے بات کر رکھی ہے۔ اور پھر میں ناہید کی خاطر اپنے ضمیر کے خلاف بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

خرم زاد نے کہا: "تب پھر ناہید ہی کے طفیل ہمیں معاف کر دو۔"

ایک دوسرے تاجر نے مداخلت کی: "خرم زاد! ذکریا سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دو اور ناہید کی ملاقات کرا دو۔ یہ سلطانی عساکر میں تجارتی راہ کھلوا دیں گے۔"

خرم زاد نے پوچھا: "اچھا ذکریا! اب یہ بتاؤ کہ ہمیں سلطان کے پاس کب چلنا ہے؟"

ذکریا نے بھی سوال کر دیا: "اور خرم زاد تم بھی یہ بتاؤ کہ میری ناہید سے ملاقات کب ہو رہی ہے؟"

خرم زاد نے جواب دیا: "سلطانی مراعات حاصل کرنے کے فوراً بعد۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

ذکریا نے کہا: "تب پھر تم میری بات بھی سن لو، میں تمہاری ملاقات سلطان کے ایک وزیر سے کراؤں گا۔ وہ تمہیں سلطان تک پہنچا دے گا لیکن سلطان تک پہنچنے سے پہلے ہی تمہیں ناہید سے ملاقات کرانا ہو گی۔ اگر تم اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے تو میرا وعدہ بھی ادھورا ہی رہ جائے گا۔"

خرم زاد نے اپنی قوم کے بزرگوں کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں کوئی سوال کیا۔ خرم زاد کی جگہ ایک اور تاجر بولا: "ذکریا! یہ بات بڑی بے غیرتی کی ہے کہ ہم لوگ اپنی قوم کی ایک لڑکی ناہید کے عوض تم سے اپنا معاملہ کر رہے ہیں۔ اگر ہماری قوم سلطان کی معتوب نہ ہوتی تو ہم تم سے یوں گفتگو نہ کرتے۔ اب جبکہ ہم نے بے غیرتی کا یہ لبادہ پہن ہی لیا ہے تو تم سے ہم ایک سوال مزید کریں گے۔"

ذکریا نے کہا: "مزید سوال کرو کیا سوال ہے تمہارا؟"

تاجر نے کہا: "اگر ناہید تمہیں پسند ہے تو تم اس سے ملاقات کرنے کے بعد کیا کرو گے؟ یعنی اس سے ملنے کا مقصد کیا ہے؟"

ذکریا نے جواب دیا: "جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ میں ناہید کو پسند کرتا ہوں۔ اگر اجازت مل گئی اور کسی طرف سے مزاحمت نہ ہوئی تو میں ناہید کو دلہن بنا سکتا ہوں۔"

تاجر نے خرم زاد کی طرف دیکھا اور کچھ توقف کے بعد جواب دیا: "اگر یہ بات ہے تو پھر ناہید سے ملاقات کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے ذکریا اور اس کے ساتھیوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ ان کی عورتوں نے ذکریا کے لیے اچھے اچھے لذیذ کھانے پکائے اور ان کے مردوں نے ذکریا اور اس کے ساتھیوں کو وہ عزت بخشی جو کوئی محکوم کسی حاکم کو بخش سکتا ہے۔

ذکریا نے دوسرے دن سہ پہر کو خرم زاد اور اس کے دو ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور استاد ارسلان کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس کے ذہن و خیال میں ناہید کے سوا کچھ بھی نہ تھا جب وہ یہ سوچتا کہ گمشدہ ناہید اس کو اتنی آسانی سے مل جا رہی ہے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

استاد ارسلان نے انہیں وہ عزت نہیں بخشی، جس کی توقع لے کر خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھی وہاں پہنچے تھے۔ استاد ارسلان نے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ایک خیمے میں بٹھا دیا اور کہہ دیا جب تک انہیں بلایا نہ جائے وہ اس خیمے سے باہر نہ نکلیں۔ اس کے بعد وہ ذکریا کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ ذکریا کے ساتھی دوسرے خیموں میں پہنچا دیے گئے۔

استاد ارسلان نے ذکریا سے کہا: "ہاں ذکریا! اب تو ان لوگوں کی بابت تفصیل سے بتا۔ اس کے بعد کوئی اور بات ہو گی۔ کیونکہ مجھے اس میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔"

ذکریا نے جواب دیا: "استادِ محترم! جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ صفی الدین کی قوم کے لوگ ہیں ناہید انہی کے پاس رہ رہی ہے۔ یہ لوگ صفی الدین اور اپنی قوم کی غداری اور دغابازی پر شرمندہ ہیں اور کہتے ہیں کہ تباہ و برباد ہو جانے والوں میں یہ لوگ شامل نہیں تھے کیونکہ یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں اور یہ لوگ اس وقت بھی اپنی قوم سے الگ تھلگ تھے اور اب بھی الگ تھلگ ہیں۔"

استاد ارسلان نے کہا: "تو تیری کیا رائے ہے؟ سلطان سے

ان کی سفارش کردی جاتی ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "اگر یہ کام ہوگیا تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

استاد ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "زکریا! کیا تو جانتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اگر انسان کو کسی جال میں قید کرنا ہو تو اس کے لیے کون سا چارہ کارآمد ثابت ہوگا؟"

زکریا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا استاد محترم!"

استاد نے جواب دیا۔ "عورت کو، عورت مرد کے لیے ایک بہترین چارہ ہے۔ میں خوفزدہ ہوں کہ کہیں یہ تاجر لوگ ناہید کو تیرے خلاف چارے کی طرح تو نہیں استعمال کررہے ہیں؟"

زکریا نے کہا۔ "استاد محترم! شاید ایسی کوئی بات نہیں، اتنی بڑی بربادی کے بعد وہ لوگ اپنی بربادی کا نیا انتظام نہیں کریں گے۔"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "تب پھر تو انہیں بتادے کہ ان کی بات سلطان سے تفصیل سے ہوگئی ہے اور سلطان نے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ اگر یہ تاجر لوگ اس کو یہ یقین دلادیں گے کہ ان کی نیت صاف ہے اور وہ اس سلسلے میں کوئی اور ہی منصوبہ نہیں رکھتے تو سلطان ان سے باتیں کرکے مطمئن ہوجانے کے بعد انہیں سلطانی عساکر میں تجارتی مراعات مزید دے گا لیکن پہلے سلطان ان سے باتیں کرے گا۔ سلطان ان سے چھپ کر ملے گا اور اس ملاقات کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

زکریا نے کہا۔ "میں انہیں یہ ساری تفصیلات بتاکر راز داری کا عہد لے لوں گا۔ جہاں تک میں نے انہیں سمجھا ہے میں ان کی بابت یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ قابل اعتبار لوگ ہیں۔"

زکریا سے باتیں کرنے کے بعد استاد ارسلان خرم زاد کے پاس چلا گیا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔

شام کو سلطان کا فرمان پہنچا کہ دوسرے دن عساکر سلطانی کوچ کریں گے اس لیے سفر کی تیاریاں اسی وقت سے شروع ہو جانا چاہئیں۔

استاد ارسلان نے اسی رات خرم زاد کی سلطان سے ملاقات کا اہتمام کردیا۔ وہ زکریا سے بار بار یہی کہتا تھا کہ سلطان اس بات سے خوش نہیں ہے کہ غداروں اور دغابازوں کے پس ماندگان کو رعایتیں دی جائیں لیکن زکریا کی سفارش پر یہ رعایتیں مزید دی جائیں گی۔

استاد ارسلان کے خیمے سے دور ایک وسیع و عریض خیمے میں سلطان اور خرم زاد کی ملاقات کا انتظام کردیا گیا۔ استاد ارسلان زکریا سے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ "زکریا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اب تک ہم نے جو اعتماد حاصل کیا ہے وہ ذرا سی بھول چوک میں ضائع ہو جائے۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "استاد محترم! آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی اور بہت سرخرو رہیں گے۔"

استاد ارسلان، زکریا اور چند محافظوں کو لے کر اس خیمے کے در پر جا کھڑا ہوا جہاں سلطان اور خرم زاد کی ملاقات متوقع تھی۔ اندر خیمے میں کیا تھا، کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ یہیں استاد ارسلان نے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو طلب کرلیا۔ اس نے ان تینوں سے کہا۔ "صاحبان! میں تمہیں نہیں جانتا لیکن میں نے زکریا کی خواہش پر سلطان سے ملاقات کا اہتمام کیا ہے۔ کچھ دیر بعد تم سلطان کے روبرو کھڑے ہوگے۔"

خرم زاد نے استاد ارسلان اور زکریا کا شکریہ ادا کیا۔ استاد ارسلان نے خرم زاد کے کان میں کہا۔ "خرم زاد! اندر سلطان تنہا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کی یہاں موجودگی کا علم کسی اور کو ہو۔ وہ تم لوگوں سے باتیں کرکے فوراً ہی واپس چلا جائے گا۔ سلطان کی خواہش ہے کہ اس کی موجودگی کا علم چند اشخاص کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

خرم زاد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطان نے جو کچھ کہا ہے اس کی پابندی کی جائے گی۔"

سلطانی خیمے کے در پر محافظوں اور پہرے داروں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس سے ملحق خیمے میں استاد ارسلان اور زکریا بیٹھ گئے۔ استاد ارسلان نے خرم زاد کو حکم دیا کہ "اندر جا کر سلطان سے مل لے۔"

خرم زاد فوراً ہی اندر چلا گیا۔ اس کے دونوں ساتھی خیمے کے در سے ذرا فاصلے ہی پر کھڑے رہے کیونکہ انہیں خرم زاد کے ساتھ اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ استاد ارسلان نے انہیں باتوں میں لگالیا اور خود ان کی حرکات و سکنات سے معلوم نہیں کیا اندازہ کرنے لگا۔

زکریا کا دل دھک دھک کررہا تھا۔ وہ سلطان کی وحشت مزاجی سے خائف تھا۔ اس نے سوچا اگر خرم زاد نے سلطان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو معاملہ الٹ جائے گا اور سلطان سے کسی قسم کی مراعات حاصل کرنے کے بجائے جو کچھ حاصل ہے اسے بھی گنوا دیا جائے گا۔

استاد ارسلان نے زکریا سے کہا۔ "زکریا! خدا کا شکر ادا کر کہ تیری مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ اگر میری جگہ یہاں کوئی اور ہوتا تو یہ ملاقات نہ ہوسکتی۔ اب دعا مانگ کہ سلطان اور خرم زاد کی بات چیت بخیر و خوبی انجام کو پہنچے۔"

زکریا نے کہا۔ "استاد محترم! میری ناقص رائے میں آپ کو بھی رہبر موجود ہونا چاہیے تھا، ورنہ یہ بات میری سمجھ میں کبھی بھی نہیں آئے گی کہ خرم زاد تنہا سلطان سے بحسن و خوبی بات چیت کرسکے۔"

استاد ارسلان نے کہا۔ "میں نے سلطان سے یہ خواہش کی تھی کہ دوران گفتگو مجھ کو بھی پاس ہی بٹھا لیا جائے مگر سلطان نے میری یہ بات نہیں مانی۔"

زکریا نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ خرم زاد اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا؟"

استاد ارسلان نے چونکا دینے والا جواب دیا۔ "زکریا! تو کیسی بات کررہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خرم زاد قیامت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر مجھ کو اس کی کامیابی کا شبہ تک ہوتا تو میں اس ملاقات کا اہتمام تک نہ کرتا۔"

زکریا نے دل برداشتہ ہوکر پوچھا۔ "استاد محترم! آپ کیا فرمارہے ہیں؟"

استاد نے جواب دیا۔ "اگر تو میری بات سمجھنا ہی چاہتا ہے تو سن لے۔ تو نے اب تک جتنے بھی کام کیے ہیں ان سے تو نے سلطان اور میرا زبردست اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ سلطان غائبانہ تیری مثالیں دیا کرتا تھا۔ میں تجھ پر فخر کیا کرتا ہوں لیکن تو نے ناہید کے عشق میں جو غلط قدم اٹھایا تھا وہ تیرے سارے کاموں پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی تھا۔ تو خوش قسمت ہے کہ تیری غلطی اور غفلت کا علم میرے سوا کسی کو بھی نہیں۔"

زکریا استاد ارسلان کی باتیں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ پوچھا۔ "استاد محترم! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "سلطان کی اقبال مندی میں کوئی شبہ نہیں۔ اس پر سات دیوں کا سایہ ہے ورنہ اس بار سلطان کے خلاف جو سازش ہوئی تھی، اس سے اسمٰعیل صفوی کو بڑا فائدہ پہنچتا اور سلطان اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہتا۔"

زکریا گم صم استاد ارسلان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ استاد ارسلان نے مزید کہا۔ "مجھے کسی کا انتظار ہے اس کے بعد ہر بات تیری سمجھ میں بھی آجائے گی۔"

اس کے بعد استاد ارسلان اٹھا اور خرم زاد کے دونوں ساتھیوں کی بابت اپنے محافظوں کو حکم دیا کہ "انہیں قید کردیا جائے اور سلطانی حکم کا انتظار کیا جائے۔"

محافظوں نے حکم پاتے ہی دونوں کو بے بس کرکے باندھ دیا اور کسی دوسرے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ زکریا نے احتجاج کیا۔ "استاد محترم! یہ سب کیا ہورہا ہے؟ ہم نے انہیں تحفظ کا یقین دلا رکھا ہے۔"

استاد ارسلان نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ "اندر خرم زاد کے پاس جاؤ اور دیکھ کر بتاؤ کہ وہ کیا کررہا ہے؟"

وہ محافظ خیمے کے اندر چلے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آکر استاد ارسلان کو مطلع کیا۔ "مقتول کو کامیابی نے عمل صادر ہوچکا ہے لہٰذا اندر آپ کو یاد فرمایا جارہا ہے۔"

استاد ارسلان نے زکریا سے کہا۔ "میرے ساتھ تو بھی اندر چل کر وہ تماشہ دیکھ لے جو میں خاص کر تجھے ہی دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسے تماشے زندگی میں بار بار دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔"

زکریا استاد ارسلان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ ایک ترک سردار کرسی پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کئی آدمی اکڑے ہوئے کھڑے تھے اور یہ سب تنومند اور بڑے جاندار تھے۔ ان کے پاس ہی خرم زاد کو بندھا بیٹھا تھا۔ زکریا چیخ اٹھا۔ "استاد ارسلان! یہ میرے معزز مہمان کے ساتھ کیسا سلوک ہورہا ہے؟ سلطان کہاں ہے اور یہ کہ خرم زاد کو کس جرم میں اس طرح باندھ کر بٹھایا گیا ہے؟"

استاد ارسلان نے تالی بجا کر حکم دیا۔ "ذکی وحیدی کو پیش کیا جائے۔"

اسی لمحے ایک محافظ نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو استاد ارسلان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ زکریا نے اسے بغور دیکھا تو یاد آیا کہ اس شخص کو وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ زکریا کو اپنے حافظے پر زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ اس شخص کو اس نے خرم زاد کے تاجروں میں دیکھا تھا۔ استاد ارسلان نے زکریا سے پوچھا۔ "کیا اس شخص کو تو پہچانتا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے اس شخص کو خرم زاد ہی کے خاندان میں دیکھا ہے۔"

استاد ارسلان نے ذکی وحیدی کو حکم دیا۔ "ہاں تو ذکی وحیدی! خرم زاد اور اس کے منصوبے سے متعلق ساری باتیں ایک بار پھر دہرا دے۔"

ذکی وحیدی نے عرض کیا۔ "جناب والا! جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ خرم زاد اور اس کے ساتھیوں نے سلطان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے تو میں بہت پریشان ہوگیا۔ اس طرح یہ لوگ صفی الدین

اور اپنی قوم کی بربادی کا انتقام لینا چاہتے تھے انہوں نے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے بہانے سلطان تک رسائی حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خرم زاد یا اس کا کوئی بھی ساتھی جیسے ہی سلطان کے قریب پہنچتا کسی دھار والے آلے سے پے در پے وار کر کے اس کا کام تمام کر دیتا۔ ان کی اس سازش میں ان کا پورا خاندان شامل تھا ایک میں اس لیے ان کی اس سازش میں شامل نہیں ہوا تھا کہ میں اپنی قوم کو گمراہی کی فضا سے نکال کر امن و عافیت کی آغوش میں ڈال دینا چاہتا تھا۔"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "زکریا! خرم زاد اور اس کے ساتھی سلطان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا ہی چکے تھے کہ ان ہی کے ایک شخص نے اس نامعقول اور گھناؤنی سازش کا پردہ چاک کر دیا۔"

زکریا کو اب بھی استاد ارسلان اور ذکی وحیدی کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

استاد ارسلان نے ایک بار پھر بہ آواز بلند کہا۔ "جو کچھ ہوا اس پر ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

زکریا کا سر چکرانے لگا۔ بولا۔ "خرم زاد! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

خرم زاد نے اکڑ کر ذکی وحیدی کی طرف دیکھا اور غصے میں کہا۔ "غداروں نے ہمیشہ اپنوں کو نقصان پہنچایا ہے لیکن یاد رکھ، میری قوم کے لوگ تجھ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" پھر زکریا سے کہا۔ "اور تو بھی یاد رکھ کہ ہماری فہرست میں تیرا نام بھی موجود ہے تو اپنے کیے کی سزا پا کر رہے گا۔"

زکریا کا سر گھومنے لگا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ سب کیا، کیوں اور کس طرح ہو گیا زکریا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے استاد ارسلان کا شانہ پکڑ لیا۔ اس کو چکر آ رہا تھا۔ اگر شانہ نہ پکڑتا تو گر جاتا۔

استاد ارسلان نے محافظوں کو حکم دیا۔ "خرم زاد کو جلد از جلد سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا اس لیے اس کی سختی سے نگرانی اور حفاظت کی جائے۔"

استاد ارسلان یہ حکم دے کر باہر آ گیا۔ زکریا نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔ "استاد ارسلان! اس کی قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟"

استاد نے جواب دیا۔ "اس کی قوم کو بربادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

ذکی وحیدی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے زکریا سے بطور خاص کہا۔ "نوجوان! میں حیران ہوں کہ ان دنوں تیری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا میری قوم کے لوگ اپنی بیٹی ناہید تیرے حوالے اتنی آسانی سے کر دیں گے۔"

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بار ذکی وحیدی استاد ارسلان سے مخاطب ہوا۔ "میں نے سلطان کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے بدلے میں اپنی قوم کی جاں بخشی کا طالب ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اس کے صلے میں اپنی قوم کا تحفظ چاہتا ہوں۔"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "تیری یہ درخواست سلطان کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔"

سلطان نے کوچ کا حکم دے دیا تھا مگر جب اس کے سامنے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کا مقدمہ پیش ہوا تو سلطان سناٹے میں آ گیا۔ اس نے زکریا سے پوچھا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ ان احمقوں نے اتنا بڑا ارادہ کس طرح کر لیا؟"

استاد ارسلان نے دبی آواز میں کہا۔ "سلطانِ معظم! ذکی وحیدی اور زکریا ہماری عزت اور احترام کے بہت زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہی کی کوششوں سے اتنا بڑا کام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اگر ہمیں ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس وقت معلوم نہیں کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔"

سلطان نے ذکی وحیدی اور زکریا کو بڑے غور سے دیکھا اور شوخی سے کہا۔ "اور زکریا یہاں بھی موجود ہے؟ اس نے یہاں بھی یہ سلسلہ لگا لیا۔ بہر حال میں اس سے بہت خوش ہوں۔" اس کے بعد ذکی وحیدی سے کہا۔ "تیرا کیا نام ہے؟ مجھ بتایا تو تھا۔ جا میں نے تیری قوم کی جاں بخشی کی اور ان سے کہہ دے کہ وہ تمدن اور بے ضرر انداز میں اپنا اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔"

سلطان کے روبرو خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔ سلطان انہیں بغور دیکھتا رہا آخر کچھ دیر بعد پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟ شاید خرم زاد؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "ہاں میرا نام خرم زاد ہے۔ اپنی قوم کا ایک غیرت مند جوان!"

سلطان نے کہا۔ "تیری غیرت مندی تو یہیں سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ تیری قوم کے ذلیل ضعیف لوگ اپنے ساتھ اپنی قوم کو غداری کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ دغا باز اور فریبی تھے۔"

استاد ارسلان نے خرم زاد کو ڈانٹا۔ "خرم زاد! یہاں زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تجھ سے جو کچھ پوچھا جائے تو بس اس کے جواب کی حد تک رہ۔"

سلطان نے پوچھا۔ "اگر تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو کیا کرتا؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "میں سلطان کو قتل بھی کر سکتا تھا اور اگر اس میں ناکام رہتا تو سلطان کی فوج کے راز حاصل کر کے ایران چلا جاتا کیونکہ جو کام میں خود نہیں کر سکتا تھا اس کو شاہ ایران سے کرا لیتا۔"

سلطان نے طنزاً پوچھا۔ "اور آج کل تو کیا کر رہا ہے؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "اپنی قوم کے لیے جاسوسی۔"

سلطان نے پھر پوچھا۔ "تیرا اپنے انجام کی بابت کیا خیال ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "شاید مجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

سلطان نے کہا۔ "اگر میں تجھ کو قتل کر دوں تو اس سے مجھے فائدہ کیا پہنچے گا؟"

زکریا چند قدم آگے بڑھا اور سلطان سے درخواست کی۔ "سلطانِ معظم! اگر فیصلہ ان کی گردن زدنی کا ہو تو جلاد کی خدمت مجھ سے لی جائے کیونکہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو مجھ سے پہلے میں مارنا گا کوئی دوسرا نہیں مار سکتا۔"

خرم زاد نے قہر کی نظروں سے زکریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "زکریا! اپنے حوصلے نکال لے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن میں نے بھی تیرا وہ انتظام کر دیا ہے کہ جب تک تو زندہ ہے اس کو یاد رکھے گا اور کڑھتا جلتا رہے گا!"

زکریا نے اس کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہا۔

سلطان نے پوچھا۔ "ہاں تو خرم زاد تو زکریا کو کیا سزا دے سکتا؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو؟ یاد رکھ اگر تو نے میرے اپنے کسی آدمی کو دکھ دیا تو اس نوع کا اس سے زیادہ دکھ خود تجھے جھیلنا پڑے گا۔"

خرم زاد نے کہا۔ "سلطانِ معظم! میں خرم زاد کچھ عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ زکریا کو کوئی ایسی سزا دی جائے جس کے اثرات یہ ہمیشہ محسوس کرتا رہے۔ چنانچہ میری قوم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی ناہید سے ملاقات تو ضرور کرا دی جائے مگر اس کو پاس نہ جانے دیا جائے۔"

زکریا نے سلطان کی موجودگی سے مرعوب لب و لہجے میں کہا۔ "سلطانِ معظم! میں زندگی کے آخری سانس تک مقدور بھر خدمت گزار رہوں گا۔ میں نے آپ کی بات گرہ سے باندھ لی ہے۔ ناہید میری زندگی کا مقصد نہیں ہے میری زندگی کا مقصد سلطانِ معظم کی خدمت ہے۔ یہ خرم زاد مجھ کو ذلیل نہیں کر سکتا۔"

سلطان نے استاد ارسلان کو حکم دیا کہ خرم زاد کو کھول دیا جائے!

استاد ارسلان کو شبہ گزرا کہ شاید غلطی سے یہ حکم دیا گیا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "سلطانِ معظم! مکرر ارشاد فرمائیے۔" سلطان نے پھر حکم دیا۔ "خرم زاد کو کھول دیا جائے۔"

استاد ارسلان نے اپنے ہاتھ سے خرم زاد کو کھول دیا۔

سلطان نے کہا۔ "میں خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اس لیے قتل نہیں کروں گا کہ اس سے میں حاصل کیا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ خرم زاد اور اس کے ساتھی شاہ ایران کے پاس میرا ایک خط لے جائیں۔ میں ان سے اپنا ایک ضروری کام لینا چاہتا ہوں۔"

استاد ارسلان اور زکریا کو سلطان کے فیصلے سے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ مطابق ہی خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو قتل کر دینے کے مستحق تھے۔ سلطان نے ان کی جذباتی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ اس نے استاد ارسلان سے کہا۔ "ارسلان! یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگ میرے ہر فیصلے سے اتفاق ہی کریں لیکن میں لوگوں کی مرضی یا خیال کا تابع تو نہیں ہوں۔ میں وہی کرتا ہوں جو مجھے بہتر نظر آتا ہے۔ میں خرم زاد اور اس کے ساتھیوں کو اپنا قاصد بنا کر شاہ ایران کے پاس بھیج رہا ہوں۔ شاہ ایران میرا خط پڑھ کر عالم غیظ و غضب میں ان تینوں کو قتل کرا سکتا ہے۔ اگر ان تینوں کی موت ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور پھر میں کیوں ماروں اور اگر یہ نہ مارے گئے اور شاہ ایران کا جواب لے کر واپس آ گئے تو دیکھا جائے گا۔" پھر زکریا سے کہا۔ "ہاں زکریا! تو ناہید کہاں ہے؟ تجھ پتہ ہے مجھ کو؟ اگر وہ یہیں کہیں ہے تو اس کو قابو میں لے لیا جائے اور اگر وہ یہاں کہیں نہیں ہے تو پھر وہ کہاں ہے؟ اس کو تلاش کیا جائے۔"

زکریا کو بڑی امید بندھی۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سلطانِ معظم! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ناہید ان تاجر گھرانوں ہی میں کسی کے

پاس رہ رہا ہے۔ اگر سلطان معظم چاہیں تو اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"
سلطان ایک دم مشتعل ہو گیا۔ دانت پیستا ہوا بولا۔ "زکریا! تو میرے سامنے کھڑا ہے۔ فضول باتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ ناہید تلاش کر کے تیرے حوالے کر دی جائے گی تو تجھے زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے۔" پھر ایک دم استاد ارسلان سے مخاطب ہو گیا۔ "ارسلان! اس نوجوان کو سمجھا دے کہ کسی فرماں روا سے یوں بات نہیں کی جاتی۔"

استاد ارسلان نے زکریا کو آہستہ سے سمجھایا۔ "زکریا! صبر سے کام لے۔ وقت کا انتظار کر۔ سلطان کی برہمی سے خوفزدہ رہ۔"

سلطان نے اسی وقت استاد ارسلان کو حکم دیا کہ کاغذ اور قلم دوات لائی جائے تاکہ وہ شاہ ایران کو خط لکھوا سکے۔

جب قلم دوات اور کاغذ استاد ارسلان کو مہیا کر دیئے گئے تو سلطان نے شاہ ایران کے نام ٹہل ٹہل کر ایک خط لکھوا دیا۔ استاد ارسلان نے سلطان کی طرف سے لکھا۔

"میں سلطنت عثمانیہ کا سلطان، بہادروں کا سردار، بت پرستوں اور حق کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے والا سلیم خان بن سلطان بایزید خان بن سلطان محمد خان (فاتح قسطنطنیہ) بن سلطان مراد خان تجھ سے، یعنی لشکر ایران کے سردار اسمٰعیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ تو اپنے دل و دماغ سے حرص و ہوا کو نکال دے۔ تو نے میرے بھتیجوں کو قید کر رکھا ہے۔ انہیں میرے حوالے کر دے۔ اگر تو نے میرے حکم پر عمل نہ کیا تو پھر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ تیرے سر سے شاہی تاج کو اتار کر پھینک دوں اور اس کی جگہ زرہ بکتر پہن لوں۔ اپنے اس جھنڈے کو جو کبھی بھی سرنگوں نہیں ہوا میدان جنگ میں تیرے سر پر نصب کر دوں۔ میں انتقام لینے والی تلوار کو غیظ و غضب کی میان سے نکال کر اپنے ناقابل شکست سپاہیوں کے ساتھ تجھ پر حملہ آور ہو جاؤں۔ میرے ان سپاہیوں کی تلواریں کاری زخم لگاتی ہیں۔ ان کے تیر دشمنوں کے سینوں سے پار ہو جاتے ہیں۔ میں شہزادہ مراد اور اس کے دوسرے بھائیوں کو تیری قید سے رہائی دلانے آ گیا ہوں۔ اگر تو نے اپنی بہادری اور قوت کے نشے میں شیوۂ ظلم اور ناانصافی کو ترک نہ کیا تو تو جلد ہی اپنی آنکھوں سے یہ عبرتناک منظر دیکھ لے گا کہ تمام میدان ہمارے خیموں سے پٹ جائیں گے اور ہم اپنی شجاعت کے عجیب و غریب تماشے دکھاتے پھریں گے۔"

یہ خط سلطان نے خرم زاد کے حوالے کر دیا اور اس کے دونوں ساتھی بھی ساتھ کر دیئے گئے۔ سلطان نے انہیں گھوڑے بھی دیئے اور انہیں حکم دیا کہ "وہ اسی وقت شاہ ایران کے پاس روانہ ہو جائیں۔"

جب یہ تینوں سلطان کے پاس سے روانہ ہو رہے تھے تو سلطان نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا اور کہا۔ "اگر اسمٰعیل میرے خط کے جواب میں میرے بھتیجے مراد کو میرے پاس بھیجنا چاہے تو پھر اس کا یہ فرض ہو گا کہ شہزادہ مراد کو باندھ کر میرے آدمی کے حوالے کر دے۔"

جب یہ چلے گئے تو سلطان نے استاد ارسلان کے ماتحت ایک دستہ تاجروں کی بستی میں روانہ کر دیا۔ اس میں زکریا کو بھی شامل کر دیا گیا۔ سلطان نے استاد ارسلان سے کہا۔ "خرم زاد کی قوم اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ تو تاجروں کی پوری بستی کو حراست میں لے لے اور ان سب کو میرے پاس لے آ۔" پھر زکریا سے کہا۔ "اور زکریا تیرا کام یہ ہے کہ تو ان میں ناہید کو پہچان کر الگ کر لے۔ اور اس کو بطور خاص میرے پاس لے آ۔ میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ واقعی اتنی ہی حسین ہے یا محض تیرا حسن نظر ہے۔ فریب نظر۔ کیونکہ نوجوانی میں نوجوانوں کا انتخاب کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔"

استاد ارسلان نے کئی سو آدمیوں کو ساتھ لیا اور تاجروں کی بستی کی طرف چل پڑا۔ زکریا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ زکریا نے استاد ارسلان سے کہا۔ "استاد محترم۔"
استاد ارسلان نے پوچھا۔ "کیا بات ہے زکریا؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "ہم نے تاجروں سے وعدہ کر لیا تھا کہ انہیں ہمارا تحفظ حاصل ہے۔"
استاد ارسلان نے کہا۔ "تب پھر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ ذرا صاف صاف کہہ۔"
زکریا نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سے نرمی سے پیش آئیں۔"
استاد ارسلان نے کہا۔ "زکریا! اس معاملے میں تو خاموش رہ کیونکہ سلطان کا جو حکم ہے میں اس پر پوری دیانت داری سے عمل کروں گا۔"
زکریا نے کہا۔ "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ اس پر دیانت داری سے عمل نہ کریں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان سب کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر سلطان کے حوالے کر دیں۔ ان میں اگر ناہید موجود ہو تو اس کو ـــ"
زکریا معلوم نہیں کیا کہنا چاہتا تھا جو کہہ نہیں سکا۔ وہ اس وقت زبردست جذباتی دباؤ میں تھا۔

استاد ارسلان نے تاجروں کی بستی کو محاصرے میں لے لیا اور ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر انہیں سلطان کا فرمان سنا دیا۔ جس میں انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ "وہ پرامن، مزاحمت کے بغیر سب کے سب سلطان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔"

ان لوگوں نے استاد ارسلان کے پاس ہی زکریا کو کھڑے دیکھا۔ ان میں وہ بوڑھا بھی موجود تھا جو خود کو صفی الدین کا بھائی کہتا تھا اور زکریا پر بری طرح برس چکا تھا۔ اس نے ہجوم سے نکل کر ایک بار پھر زکریا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ "بخدا تم لوگ مومن نہیں ہو کیونکہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔ میں اس ذلیل نوجوان کی بابت پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ فریبی، دھوکے باز اور غدار ہے۔ تم لوگوں نے اس پر ایک بار پھر بھروسا کر لیا تھا۔"
استاد ارسلان نے بڑے میاں کو نرمی سے سمجھایا۔ "محترم بزرگ! آپ کو ہمارے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضری دینا ہے اس لیے اب ان فضول باتوں سے آپ کو حاصل کچھ بھی نہ ہو گا۔"
بڑے میاں نے پوچھا۔ "اچھا وہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟"
استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "انہوں نے سلطان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے وہ سلطان کا ایک خط لے کر ایران گیا ہوا ہے۔ شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کے پاس۔"
کوئی اور شخص آگے بڑھا اور ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔ "اچھا جناب اگر ہم لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کر دیں تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟"
استاد ارسلان نے جواب دیا۔ "آپ لوگ جائیں گے تو خیر وہیں لیکن پتہ نہیں سلطان آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔"
زکریا نے استاد ارسلان کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "استاد محترم! ناہید بیٹا بھی!"
استاد ارسلان نے اعلان کیا۔ "تاجر صاحبان! ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے صفی الدین کی بیٹی ناہید کو الگ کر لیں۔ سلطان اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہے۔"
بڈھے نے چیخ کر کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو ہم سب کو قتل کرنے کے بعد ہی ہماری عورتوں میں جا سکتا ہے۔" پھر اپنی تاجر برادری سے کہا۔ "اے میری تاجر قوم کے جوانو! تمہاری غیرت کہاں چلی گئی؟ کیا اب یہ ترک تمہاری عورتوں اور لڑکیوں کے چہروں سے چادریں ہٹا ہٹا کر ناہید کو تلاش کریں گے؟ شرم شرم شرم۔"
بڈھے کے اکسانے پر چند نوجوان آگے بڑھے اور استاد ارسلان کا راستہ روکنا چاہا لیکن استاد ارسلان کے آدمیوں نے انہیں خوفزدہ کر کے پیچھے ہٹا دیا۔
استاد ارسلان نے ان سب کو وہاں سے نکال کر سلطانی عساکر میں پہنچا دیا۔ لیکن ان میں ناہید کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔ ان کے دہقان کے بیٹے بے عزتی کی دہشت سے پھٹے جا رہے تھے۔ سلطان نے اس دن ان پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ اب اس کے دل و دماغ پر بس شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کا خیال تھا۔ وہ شاہ ایران کو ہزیمت دینے کے لیے بہت بے چین تھا۔

دوسرے دن سلطان نے زکریا سے پوچھا۔ "کیا ان میں ناہید موجود ہے؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "سلطان معظم! مجھ کو نہیں معلوم۔"
سلطان نے بگڑ کر کہا۔ "کیا مطلب؟ کیا میں نے تجھ کو ارسلان کے ساتھ نہیں بھیجا تھا؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "بھیجا تھا لیکن استاد ارسلان نے مجھے خواتین کے چہرے نہیں دیکھنے دیئے۔ وہ کہنے لگے کہ سلطان نے بھی ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔"
سلطان نے کہا۔ "ارسلان بہت اچھا انسان ہے۔ شاید میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا۔" پھر اسی وقت قاصد بھیج کر استاد ارسلان کو طلب کر لیا۔ جب وہ آ گیا تو سلطان نے کہا۔ "ارسلان! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"
استاد ارسلان نے کہا۔ "یہ ناچیز حضور کا مطلب نہیں سمجھا۔"

سلطان نے جواب دیا: "کیا میں نے زکریا کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ خواتین میں گھس کر ناہید کو نکال لائے۔ اس حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟"

استاد ارسلان نے عرض کیا: "سلطان معظم نے اگر کوئی ایسا حکم دیا تھا تو میں اس کے سننے کا گناہ گار ہوں کیونکہ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کوئی ایسا حکم سنا ہو۔"

سلطان نے کہا: "اچھا اب تو تاجروں کی خواتین میں یہ اعلان کر دے کہ اگر ان میں صفی الدین کی بیٹی ناہید موجود ہے تو اس کو سلطان کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر وہ یہ کام بخوشی نہیں کریں گے تو ان میں زکریا کو داخل کر دیا جائے گا اور زکریا ناہید کو زبردستی نکال لائے گا۔"

استاد ارسلان نے عرض کیا: "سلطان معظم کے حکم کی اسی وقت تعمیل ہوگی۔"

لیکن ان میں ناہید نہیں تھی۔ تاجروں نے صاف صاف بتا دیا کہ ناہید کو تبریز بھیجا جا چکا ہے۔ زکریا کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ تاجر خواتین سلطان سے جھوٹ بول رہی ہیں۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ اس کو خواتین میں داخل ہو کر ناہید کو تلاش کرنے کی اجازت دی جائے۔

لیکن سلطان نے یہ اجازت نہیں دی۔

چند دنوں بعد سلطان نے عساکر میں یہ اعلان کر دیا کہ ایران کی طرف سفر شروع کر دیا جائے۔

اس نے چند ہراول دستے آگے روانہ کر دیئے تاکہ وہ شاہ ایران کی نقل و حرکت پر نظریں رکھ سکیں۔ سنان پاشا کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور خود قیصریہ سے سیواس روانہ ہو گیا۔ اس نے تاجروں کو سیواس میں رہا کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں مگر سلطان کی نظروں سے دفع ہو جائیں۔ وہ سب اس طرح رفوچکر ہوئے کہ پھر پتہ نہ چلا کہاں چلے گئے۔ زکریا کو ان کے چلے جانے کا بڑا ملال رہا کیونکہ اس کو آخر وقت تک یہی یقین رہا کہ ان میں ناہید موجود ہے۔ وہ وقتی طور پر پریشان ہو گیا مگر وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ سلطان نے اگر اس کی پریشانی محسوس کر لی تو وہ سخت ناراض ہوگا۔

سلطان اپنی افواج کو دیلنے فرات کے دوسری طرف لے گیا اور آگے بڑھ کر دریائے دجلہ کے مغربی ساحل پر دیار بکر کے میدانوں میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اب اس کے سامنے ایران کا آذربائیجان تھا جبکہ تبریز میں شاہ ایران خاموش بیٹھا سلطان کو پریشان کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ جب خرم زاد اپنے دونوں ساتھیوں اور سلطان کے ایک نمائندے کے ساتھ اسمٰعیل صفوی کے دربار میں پیش کیا گیا۔ تو خرم زاد کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسمٰعیل صفوی کے چہرے پر موجود طمانیت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ترکی کے سلطان سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں۔

خرم زاد نے سلطان کا خط اسمٰعیل صفوی کے حوالے کر دیا اور زبانی عرض کیا: "صفوی شاہ! شاہ کی وفاداری نے مجھے اور میرے خاندان کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔" اس کے بعد اس نے صفی الدین کی تباہی و بربادی کی پوری داستان سنا دی اور آخر میں بولا: "صفوی شاہ! بخدا میں بمشکل یہاں تک آیا ہوں۔ ورنہ مجھے ہر ہر قدم پر ایسا لگتا تھا کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

اسمٰعیل صفوی نے تالی بجائی اور خدام کو حکم دیا کہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔

سلطان کے ایلچی نے پوچھا: "اور جناب والا! میری بابت کیا حکم ہے؟"

شاہ کے برابر ہی سلطان کا بھتیجا مراد بیٹھا تھا۔ شاہ نے سلطان کے ایلچی سے کہا: "تو خوامخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ تیرا آقا تیرے سامنے بیٹھا ہے وہی کوئی حکم دے گا۔" اس کے بعد شہزادہ مراد سے کہا: "شہزادے! یہ تمہارا آدمی ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو شاہی مہمان خانے میں روانہ کر دیا ہے۔ تم اپنے آدمی کو جہاں مناسب سمجھو بھیج دو۔"

شہزادہ مراد اٹھا اور سلطان کے ایلچی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا: "کیا تو نے مجھ کو پہچانا؟"

سلطانی نمائندے نے نفی میں گردن ہلا دی۔ مراد مشتعل ہو گیا اور اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی، بولا: "یعنی تو اپنے سلطان کو نہیں جانتا۔ میں تیرا سلطان ہوں۔ چچا سلیم غاصب ہیں۔ میں جا نہیں ترکی میں داخل ہوتے ہی تاج و تخت سے دستبردار کر دوں گا۔"

سلطانی نمائندے نے حیرت سے کہا: "یعنی آپ سلطان ہیں! آپ؟ آپ کا تاج و تخت کہاں ہے؟"

مراد نے جواب دیا: "میں تاج و تخت سے ہمیشہ کے لیے دور نہیں ہوا۔ سلطانی نمائندے! اس جرم میں کہ تو اپنے حقیقی سلطان کو نہیں پہچانتا۔ میں تجھے جہنم واصل کیے دے رہا ہوں۔"

اچانک مراد نے اپنی تلوار کے پے در پے وار سے شاہی نمائندے کے ٹکڑے کر دیئے۔ شاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ تیسرے دن خرم زاد اور اس کے ساتھیوں کو شاہ نے پھر طلب کر لیا۔ شاہ نے سلطان کے خط کا جواب ایک بند بستے میں رکھ کر خرم زاد کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد خرم زاد کو ایک چوکور ڈبہ تھماتے ہوئے کہا: "خرم زاد! افسوس کہ یہ کام تجھی کو انجام دینا ہوگا۔ خط کے ساتھ ہی یہ ڈبہ بھی سلطان کے حوالے کر دینا۔"

خرم زاد نے ڈبے کو اٹھا کر دیکھا یہ کسی سیرولن کا تھا۔ شاہ نے ایک اپنا آدمی بھی ساتھ کر دیا اور خرم زاد سے کہا: "دیکھو یہ خط اور ڈبہ سلطان کے حوالے کر دینے کے بعد اس سے کہہ دینا کہ اگر اس کا جواب دینا ہے تو یہ میرا آدمی حاضر ہے۔ اس کو دے دینا مجھ کو جواب مل جائے گا۔"

اس کے فوراً بعد ہی شاہ نے ایران کے سرحدی حصوں کے

باغات اور سبزے کو جلا دینے کا حکم دیا تاکہ سلطان اپنے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ کو دانے پانی سے محروم پائے۔

شب و روز سفر کرتا ہوا جب خرم زاد ایرانی حدود سے نکل کر علاقے میں داخل ہوا تو اس نے حدِ نظر تک سلطانی سپاہ کو خیمہ زن جگہ دیکھا۔ سلطان کے سپاہی بڑی مستعدی سے آنے جانے والوں پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خرم زاد اس کے دونوں ساتھی اور شاہ کے ایلچی کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑ کر انہیں پکڑ لیا اور جب خرم زاد نے یہ بتایا کہ "وہ شاہ کا ایک ضروری پیغام لے کر سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہے۔"

انہیں نہایت عزت اور احترام سے سلطان کی خدمت میں پہنچا دیا۔ سلطان خرم زاد کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پوچھا: "تیرا نام میں پھر بھول رہا ہوں، شاید خرم زاد ہے تیرا نام؟"

خرم زاد نے آہستہ سے جواب دیا: "ہاں میرا نام خرم زاد ہے۔"

سلطان نے پوچھا: "اور وہ میرا آدمی یا میرا نمائندہ؟"

خرم زاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نے سختی سے کہا۔

"میں اپنے آدمی کی بابت تجھ سے پوچھ رہا ہوں خرم زاد۔"

خرم زاد نے جواب دیا: "حضور والا! شاہ نے اس کو آپ کے بھتیجے مراد کے حوالے کر دیا تھا اور مراد نے اس کے کئی ٹکڑے کر ڈالے۔"

سلطان سناٹے میں آ گیا پھر پوچھا: "میرے خط کا جواب کہاں ہے وہ؟"

خرم زاد نے خط اور ڈبہ دونوں ہی ایک ساتھ سلطان کے حوالے کر دیئے۔۔۔

اس وقت سلطان کے آس پاس استاد ارسلان، زکریا اور سلطان کے دوسرے امراء موجود تھے۔ سلطان نے شاہ صفوی کا خط استاد ارسلان کے حوالے کر دیا اور اسے حکم دیا کہ "شاہ کا خط باآواز بلند پڑھ کر سنایا جائے۔"

استاد ارسلان نے خط کو کھولا اور اسے زیر لب پڑھنے لگا۔ اس نے چور نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا اور پھر خط پر نظریں جما دیں۔ سلطان نے محسوس کیا کہ ارسلان خط پڑھنے سے کترا رہا ہے۔ سلطان نے تحکمانہ کہا: "میں کیا کہہ رہا ہوں، تو خط پڑھتا کیوں نہیں؟"

استاد ارسلان نے آہستہ سے عرض کیا: "سلطان معظم! افسوس کہ مجھ سے یہ خط نہیں پڑھا جا رہا۔ اس کو اگر آپ خود ہی پڑھ لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

سلطان نے استاد ارسلان سے خط لے کر خود ہی پڑھنا شروع کر دیا اس میں لکھا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس قدر ناخوش کیوں ہیں۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ یہ خط افیون کے نشے میں لکھا گیا ہے۔ اگر آپ جنگ کے لئے آمادہ ہیں تو ابھی میں تیار ہوں۔ خدا کرے کیا منظر ہے اس کا اظہار بھی بہت جلد ہی ہو جائے گا۔ جب ہم دونوں میدان جنگ میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں گے تو یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آجائے گی کہ کون۔۔۔ کتنے پانی میں ہے۔۔۔

افیون کا ایک ڈبہ بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کا نشہ برقرار رہے اور بہکی بہکی باتیں بھی ہوتی رہیں۔"

سلطان خط پڑھ کر بے قابو ہو گیا اور دہاڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

خرم زاد سے پوچھا: "شاہ کا کوئی نمائندہ بھی آیا ہے یا نہیں؟"

خرم زاد نے شاہ کے نمائندے کو سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سلطان نے زکریا کو حکم دیا: "زکریا! شاہ کے ایلچی کو اسی وقت جہنم رسید کر دے۔"

زکریا نے آگے بڑھ کر ایلچی کی گردن پر تلوار سے وار کر دیا۔ ایلچی چیخ مار کر سلطان کے قدموں میں گر گیا۔ اس کی گردن شانے سے لگی رہ گئی تھی اور اس کی گردن سے جاری بہنے والا خون کا فوارہ زکریا اور کئی دوسرے درباریوں کے کپڑوں کو تر کر گیا۔ سلطان نے خرم زاد کو حکم دیا۔۔۔

"خرم زاد! تو اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت نظروں سے دور ہو جا ورنہ میں تجھے بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔"

خرم زاد اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔

سلطان بہت برافروختہ تھا۔ اس نے اسی وقت کوچ کا حکم دیا وہ جلد از جلد تبریز میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ شاہ کو ایسی عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا کہ آئندہ وہ کسی سے اس قسم کی باتیں نہ کر سکے۔

اسی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے زمین کو روندتے ہوئے ایرانی حدود میں داخل ہو گئے۔ سلطان نے ایرانی حدود میں ہر طرف آتش زدگی کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ کھیت، باغات اور ہریالی کو تباہ و برباد کیا جا چکا تھا۔ سبزے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ یہیں سلطان کے ہمراہ دلی

سبز رنگ، دو پرانی سہیلیوں کی ملاقات ہوئی۔ "اے غزالہ کیا بات ہے، آج تم بڑی اداس نظر آ رہی ہو؟" ایک سہیلی نے پوچھا۔

"بات یہ ہے مسز تم!" غزالہ نے بتایا۔ "میں نے اپنے شوہر کو کل رات خواب میں ایک لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پیار بھری باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"اور تم اداس ہو گئیں، پگلی کہیں کی۔" مسز تم نے کہا۔ "خواب کی باتوں کا کیا اعتبار؟"

"یہ تو درست ہے۔" غزالہ نے کہا۔ "مگر قابل غور بات یہ بھی ہے کہ جو شوہر اپنی بیوی کے خوابوں میں آوارگی کر سکتا ہے وہ اپنے خوابوں میں کیا کچھ نہیں کرتا ہوگا۔"

دستے نے پریشانی کے عالم میں ملاقات کی۔ اس دستے کا سردار جہان پاشا نامی ایک شخص تھا۔ جہان پاشا سلطان کا ہم سبق اور بچپن کا ساتھی تھا اور سلطان اس وقت اس کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ وہ اپنے ہراول دستے کے ساتھ ایران میں کافی اندر تک جا چکا تھا جہاں گھوڑوں کے لئے چارے کا کوئی سامان نہ تھا۔ سلطان نے جہان پاشا کو طلب کیا اور پوچھا: "جہان پاشا! جب تو ایرانی حدود میں داخل ہوا تو کیا صفوی کی فوجوں نے تیرا راستہ نہیں روکا؟"

جہان پاشا نے جواب دیا: "سلطانِ معظم! جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے اپنے تینوں طرف آگ کے شعلے دیکھے تھے اور ایرانی فوج کو اس حال میں دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی --- اور آگ کے شعلے بھی اس کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔"

تب سلطان نے سوچتے ہوئے کہا: "تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے گھوڑے اور دیگر مویشی سبزہ نام کی کوئی شے یہاں سے نہیں حاصل کر سکیں گے گویا شاہ صفوی نے براہِ راست متصادم ہوئے بغیر ہمیں شکست دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے خیال میں ہم گھاس دانہ پانے کے بغیر اپنے عساکر اندرونِ ایران دور تک نہیں لے جا سکتے۔"

جہان پاشا نے عرض کیا: "سلطانِ معظم! میں بہت دور تک اندر گیا ہوں وہاں ہر طرف راکھ کا ڈھیر ہے اور فصلوں اور سبزوں کی جگہ سیاہ نشانات کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ باغات اور درختوں کی جگہ ٹنڈ منڈ درختوں نے لے لی ہے۔"

سلطان نے دیار اندر جانے کے بجائے یہیں سرحد پر قیام کیا۔ اور اپنے امرا اور سرداروں سے مشورہ طلب کیا کہ: "صاحبان! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

جہان پاشا نے رائے دی: "سلطانِ معظم! جو کچھ میں آذربائیجان میں دور تک دیکھ آیا ہوں وہ بہت پریشان کن اور حوصلہ شکن ہے کیا ایک لاکھ بیس ہزار نفری لشکر کو کچھ کھلائے پلائے بغیر شاہ صفوی کے آسودہ لشکر سے لڑایا جا سکتا ہے؟ میری ناقص رائے میں ہرگز نہیں۔"

سلطان نے ناگواری سے کہا: "تیری رائے کا بھرم تو یوں ہی کھل چکا ہے کہ تو اپنی رائے کو ناقص کہہ کر خود ہی مسترد کر چکا ہے۔" اس کے بعد استاد ارسلان سے پوچھا: "ارسلان! تو کیا کہتا ہے؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا: "سلطانِ والا! صورتِ حال غیر معمولی ہے اس پر پورے غور و خوض کی ضرورت ہے۔"

سلطان نے حکم دیا: "سنان پاشا کو یہیں بلا لیا جائے۔"

سلطانی ہرکارے سنان پاشا کو لینے چلے گئے سلطان نے اپنے محافظ دستے کو لے کر آذربائیجان کا جائزہ لیا۔ شاہ صفوی نے ہر طرف ہر شے جلا دی ہے جو مویشیوں کی غذا کے کام آ سکتی تھی۔ سلطان بغیر لڑے ہی ہار چکا تھا، کیونکہ اس کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ تباہی کے آثار کہاں تک موجود ہیں۔ سلطان نے فوری طور پر پانچ ہزار سپاہی الگ کر دیئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ ترکی کی حدود میں خچروں اور اونٹوں کی مدد سے مویشیوں کے لئے دانے اور گھاس کا انتظام کریں اور اس کے عساکر کو پہنچاتے رہیں۔

اس حکم پر فوراً ہی عمل شروع ہو گیا اس دوران سنان پاشا بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اپنے امرا اور مدبرین کو ایک وسیع و عریض خیمے میں جمع کیا اور ان کے سامنے شاہ صفوی کی جنگی حکمت عملی رکھ دی، پوچھا۔ "ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

سنان پاشا نے عرض کیا: "مشکلات ہوتی ہی اس لئے ہیں کہ ان پر قابو پایا جائے۔"

استاد ارسلان نے سنان پاشا کی تائید کی مگر یہ بھی کہہ دیا: "اب رہا یہ سوال کہ ان مشکلات پر قابو کس طرح پایا جائے گا؟ اگر شاہ صفوی ہمارے بھوکے اور ناتوں سے نڈھال گھوڑوں والی فوج پر اپنے تندرست اور آسودہ گھوڑوں کی فوج سے حملہ کر دے تو آپ ہی بتایئے ہم اس کا کس طرح مقابلہ کریں گے اور اس مشکل پر کس طرح قابو حاصل کر سکیں گے۔"

جہان پاشا کو امرا اور فوجی سرداروں نے گھیر رکھا تھا وہ جہان پاشا کو سرگوشی میں سمجھا رہے تھے: "جہان پاشا! تو سلطان کا ہم سبق اور بچپن کا ساتھی رہ چکا ہے سلطان تیری عزت بھی کرتا ہے تو سلطان پر دباؤ ڈال کر یہ یقین دلا دے کہ ان حالات میں جنگ کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب تباہ و برباد ہو جائیں، شاہ صفوی جو حقیقی معنی میں اپنی جنگی حکمت عملی سے سلطان کو لڑے بغیر ہی شکست دے چکا ہے جب وہ ہتھیاروں کی جنگ میں فیصلہ کن شکست دے گا تو ہمارا تعاقب کرتا ہوا ترکی حدود میں داخل ہو جائے گا جس سے سلطنتِ عثمانیہ ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

جہان پاشا نے جواب دیا: "مگر یہ یاد رہے کہ سلطان خود سر اور

ضدی ہے، کیا وہ ہماری بات مان لے گا؟"

ایک نے کہا: "ہم سب سلطان کی مخالفت کریں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ جب سلطان پر ہر طرف سے دباؤ پڑے تو وہ ہماری بات نہ مانے۔"

سلطان نے باآوازِ بلند سب کو مخاطب کیا: "تب پھر کیا طے پایا حاضرین؟ سرِدست ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ شاہ ہمیں کہاں ملے گا اور وہ ہم سے کس جگہ مقابلہ کرے گا؟"

کئی سوار اور مدبر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور باری باری اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ آخر میں ہر شخص ایک ہی بات کہتا تھا: "فی الحال واپسی اختیار کی جائے اور مقابلے کو آئندہ سال تک ملتوی کر دیا جائے۔"

سلطان نے تلملا کر کہا: "آخر کیوں؟ آخر کیوں؟"

ایک سوار نے جواب دیا: "بھوکے پیاسے مویشیوں والی فوج بالآخر تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

بہت سی آوازیں ایک ساتھ گونجیں: "واپسی، واپسی، شکست اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر باعزت واپسی!"

سلطان نے سنان پاشا کی طرف دیکھا: "یہ انہیں ہو کیا گیا ہے؟"

سنان پاشا نے جواب دیا: "سلطانِ والا! یہ سب اپنی اپنی عقل اور حوصلوں کے مطابق بات کر رہے ہیں۔"

ارسلان نے عرض کیا: "اور یہ بات یقینی ہے کہ ان میں خود ایک بھی نہیں یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں برنائے خلوص کہہ رہے ہیں۔"

سلطان نے کن انکھیوں سے ذکریا کی طرف دیکھا اس نے عرض کیا۔ "سلطانِ معظم! یہ ناچیز تو بس ایک بات جانتا ہے دنیا میں ہر شخص جو بھی مقام حاصل کرتا ہے اپنی عقل، حوصلے اور صلاحیت کے اعتبار سے حاصل کرتا ہے۔ حاضرین میں کوئی توپچی باشی (افسر توپخانہ) ہے کوئی توپ جری باشی (آتشی اسلحہ کا افسر) ہے کوئی جبہ جی باشی (سلاح خانے کا افسر) ہے اور کوئی لاغمجی باشی (قلعہ شکنوں اور سرنگیں بچھانے والوں کا افسر) ہے۔ لیکن ان سب میں سلطانِ معظم کی ذات ان سب سے الگ اور برتر و اعلیٰ ہے۔ اس موقع پر میں ایک ہی گزارش کروں گا کہ سلطانِ والا کی رائے اور عمل ان سب سے الگ اور برتر و اعلیٰ ہونا چاہئے کیونکہ عقل، تدبر اور حوصلوں میں سلطان اور ان افسروں میں فرق ہونا بہت ضروری ہے۔"

جہان پاشا آہستہ آہستہ سلطان کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر درخواست کی: "سلطانِ والا! میں ہراول دستے کا افسر ہوں اور مجھے سلطان کے ہم سبق ہونے کا شرف بھی حاصل ہے میں نے حضورِ والا کے بچپن میں ان کے ساتھ رہنے کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ ان امتیازات اور خصوصیات کے پیشِ نظر میں سلطان کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے آہستہ سے اجازت دے دی: "بیان کرو اجازت ہے!"

جہان پاشا نے عرض کیا: "حضورِ والا! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں اپنے ہراول دستے کے ساتھ آذربائیجان میں بڑی دور تک جا چکا ہوں، میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے دہشت زدہ ہو گیا جدھر میں نے دیکھا ہر طرف ویرانہ دیکھا، آبادیوں کے آثار کھنڈرات کی شکل میں دیکھے شاہ نے ہر طرف تباہ کاریوں اور بربادیوں کے ملبے چھوڑے ہیں، سبزہ جلا دیا گیا۔ باغات پھونک دیئے گئے درختوں کو خاک سیاہ کر دیا گیا ان حالات میں اگر میں یہ کہوں کہ شاہ نے اپنی زبردست جنگی حکمت عملی سے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے تو شاید غلط نہ ہو گا۔"

سلطان نے کہا: "یہ ساری باتیں تو میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

جہان پاشا نے عرض کیا: "صرف یہ کہ ان حالات میں ہمت ہار کر بیٹھ جانا اور خطرناک حالات کی موجودگی میں اور اپنے جوانوں، فوج کی متفقہ خواہش کے پیشِ نظر اگر اس مہم کو اس سال ملتوی کر دیا جائے تو بہتر رہے گا۔"

اسی وقت دوسرے افسران نے بھی جہان پاشا کی تائید میں آواز بلند کی: "ان حالات میں پیش قدمی کا صریح مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب اپنی موت کی طرف قدم بڑھائیں گے۔"

سلطانی خیمے کے باہر بھی جری سپاہ کا شور بلند ہو رہا تھا پیش قدمی کو اس سال ملتوی کر دیا جائے۔ "ہم اس سال جنگ نہیں کریں گے ہم خود کو تباہی اور بربادی کے حوالے نہیں کریں گے۔"

سلطان غصے میں کھڑا ہو گیا اور سیدان پاشا سے پوچھا "تم کم لفظوں میں بتا کر تو کیا چاہتا ہے؟"

سیدان پاشا نے جواب دیا "التوا اور واپسی۔"

سلطان کی تلوار فضا میں بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے سیدان پاشا کا سر سلطان کے قدموں میں آ گرا۔ سلطان نے اپنے افسروں کو مخاطب کیا "ینی چری کے سپاہیو! میری باتیں توجہ سے سن لو، میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ ناکام واپس جاؤں۔ میں ان سے مخاطب ہوں جو بہادر ہیں اور اپنی شرافت کی وجہ سے بزدلی اور نامردی کے عیب کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے، وہ لوگ جو تیر اور شمشیر کے زخموں سے ہراساں نہیں ہوتے یہ سب میرا ساتھ دیں گے لیکن وہ لوگ جو نامرد ہیں اور اپنی جان کو اپنی عزت سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے ہیں، وہ لوگ جو صعوبتوں کو برداشت کی ہمت نہیں رکھتے انہیں میں اجازت دیتا ہوں کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اگر تم میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو میرا ساتھ دے اور تم سب نامردوں میں شامل ہو چکے ہو تو میں تنہا ہی آگے بڑھ جاؤں گا اور معرکۂ جدال و قتال کے بغیر ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔"

اس کے بعد سلطان نے حاضرین پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور حکم دیا "وہ لوگ جو مرد ہیں کوچ کی تیاری کریں اور وہ لوگ جو بزدل ہیں اور واپس جانا چاہتے ہیں اپنی منحوس شکلوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس سے چلے جائیں۔"

ینی چری کے افسران خاموشی سے باہر نکلے اور کوچ کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو واپس جانے کی ہمت کر سکتا۔ یہ لوگ چاق و چوبند اور زیادہ عزم و حوصلے سے تبریز کی سمت بڑھنے لگے۔ دوران سفر۔۔۔ کاکیشیا کے ایک سیحی سردار نے غذا، گھاس اور مویشیوں کے لئے چارے کی وافر مقدار سلطان کی خدمت میں روانہ کی۔ سلطان کے ہزاروں سپاہی خچروں اور اونٹوں پر عسکری رسد بڑی تن دہی سے پہنچا رہے تھے سلطان اپنے لشکر کو بڑی تیزی سے آگے بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا اور اس کو برابر یہ خبریں مل رہی تھیں کہ شاہ اپنی سپاہ کو پیچھے ہٹاتا چلا جا رہا ہے یہاں تک کہ تبریز اور سلطانی عساکر کے درمیان کا فاصلہ صرف چالیس میل رہ گیا۔ سلطان نے وادیٔ خالدران میں اپنی سپاہ کو روک دیا اور اس کے مغربی ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف کا جائزہ لیا ــــ سلطان نے اپنے سامنے شاہ کی سپاہ کو میلوں میں پھیلے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوا اس نے اسی وقت اپنی فوج کو یہ خوش خبری سنا دی کہ سفری صعوبات کا خاتمہ ہوا اور جنگی مہارت اور استادی دکھانے کا موقع ملنے ہی والا ہے۔

سلطان نے بڑی تیز رفتاری سے اپنی سپاہ شاہ کی فوج کے مقابل پہنچا دی۔ شاہ کے سپاہی ترکوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے سلطان کے ساتھ ایک توپ خانہ بھی تھا جس سے ان کا حریف محروم تھا۔

شاہ کی تیز فہمی نے سلطان کو سستانے کا ذرا سا بھی موقع نہیں دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سلطانی سپاہ تھکی ماندی ہے اور خود اس کی اپنی سپاہ تازہ دم، چست اور مستعد۔

سلطان نے سنان پاشا کو داہنا بازو (میمنہ) دیا اور حسین پاشا نامی جرنیل کو بائیں بازو (میسرہ) پر متعین کر دیا۔

دوسری طرف شاہ صفوی نے اپنے اسی ہزار سواروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا چالیس ہزار کو خود سنبھالا اور چالیس ہزار کو اپنے مشہور جرنیل بوعلی کی کمان میں دے دیا۔ اور بقیہ کو ترکوں کے سامنے کھڑا کر دیا اس نے بوعلی کو حکم دیا کہ جب سامنے کی فوج سلطانی سپاہ کو جنگ میں الجھائے تو وہ خود داہنی طرف سے اور بوعلی بائیں جانب سے ترکوں پر حملہ آور ہو گا اس طرح سلطان کی تھکی ماری فوج کو چشم زدن میں پیس کر رکھ دیا جائے گا۔

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شاہ نے جنگ شروع کر دی۔ ترک شاہ کی فوج سے نبرد آزما تھے جبکہ خود شاہ اپنے چالیس ہزار سواروں پر۔۔۔۔ حسین پاشا پر حملہ آور ہوا اور تباہ کاری مچا دی دوسری طرف بوعلی نے سنان پاشا کے بازو پر حملہ کر دیا لیکن توپ خانے نے شاہ کے میسرے کو اس سے پہلے ہی اپنی زد میں لے لیا تھا۔ توپ خانے کے منہ کھل گئے۔ اور میدانِ جنگ قبرستان میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ سلطان اپنی سپاہ کے قلب میں موجود جنگی احکامات دے رہا تھا اس نے ایک بار بھی خود لڑنے کی زحمت گوارا نہ کی وہ شطرنج کے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے سوار اور پیادے ہٹاتا بڑھاتا رہا۔ اس کا توپ خانہ فیصلہ کن کردار ادا کر رہا تھا بہت جلد ہی دونوں طرف کے ماہرین جنگ کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں کون فاتح ہے اور کون مفتوح۔

سلطان نے حکم دیا "شاہ کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے اس کو زندہ گرفتار کیا جائے۔"

سلطان کو مطلع کیا گیا کہ سنان پاشا نے اپنی سمت کے حملہ آوروں کو مغلوب کر لیا ہے لیکن حسین پاشا کمزور پڑ رہا ہے سلطان اپنے ینی چری دستے کو لے کر حسین پاشا کی مدد کو پہنچ گیا اور آناً فاناً اپنے حریف کو مغلوب کر لیا۔

جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا، شاہ کو گرفتار کر لیا گیا لیکن شاہ کو پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ شاہ کا ایک دوست مرزا سلطان علی آگے بڑھا اور اعلان کیا "میں شاہ صفوی ہوں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

عثمانی سپاہ بہت خوش ہوئی اس نے مرزا سلطان علی کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

مرزا سلطان علی نے شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دوست! اگر یہ شریف عثمانی فوجی تجھے چھوڑنا گوارا کریں تو میری طرف سے میری بیکار فوج کو حکم دے دے کہ جنگ ختم ہو گئی ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔"

ترکوں نے شاہ کو معمولی آدمی سمجھ کر چھوڑ دیا اور مرزا سلطان علی کو شاہ سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ شاہ نے رطلی پاتے ہی اپنے گھوڑے کو تبریز کی راہ پر ڈال دیا۔

سلطان نے مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد شاہی خیمے کو محاصرے میں لے لیا، مرزا سلطان علی کو جب سلطان کے روبرو پیش کیا گیا، اور شاہی خیمے کی خواتین کو اس کی شناخت کے لئے کہا گیا تو انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ "یہ شاہ نہیں ہے بلکہ شاہ کا دوست مرزا سلطان علی ہے۔"

سلطان نے حیرت سے کہا "لیکن اس نے تو خود ہی یہ بتایا تھا کہ یہ شاہ ہے اور اپنے ایک ساتھی کو یہ حکم دے کر بھیجا تھا کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے اس کے برسرِ پیکار لوگ ہتھیار ڈال دیں۔"

مرزا سلطان علی مسکرا دیا "سلطان! وہ شخص جسے میں نے رطلی دلوادی، شاہ تھا اور میں اس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں، میں خوش ہوں کہ شاہ قید کی ذلت سے بچ گیا۔"

سلطان نے کہا "لیکن کیا یہ بھی جانتا ہے کہ خود تیرا کیا حشر ہو گا ــــ؟"

مرزا نے جواب دیا "جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

سلطان نے حکم دیا "اسے قید میں رکھا جائے۔ فیصلہ بعد میں۔۔۔ سناؤں گا۔"

شاہ عجلت میں اپنا سفری خزانہ اور اپنی چہیتی بیوی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا یہ چیزیں سلطان کے قبضے میں آ گئیں سلطان چند روز اس وادی میں مقیم رہا اس کے بعد وہ تبریز روانہ ہو گیا شاہ نے سلطان کی آمد کی خبر سنی تو خراسان چلا گیا اور سلطان نے تبریز پر قبضہ کر لیا۔

اس دوران سلطان چپ چاپ رہا کیونکہ فتح تبریز۔۔۔ کی خوشی میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ اس کی فوج نے بہت اذیتیں اٹھائی تھیں اور اس مہم کو اگلے سال پر موقوف کر رہے تھے اس کو یہ نہایت تلخ تجربہ ہوا تھا اس کے ساتھ ہی وہ سنان پاشا، استاد ارسلان اور زکریا سے خوش تھا جو آخر تک اس کے ہم خیال اور مطیع و فرماں بردار رہے۔

سلطان نے شاہ کی بیوی کو احتیاط و احترام سے رکھا سلطان کے محافظ یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ شاہ کی بیوی سے کیا سلوک کرے گا لیکن سلطان نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ سلطان نے آٹھ دن تبریز میں قیام کیا اس کے بعد وہ شمال کے ایک خوش گوار مقام قرہ باغ چلا گیا۔ اور وہاں قیام کیا یہ سرمائی مقام اسے بہت پسند آیا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اپنی آئندہ مہم کے منصوبے بنانا چاہتا تھا یہیں اس کی خدمت میں ایک تبریزی شہزادے نے حاضری دی سلطان نے اس کی بڑی عزت کی اور حد درجہ احترام سے پیش آیا۔

قرہ باغ سے سلطان نے اماسیہ کا رخ کیا۔ نہروں اور باغات کا شہر اماسیہ جہاں سلطان نے اپنے جانبازوں اور جاں نثاروں کو انعامات دیئے۔ یہیں سلطان کی خدمت میں شاہ صفوی نے اپنا ایلچی بھیجا۔ سلطان کو شاہ سے بڑی نفرت تھی۔ شاہ کے ایلچیوں کی آمد نے سلطان کو برہم کر دیا۔ اور مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا۔ اس کے امرا کا خیال تھا کہ شاید سلطان شاہ کے ایلچیوں کو شرفِ باریابی بخشے بغیر ہی واپس کر دے گا، لیکن سلطان نے انہیں شرفِ ملاقات بخش دیا۔

شاہ کے ایلچی نہایت احترام و ادب سے سلطان کے روبرو پیش ہوئے۔ انہوں نے سلطان کی خدمت میں شاہ کا ایک خط پیش کیا سلطان نے یہ خط استاد ارسلان کی طرف بڑھا دیا اور حکم دیا کہ اس کو باآوازِ بلند پڑھ کر حاضرین کو سنایا جائے۔

اس میں شاہ نے لکھا تھا۔

"ایک فرماں روا کا خط دوسرے فرماں روا کے نام۔ خالدران کی جنگ میں سلطان کو فتح اور مجھ کو شکست نصیب ہوئی، یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس سے فاتح خوش اور مفتوح آزردہ ہو۔ کیونکہ جب دو لشکر لڑتے ہیں تو ان میں سے ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوتی ہے یہ تقدیرِ الٰہی ہے اور تقدیرِ الٰہی کو خندہ پیشانی سے قبول کر لینا مردوں کی شان ہے جو کچھ ہوا، ہم دونوں کو اس کو بھلا دینا چاہئے اور اب دوستوں کی طرح رہنے کا عہد کرنا چاہئے۔ میں دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں امید ہے سلطان بھی اس کا جواب مثبت رویوں میں دے گا۔

میری بیوی ناہید سلطان کے قبضے میں ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ براہِ کرم اسے میرے ایلچیوں کے حوالے کر دیجئے۔ تاکہ وہ اسے میرے پاس پہنچا دیں۔ اس نوازش کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

سلطان نے ایلچیوں سے صاف صاف کہہ دیا "شاہ سے کہہ دینا کہ جس دشمنی کی بنا اس نے ڈالی تھی میں اسے برقرار رکھوں گا، میں شاہ کو نہ تو اچھا دوست سمجھ سکتا ہوں، نہ اچھا دشمن۔ رہی اس کی بیوی ناہید! تو وہ اسے نہیں واپس کی جائے گی۔ آئندہ اس قسم کے

خط و کتابت کی جسارت نہ کی جائے۔"

ناہید کے نام نے زکریا کو چونکا دیا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ شاہ کی بیوی ناہید کے بارے میں کچھ پوچھتا۔

شاہ کے ایلچیوں کو دربار سے بہ عزت و احترام واپس کر دیا گیا۔ سلطان کی طبیعت کا اندازہ حاضرین کو خوفزدہ کئے ہوئے تھا۔ وہ سلطان کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتے تھے۔ آخر سلطان نے خود ہی حکم دیا کہ سنان پاشا، استاد ارسلان اور زکریا کے سوا سبھی چلے جائیں۔

جب بالکل تخلیہ ہو گیا تو سلطان نے بولنا شروع کر دیا: "جس نے مروت نہیں کی اس سے مروت نہیں کی جائے گی، جس نے اخلاقیات کا خیال نہیں رکھا اس سے اخلاقی برتاؤ نہیں ہو گا۔" پھر اچانک سوال کیا: "شاہ کی اس وقت کیا عمر ہو گی؟"

سنان پاشا نے جواب دیا: "یہی کوئی سینتیس اڑتیس سال!"

سلطان نے کہا: "خوب!" پھر اچانک سوال کیا: "کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنا اقتدار اور بیوی کو ایک ساتھ کھو دینے کے بعد محض بیوی کو یاد رکھے اور اس کی تمنا کرتا رہے؟"

سنان پاشا نے جواب دیا: "سلطانِ معظم! دنیا میں ہر بات ممکن ہے کچھ لوگوں کے لئے اقتدار بڑی چیز ہے اور کچھ کے لئے اس کی چہیتی بیوی، شاہ کو اقتدار سے زیادہ اپنی بیوی عزیز ہو گی۔"

استاد ارسلان نے عرض کیا: "حضور والا! شاہ ایک صوفی کی نسل سے ہے اور صوفی لوگ اس اٹل حقیقت کے قائل ہوتے ہیں کہ حسن کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ حسن پرست ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ چونکہ خود حسین ہے اس لئے یہ حسن کو پسند کرتا ہے شاہ کی بیوی یقیناً غیر معمولی حسین ہو گی اسی لئے وہ اقتدار کو تو بھول گیا مگر حسین بیوی کو نہیں بھلا سکا۔"

سلطان نے اچٹتی نظروں سے زکریا کی طرف دیکھا، زکریا سمجھ گیا کہ سلطان اس سلسلے میں اس کی رائے بھی جاننا چاہتا ہے چونکہ ابھی تک زکریا نے سلطان پر بڑا اچھا نقش چھوڑا تھا اور سلطان اس کی علم دوستی میں اس کی تعریفیں کرتا رہا تھا۔ اس لئے زکریا نے سلطان کی ہم نوائی شروع کر دی بولا: "سلطانِ معظم! جب سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ شباب اور ہانڈی کے ابال میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں نے عورتوں اور لڑکیوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور میں خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

سلطان نے کہا: "لیکن جوانی میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" پھر پوچھا: "اور صفی الدین کی بیٹی ناہید کا بھی کچھ پتہ ہے؟ وہ کہاں چلی گئی ــ؟"

زکریا نے جواب دیا: "جنابِ والا! صفی الدین کی بیٹی جہاں کہیں بھی ہو گی خوش ہی ہو گی۔ اللہ نے اس کو بڑا حسن دیا ہے۔"

سلطان نے پوچھا: "کیا تیرے دل میں اس کی محبت کی رمق اب بھی پائی جاتی ہے؟"

زکریا شرما گیا بولا: "حضور والا! اب میں اپنی نوجوانی کے وقتی اور وقتی سی جذبے کو محبت کس طرح کہہ دوں؟ اور پھر میں صفی الدین کی بیٹی ناہید کا گناہگار بھی تو ہوں اگر وہ مجھے مل بھی جائے تو میں اس سے نظریں بھی نہیں ملا سکوں گا۔"

سلطان نے کہا: "خدا کرے تیرے یہ احساسات زندہ و برقرار رہیں عورت ایک سراب کی طرح ہے کہ زندگی بھر دھوکے میں رکھتی ہے۔"

زکریا نے عرض کیا: "اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس سراب سے دور اور محفوظ ہوں۔"

زکریا یہ سب سلطان کی خوشنودی اور اپنی بہتری میں کہہ رہا تھا۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ ناہید نے اس کے دل و دماغ تک کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔

سلطان نے تالی بجائی اور جب کئی خادم ایک ساتھ سلطان کے آس پاس آن موجود ہوئے تو سلطان نے انہیں حکم دیا: "شاہ کی بیوی ناہید کو پیش کیا جائے!"

اس حکم نے سب سے زیادہ زکریا کو پریشان کیا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور سر میں درد اٹھ کھڑا ہوا تھا کچھ دیر بعد.... صفی الدین کی بیٹی اور شاہ کی بیوی ناہید سلطان کے روبرو کھڑی کر دی گئی۔

سنان پاشا اور استاد ارسلان نے اس ماہ پارے کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے سلطان نے ناہید سے کہا: "بیٹھ جا! کیا تو اس نوجوان سے واقف ہے ــ؟"

یہ کہتے ہوئے سلطان نے زکریا کی طرف اشارہ کیا۔ مگر ناہید نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زکریا پر نیم مدہوشی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ناہید سے نظریں ملا سکتا۔

سلطان نے ناہید سے پوچھا: "صفی الدین کی بیٹی! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو شاہ کی بیوی کس طرح بن گئی؟"

ناہید نے زکریا کی طرف بڑے جذباتی انداز میں اشارہ کیا: "جب اس فریبی نے دھوکے سے میری قوم کے لوگوں کو تباہ و برباد کرا دیا اور میرے باپ کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا تو میں بے بس اور مجبور ہو گئی تھی اور میرے خاندان کے بڑوں نے مجھے پناہ کے لئے شاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ شاہ نے مجھے دیکھا تو شادی کی خواہش کر دی اور میری مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ اب وہ مجھے چھوڑ کر خراسان جا چکا ہے اور میں سلطان کی تحویل میں آ چکی ہوں۔"

سلطان نے کہا: "بہرحال! اب تجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ناہید نے ایک بار پھر زکریا کی طرف دیکھا اور بگڑ کر سلطان سے بولی: "سلطانِ معظم! اس فریبی اور دھوکے باز نوجوان کو یہاں سے ہٹا دیں ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی قوم کے مقتول اور اپنا باپ یاد آ جاتا ہے۔"

سلطان نے زکریا سے کہا: "زکریا! تو کچھ دیر کے لئے باہر چلا جا، اور یوں بھی اب تیری کوئی ضرورت نہیں۔"

زکریا باہر چلا گیا۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان، دونوں ہی سلطان سے نظریں بچا بچا کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

سلطان نے ناہید سے کہا: "شاہ کے ایلچی آئے ہوئے ہیں اس نے تجھے بلوایا ہے، کیا خیال ہے؟ کیا میں تجھے ان ایلچیوں کے حوالے کر دوں ــ؟"

ناہید نے احتجاج کیا: "نہیں سلطانِ معظم! اب میں شاہ کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

سلطان نے کہا: "تب پھر تو یہاں کس کے پاس اور کس طرح رہے گی ــ؟"

ناہید نے جواب دیا: "حضور والا! اب میں کسی قیمت پر بھی شاہ کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

سنان پاشا نے عرض کیا: "سلطانِ معظم! کیا حرم سرا میں ایک حسین لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں؟"

سلطان گرم ہو گیا: "احمق! کیا میری غیرت یہ گوارا کرے گی کہ شاہ کی بیوی کو اپنے حرم میں ڈال لوں؟ میں اس کا کچھ بھی کروں مگر حرم میں نہیں ڈال سکتا۔"

استاد ارسلان نے اپنے شاگرد کی سفارش کی: "سلطانِ معظم کو شاید ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ زکریا ناہید سے والہانہ حد تک عشق کرتا ہے۔ یہ جوڑ کیسا رہے گا؟"

سلطان نے دونوں ہی کو ڈانٹ دیا: دونوں ہی خاموشی سے باہر نکل گئے وہاں زکریا عالمِ کرب و اضطراب میں چرخ کی طرح گھومنے میں مشغول تھا۔

زکریا نے سرگوشی میں پوچھا: "اندر کیا ہو رہا ہے؟ سلطان نے اس لڑکی کی بابت کیا فیصلہ کیا؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا: "ابھی کچھ نہیں، لیکن یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ناہید سے متعلق تیرا ذکر کبھی بھی نہیں ہو گا سلطان اور ناہید، دونوں ہی نے تجھے بڑی بے رحمی سے مسترد کر دیا ہے۔"

زکریا نیم پاگل ہو رہا تھا [illegible] بڑبڑانے لگا: "تو شاید اس کا یہ مطلب ہوا کہ سلطان خود ناہید پر عاشق ہو چکا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔ سلطان کو کم از کم اپنی بات کا تو پاس ہونا چاہئے سلطان ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ عورت ایک سراب ہے اور دوسری طرف اس سراب کو گلے لگانے کے لئے تیار نظر آتا ہے ــ"

استاد ارسلان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "پاگل یہ کیا الل ٹپ بک رہا ہے اپنی زبان کو قابو میں رکھ، ورنہ ہمدان پاشا کی طرح تیرا سر بھی سلطان کے قدموں میں پڑا ہو گا۔"

زکریا سہم کر چپ ہو گیا۔ سلطانی خدام اسی وقت ناہید کو لے کر باہر نکلے اور اس کو سلطانی حرم سے متعلقہ ایک خیمے میں پہنچا دیا۔ ایک دوسرے خادم نے ان تینوں کو مطلع کیا کہ: "سلطان یاد فرما رہے ہیں۔"

جب یہ تینوں سلطان کے رُو برُو پہنچے تو سلطان نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات سے ان کے دلوں کی کیفیات سمجھنے کی کوشش کی۔ اور بطورِ خاص زکریا سے کہا: "ناہید کے سلسلے میں یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ وہ میرے لائق نہیں ہے میں اتنا ارزاں اور بدمذاق ہرگز نہیں کہ شاہ کی بیوی اور ایک ناپختہ کار نوجوان کی پسند کو اپنا.... ہم معیار قرار دوں۔ اللہ نے چاہا تو ناہید شاہ کے سوا کسی کو بھی دی جا سکتی ہے۔"

زکریا کے مایوس دل میں امید کی کرنیں بکھر گئیں اور ڈوبتا ہوا دل پھر اسی شان سے دھڑکنے لگا جس طرح ناہید کے آنے سے پہلے دھڑک رہا تھا۔

سلطان نے زکریا سے کہا: "بس اب تو جا سکتا ہے، تجھ سے بس اتنی سی بات کہنا تھی، جو کہہ چکا۔"

زکریا سلطان کے خیمے سے اس طرح نکلا جس طرح سلطان وادیٔ خالدران سے فاتحانہ انداز میں نکلا تھا، خوش، مطمئن اور مستغنی۔

(جاری ہے)

چشم کرم

نسیم جاوید

نگاہ کی کمزوری سے
لوگوں کو بڑے نقصانات
اٹھانا پڑتے ہیں

مگر بعض اوقات
اس خامی سے فوائد بھی
حاصل ہو جاتے ہیں

اُن روز میں بے حد پریشان تھا۔

میں نے وائلٹ سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اسے ساتھ لے کر پہلے ڈنر کے لئے کسی اچھے سے ہوٹل میں جاؤں گا اور پھر کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے..... لیکن میرے باس مسٹر پیری نے یہ کہہ کر سارے پروگرام کا ستیاناس کر دیا کہ مال اسٹاک کی مکمل فہرست فوری طور پر درکار ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اس ملازمت کے بغیر میں وائلٹ سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وائلٹ بس ہر لحاظ سے تھی بلکہ خوب موٹے موٹے عدسوں کا چشمہ استعمال کرنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس کے آتشی رنگ کے بال اور ناک کا خفیف سا خم مجھے اتنا پسند تھا کہ ان کا خیال ذہن میں لاتے ہی میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ مسٹر پیری کی حکم عدولی ممکن نہیں تھی اور فہرست تیار کرنے کے لئے تین گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت درکار تھا۔ میں نے وائلٹ کو فون کیا اور بے بسی ظاہر کر دی۔ توقع کے مطابق اس نے نہ صرف میری معذرت قبول کر لی بلکہ یہ سوچ بھی دے دی کہ واپسی میں اس کی دکان سے ہوتا جاؤں۔ اس نے ہلکے پھلکے کھانے کی تیاری کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے میں نے اقرار کر لیا۔

میں جیولری کی جس دکان میں ملازم تھا، اس کا مالک مسٹر پیری ایک کنجوس سا آدمی تھا۔ ہر وقت کام میں گدھوں کی طرح جوتے رکھنے کے باوجود نہ تو تنخواہ بڑھا رہا تھا اور نہ ہی اوور ٹائم دینے پر کبھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ میں دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوستا ہوا فہرست تیار کرتا رہا حتیٰ کہ ساڑھے آٹھ بجے اس کام سے فارغ ہو گیا۔

ابھی میں جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھایا تو مسٹر پیری کی منحوس آواز سنائی دی "ہیلو جارج۔۔۔ کہو ...کام کیسا جا رہا ہے۔؟" اس نے دریافت کیا۔

"فہرست تیار ہو چکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب..." اس نے کہا۔ اس سے زیادہ تعریف اس شخص سے متوقع بھی نہیں تھی۔ "دیکھو، میں نے تمہیں اس لئے فون کیا ہے کہ میری میز پر ایک پیکٹ رکھا ہے۔ میں اسے ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ ٹیکسی پکڑو اور میرے ہاں پہنچا دو۔ کرایہ میں ادا کر دوں گا۔"

میں جبڑے بھینچے کڑھتا رہا۔

وہ شہر کے دوسرے کنارے رہتا تھا۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے باوجود نصف گھنٹے سے زیادہ وقت لگنے کا امکان تھا گویا میں وائلٹ سے کئے ہوئے دوسرے وعدے کو بھی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مسٹر پیری شاید میری جان ہی جلانے کے درپے تھا۔

"بحث نہ کرو۔ اس پیکٹ میں ایک تحفہ ہے جو میں آج رات اپنی بیوی کو دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

مسٹر پیری کی دراز سے پیکٹ نکال کر میں باہر آ گیا۔ آس پاس کوئی ٹیکسی دکھائی نہ دی تو میں پیدل ہی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں دکان سے ایک بلاک کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ میں چاروں خانے چت گر گیا۔ جب حواس قدرے بحال ہوئے تو خود کو دو غنڈوں کے نرغے میں پایا۔

وہ میری جامہ تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن میں ہاتھ پاؤں مار کر نہ صرف اپنی جیبوں کو ان کی دسترس سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ خود کو ان کے گھونسوں اور ٹھوکروں سے بھی بچا رہا تھا۔ اچانک ان میں سے ایک نے میرے نرخرے پر بازو جمایا تو میری مدافعانہ کارروائی یکایک دم توڑ گئی۔

دوسرے نے پے در پے میرے پیٹ میں ٹھوکریں ماریں۔ پھر نہ صرف میری تلاشی لی گئی بلکہ جیبیں تک ادھیڑ ڈالی گئیں۔ پیکٹ اور میرا بٹوا حاصل کرنے کے بعد دونوں غنڈے بھاگ نکلے۔ میں نے بمشکل خود کو فٹ پاتھ سے اٹھایا۔ اس وقت تک دونوں غنڈے نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میرے کپڑے پھٹ گئے تھے اور مجھے خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ میں دیوار سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میرے بٹوے میں آخری پونجی بیس ڈالر تھی، وہ ضائع ہو چکی تھی اور مسٹر پیری کا پیکٹ بھی مجھ سے چھن چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس صورت حال میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟

چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی ذہنی حالت کو سنبھالا اور سب سے پہلے قریبی ٹیلیفون بوتھ تک پہنچا۔ جیب میں تھوڑی سی ریزگاری تھی، اسے استعمال کر کے میں نے کانپتے ہاتھوں سے مسٹر پیری کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور صورت حال بتانے لگا۔

"کیا بک رہے ہو؟" اس کی دھاڑ سنائی دی۔ "جانتے ہو اس پیکٹ میں کیا تھا۔ اس میں چار سو ڈالر کے ہیرے تھے۔ ایک کنگن تھا اور ایک قیمتی انگوٹھی تھی۔"

"میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی مسٹر پیری لیکن۔۔۔"

"یہ نقصان تمہیں پورا کرنا پڑے گا، جارج۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اس سلسلے میں کل صبح تم سے بات کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اس منحوس پیکٹ کے لئے گھونسے اور لاتیں برداشت کی تھیں اور مرتے مرتے بچا تھا لیکن مسٹر پیری کو اپنے ہیروں اور زیورات ہی سے دلچسپی تھی۔ اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ خود میں کس حال میں ہوں؟ کہیں میں زخمی تو نہیں ہو گیا؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور پیٹ میں درد کی لہروں کا بسیرا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا پیٹ درد کی لہریں بنانے کے کام میں مصروف ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے گھر پہنچ کر سیدھا بستر پر لیٹ جانا چاہئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس صورت حال میں وائلٹ ہی سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔ فون کرنے کے بعد اتنی ریزگاری تھی کہ میں بس کے ذریعے وائلٹ کی دکان تک پہنچ سکتا تھا۔ شہر کے وسطی حصے میں وہ پھولوں کی ایک دکان پر ملازم تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ گھبرائی ہوئی میری طرف دوڑ پڑی۔

"اوہ جارج۔ یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟" اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر ایک کوچ میں لٹا دیا۔

"دو غنڈوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔" میں نے کراہ کر بتایا۔

"تم زخمی تو نہیں ہو؟"

میں نے اسے اطمینان دلایا کہ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں البتہ انہوں نے میرا انجر پنجر ضرور ڈھیلا کر دیا ہے۔ اس نے تولیہ بھگو کر میرا چہرہ صاف کیا

میں نے مسٹر پیری کے پیکٹ سے اس کے پاس پہنچنے تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ مسٹر پیری کے ہاں کل میری ملازمت کا آخری دن ہو گا۔

"مسٹر پیری کو اس پیکٹ کی آج ہی رات ضرورت تھی؟" وائلٹ نے چونک کر دریافت کیا۔ "اور وہ اپنی بیوی کو تحفہ دینا چاہتا تھا؟"

"ہاں.... شاید مسٹر پیری کی سالگرہ کا چکر ہے۔"

وہ نہایت انہماک سے میرے چہرے کو پونچھتی ہوئی بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں ملازمت سے نکال دے گا؟"

"ممکن ہے وہ اس پیکٹ کی رقم میرے ذمے ڈال دے..... یا پھر ممکن ہے ملازمت سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اس رقم کا بھی تقاضا کر دے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے، وائلٹ" میں نے بے بسی سے کہا۔

وائلٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "تم فکر نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بھیگا ہوا تولیہ ایک طرف رکھ دیا اور بولی۔ "ایک بار تم نے تذکرہ کیا تھا کہ وہ کچھ آوارہ قسم کا آدمی ہے۔ بہرحال، تم اس کی بیوی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"صرف اتنا کہ وہ سماجی کاموں میں الجھی رہنے والی ایک ایسی عورت تھی جس کا زیادہ تر وقت تقریریں کرنے میں صرف ہوتا ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔" وائلٹ نے ہنس کر کہا "سماجی شخصیت ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی خبر شائع ہوتی رہتی ہے..... اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ آج رات وہ اپنے گھر

پر موجود نہیں ہے بلکہ کسی تقریب میں شرکت کے لئے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ میں نے شام کے اخبار میں یہ خبر تفصیل سے پڑھی تھی۔"

میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ....؟"

"اور سنو...." اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اس نے سہ پہر ہی فون کر کے کہا تھا کہ رات آٹھ بجے اس کے ہاں درجن بھر تازہ گلاب بھجوا دیئے جائیں۔ میں نے کال تو ریسیو نہیں کی تھی البتہ پھول دستے بھجوائے جا رہے تھے، ان پر لگی ہوئی سپتے کی پرچیاں ضرور پڑھی تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں کسی عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا....؟"

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس کی بیوی شہر سے باہر تھی اور وہ کسی اور کو اپنے ہاں مدعو کئے ہوئے تھے.... کوئی ایسی عورت جسے وہ نہ صرف قیمتی کنگن بلکہ انگوٹھی اور گلاب بھی تحفے میں دینا چاہتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وائلٹ نے اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل چٹکیوں میں حل کر دی تھی۔

"کیا تمہیں یقین ہے، ڈارلنگ کہ فون مسٹر پیری نے کیا تھا؟" میں نے شبے کی آخری لہر بھی ذہن سے نکال دینے کے لئے تصدیق چاہی۔

"میں نے گل دستے پر ایڈریس کی سلپ دیکھی تھی مسٹر رابرٹ پیری.... دی ویسٹ پارک آرمز۔"

میں نے اسے خوشی سے لپٹا لیا۔ میرے سر کا درد اور پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ یکایک ہی ختم ہو گئے تھے۔ "ٹھیک ہے...." میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "مجھے ٹیکسی کے کرائے کے لئے کچھ رقم ادھار دے دو.... اور میں جا رہا ہوں۔"

بیس منٹ بعد میں مسٹر پیری کے دروازے پر کھڑا بے حد پُرجوش تھا۔ اس دوران میں نے نہ جانے کیا کیا منصوبے بنا ڈالے تھے۔ میں نے اپارٹمنٹ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

مسٹر پیری نے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے راستے میں حائل ہوتا، میں کندھے کے زور سے اسے ہٹاتا ہوا سیدھا خواب گاہ میں جا پہنچا۔ وہ عقب میں چیختا ہی رہ گیا تھا۔

خواب گاہ میں ایک میز پر شراب کی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ دو گلاس بھرے ہوئے تھے اور قریب ہی برف کی ڈلیوں سے بھرا ہوا برتن تھا۔ دیوان پر ایک سرخ بالوں والی حسینہ دراز تھی اور اس کی حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ گلاب البتہ خواب گاہ میں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"جارج....!" مسٹر پیری نے گرج کر کہا۔ "آخر تمہاری اس حرکت کا کیا مقصد ہے؟"

میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں.... کل ہمارے درمیان جو بات چیت ہونے کا امکان ہے، میں اس سلسلے میں تصدیق کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔"

مسٹر پیری کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ نگاہیں چرانے لگا جبکہ سرخ بالوں والی حسینہ اب بھی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے مزید کچھ کہے سنے بغیر ہی بیرونی دروازے کا رخ کیا اور وہاں سے فاتحانہ انداز میں واپس آ گیا۔

گھر پہنچ کر میں نے وائلٹ کو فون پر اطلاع دی کہ معاملہ ہماری توقع کے عین مطابق ہی ثابت ہوا ہے۔ وہ جواباً خوشی سے چیخ پڑی اور خود میرا بھی جی چاہا کر خوشی سے گھنٹوں چیختا ہی رہوں۔

اگلے روز مسٹر پیری نے شوروم میں قدم رکھا تو اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے اپنے دفتر میں جا گھسا۔ دس بجے کے قریب اس نے مجھے بلایا تو اس کے نقش و نگار معمول کے مطابق تھے اور لہجہ بھی قدرے سخت تھا۔

"جارج.... میں اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو کل رات تمہیں پیش آیا تھا۔ میرا خیال ہے پولیس جلد ہی ان غنڈوں کا سراغ لگا کر ہماری اشیا برآمد کر لے گی بہرحال مجھے افسوس ہے کہ میں نے رات فون پر تم سے سخت کلامی کی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

میں نے اسے اپنی بہترین مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے، جناب! کیا میں اپنی تنخواہ میں کچھ اضافے کی بھی توقع کر سکتا ہوں؟"

اس کے جبڑے ایک لمحے کو تن کر ڈھیلے پڑ گئے۔ "اوہ، ہاں تمہاری کارکردگی قابلِ اطمینان ہے۔ پچیس ڈالر فی ہفتہ....؟"

"پچاس ڈالر، جناب!" میں نے جلدی سے کہا۔

ایک بار پھر اس کے جبڑوں میں تناؤ اور پھر ڈھیلا پن پیدا ہوا.... پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ٹھیک ہے پچاس ڈالر کا اضافہ ہی سہی....؟"

O

اس رات میں نے وائلٹ کے ساتھ خوب ٹھاٹ دار جشن منایا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ ہی شراب پی تھی اور خاصا بہک رہا تھا۔ وائلٹ بھی بات بےبات ہنس رہی تھی۔ اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ "لیکن ڈارلنگ.... رات میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد ڈلیوری رجسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گلاب کا آرڈر کسی اور مسٹر پیری نے دیا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میری نگاہ خاصی کمزور ہے۔ میں نے ایسٹ پارک آرمز کو ویسٹ پارک پڑھا تھا۔"

چند لمحوں تک میں سب کچھ بھول کر وائلٹ کو حیرت سے دیکھتا رہا.... پھر اس کی کمزور بینائی کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

*

اپنے پارٹنر کو قتل کرنے کا خواب آدم کے لئے فی الحال ایک سہانے خواب کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن یہ ایک ایسا خواب تھا جو وہ بار بار دیکھا کرتا۔ اس نے گھنٹوں بیکر کے لئے ایک مکمل قتل کے متعلق سوچا تھا۔ جب بھی کسی ہوائی جہاز کا حادثہ ہوتا آدم ریڈیو کی خبروں میں مرنے والوں کا نام سننے کے لئے اپنے کان لگا دیتا لیکن اس کی بدقسمتی سے جوزف بیکر کا نام ہلاک ہونے والوں میں کبھی نہ آسکا اور بیکر کو مردہ دیکھنے کی خواہش آدم کے دل میں روز بروز جڑ پکڑتی گئی۔

بیکر کے لئے آدم کی روز بروز بڑھتی ہوئی نفرت کسی ذاتی وجہ سے ہرگز نہیں تھی بلکہ یہ ایک خالص کاروباری مسئلہ تھا۔ جوزف بیکر سے پارٹنرشپ کو ختم کر دینا یا کاروبار کو دفعتاً ترک کر دینا مسئلے کا حل نہیں تھا۔

اے بی ہوائی کمپنی قائم کرنے کا خیال بیکر ہی کے دماغ تھا۔ اس کے پاس ایک طیارہ اور کچھ نقد رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ تھوڑے بہت کاروباری تعلقات بھی تھے جبکہ آدم کے پاس مہارت تھی۔ وہ ایک تجربے کار اور مشاق پائلٹ تھا۔ آدم نے اس شاندار تجویز کو سراہا اور دس ہزار ڈالر کی رقم اکٹھی کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

اس کے علاوہ اسے کام بھی چاہیئے تھا لیکن سب سے بڑی دشواری اس کی راہ میں یہ تھی کہ وہ حد سے زیادہ منہ پھٹ تھا۔ کبھی کبھی بیوقوفی کی حد تک پرواز کے دوران خلاؤں میں اپنی بہادری دکھانے لگتا۔ اسی لئے ایئر فورس والوں نے اسے ہٹا دیا اور اسے کسی نجی کمپنی میں بھی پائلٹ کی ملازمت نہیں مل سکی پھر جب اس نے جوزف بیکر کا یہ منصوبہ سنا تو یہ اس کے دل کو بھا گیا اور اس کو احساس ہو گیا کہ وہ اس شاندار منصوبے کے ذریعے صرف پانچ برسوں میں بے پناہ دولت مند بن سکتا ہے۔

پانچ برس دیکھتے دیکھتے گزر گئے اور بجائے اس کے کہ وہ منافع حاصل کرتا ابھی تک قرض ہی چکا رہا تھا۔ کمپنی کے گھاٹے میں جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیکر ایسا آدمی تھا جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کاروباری معاملات کو بہت آسانی سے سنبھال لیا تھا لیکن اس کی نرم دلی سے کمپنی کو نقصان ہونے لگا۔ ہر کاروباری ادارے کو تھوڑی بہت خوشامد کرنی پڑتی اور بیکر بہت ہی معمولی معاوضے پر اپنے جہاز کے ذریعے سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے راضی ہو جاتا لیکن کمپنی کی اس مالی خستہ حالی نے بیکر کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اس لئے کہ ضروریاتِ زندگی بہت سادہ تھیں۔ وہ ایک رومان پسند طبیعت کا آدمی تھا اور تنہا رہتا تھا جسے فطرت کے مناظر سے پیار ہو۔ اسے روپے پیسے کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی لیکن آدم کو یہ خستہ حالی بری طرح کھل گئی تھی۔ اس کے بے پناہ اخراجات نے اسے روز بروز زیادہ سے زیادہ مقروض کرنا شروع کر دیا۔

کئی مرتبہ آدم نے اس مسئلے پر بیکر سے بات کی لیکن ہر بار بیکر کا

ترقی کی خواہش ہر آدمی میں ہوتی ہے لیکن یہ حد سے بڑھ جائے تو شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے

امریکا کے تازہ ترین جرم و سزا کی شاہکار کہانی

انجام

نیاز الرحمٰن قادری

ایک ہی جواب ہوتا تھا: ”دیکھو بیکر! کاروبار اس لئے نہیں کر رہا کہ لوگوں کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دوں۔ میں یہ کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر تم کاروبار سے الگ ہونا چاہتے ہو تو الگ ہو سکتے ہو۔“

لیکن دس ہزار ڈالر کی واپسی سے آدم کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اس کاروبار کے ذریعے دولت مند بننے کے لئے اپنے پانچ برس بھی ضائع کر دیئے تھے۔ اسی لئے آدم، بیکر کا جواب سن کر خاموش ہو جاتا۔

جیسے جیسے آدم پر قرض کا بوجھ بڑھتا گیا، ویسے ویسے اس نے بیکر کی موت کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ ایک شام آدم نے شراکت داری کے معاہدے پر غور کیا۔ وہ ایسا طریقہ نکالنا چاہتا تھا جس کے ذریعے وہ کمپنی کے مالی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ شراکت داری کا معاہدہ بیکر ہی نے تیار کیا تھا اور اس وقت آدم نے اس پر توجہ دیئے بغیر ہی دستخط کر دیئے تھے۔ اب معاہدے کی شرائط اسے اس طرح ازبر ہو گئی تھیں جیسے پرواز کے اصول۔

بے شمار باتوں کے علاوہ اس معاہدے میں دو باتیں بہت اہم تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر ایک شریک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا کمپنی کا مالک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ تھی کہ انتقال کی مختلف تشریح کی گئی تھی۔ ایک تشریح یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شریک غائب ہو جائے اور پچیس دنوں تک نظر نہ آئے تو بھی اسے مردہ تصور کیا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے بیکر نے بتایا تھا: ”دیکھو بعض اوقات جہاز اور اس کا عملہ خراب موسم کی وجہ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جہاز کو حادثہ پیش آتا ہے لیکن لوگوں کو پتا نہیں چل پاتا۔ اسی لئے پچیس دنوں کی شرط رکھی گئی ہے۔“

اس کے علاوہ ایک انشورنس پالیسی بھی تھی کہ اگر کوئی شریک غائب ہو گیا تو پچیس دنوں کے بعد دوسرے شریک کو ایک لاکھ ڈالر مل جائیں گے۔

اس سے پہلے کبھی آدم نے بیکر کے قتل کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب اس معاہدے کو غور سے پڑھنے کے بعد وہ اپنی خواہش کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ایک دوپہر کو آدم چھوٹی سی پرواز کے بعد واپس آیا تو بیکر اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک پیغام رکھا ہوا تھا کہ وہ کچھ خریداری کے لئے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ آدم کو اس بات کی فکر تھی کہ بیکر کے جانے کے بعد نہ جانے کتنے کاروباری اداروں کا فون آچکا ہوگا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

”میں اے بی ایئر کمپنی سے بول رہا ہوں۔“ آدم نے کہا۔

”ہم لوگ کچھ سامان روانہ کرنا چاہتے ہیں۔“ کسی نے کہا۔

”کس جگہ؟“

”بین برج۔“

”بین برج؟“ آدم نے دہرایا پھر دیوار پر لگے ہوئے نقشے کی طرف دیکھتا ہوا بولا: ”دیکھیں جناب! بین برج ملک کے بالکل شمالی کونے میں ہے یہ جگہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے اور ان دنوں وہاں کا موسم بھی بہت خراب ہے۔“

”تم لوگ یہ کام کر سکتے ہو کہ نہیں؟“ آواز میں سختی تھی۔

”کیوں نہیں کر سکتے۔۔۔ ہمارا کام ہی یہی ہے۔“

”معاوضہ کتنا لو گے؟“

”بین برج تک آٹھ سو ڈالر۔“ آدم نے جلدی سے کہا۔ وہ گاہکوں کے ساتھ نرمی اور معاوضہ لینے والی بیکر کی نصیحت کو اس وقت بھول گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس آواز نے کہا تو آدم کو احساس ہوا کہ اس نے صرف آٹھ سو ڈالر بتا کر غلطی کی ہے۔ بہرحال وہ آٹھ سو ڈالر کہہ چکا تھا۔ اس آدمی نے سوچ کر کہا: ”لیکن وہ سامان کل نکلنا ہوگا اور کل ہی پہنچایا جانا ہے۔“

”کل سنیچر کا دن ہے جناب۔“ آدم نے جلدی سے کہا۔ اسے معاوضے میں اضافہ کرنے کا ایک موقع مل گیا تھا۔ ”کل ہمارے یہاں چھٹی ہوتی ہے لیکن آپ کی خاطر یہ کام کرنا ہے۔ پائلٹ اور سامان کے دو سو ڈالر مزید لے گا۔“

آدم کی بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ آدم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اس نے فون بند نہ کر دیا ہو لیکن کچھ دیر بعد اس آدمی کی آواز آئی: ”ٹھیک ہے۔“

”بس تو جناب، اب آپ مجھے جلدی سے تفصیل بتا دیں۔“

بیکر تھوڑی دیر کے بعد ہی لوٹ آیا تھا۔ ”پرواز کیسی رہی؟“

”بہت اچھی، لیکن ہمیں زیادہ رقم نہیں مل سکی۔“

”معاوضہ تو ہم نے لے لیا ہے؟“

”ہاں معاوضہ تو لے ہی لیا ہے لیکن بہت معمولی معاوضہ ہے۔“

”وہ بے چارے اتنا ہی دے سکتے تھے۔“ بیکر نے کہا: ”اور میرا خیال ہے کہ اب ہم لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔“

آدم نے بیکر سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید اس کی غیر موجودگی میں کوئی فون آیا ہو لیکن اس نے بین برج والے معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ بیکر نے کہا: ”میں دو دن تک تفریح کے موڈ میں ہوں۔ پہاڑوں پر جا کر اسکیٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے برسوں سے تفریح نہیں کی۔“

”تم کب جا رہے ہو؟“ آدم نے پوچھا۔

”کل۔“ بیکر نے جواب دیا۔ ”طیارہ تو پرواز کے لئے تیار ہے نا؟“

”کیا تم طیارے پر جاؤ گے؟“ آدم سٹپٹا گیا تھا۔

”یقیناً۔ بشرطیکہ یہ لائسنس ابھی تک کارآمد ہو۔“

آدم نے محسوس کیا کہ اب وہ بین برج والی بات چھپا نہیں سکتا اس لئے مجبوراً اس نے بیکر کو ساری بات بتا دی۔

”ٹھیک ہے تم مجھے پہاڑوں پر اتارتے ہوئے چلے جانا۔“ بیکر نے کہا۔

”بہت خوشی سے۔“ آدم نے جواب دیا۔ پھر وہ رات تک سوچتا رہا۔

دوسری صبح آدم مال لینے کی غرض سے کمپنی کے دیئے پتے پر لیونکس برادرز کے یہاں پہنچ گیا۔ یہ لوگ تجہیز و تکفین کیا کرتے تھے۔ وہاں اس کی ملاقات لیونکس سے ہوئی جو خود چالیس برس سے کم کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیونکس نے ایک بڑا سا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا: ”اپنی گاڑی کو اندر لے جاؤ۔“

آدم گاڑی کو گیٹ کے اندر لے گیا پھر گاڑی روکی، چھوڑ کر لیونکس کے دفتر آگیا۔

لیونکس نے ایک کاغذ آدم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”اس پر ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جن سے تمہاری ملاقات بین برج کے ایئرپورٹ پر ہوگی۔“ پھر اس نے ایک ہزار ڈالر کا ایک چیک آدم کو دے دیا۔ ”یہ رہا تمہارا معاوضہ۔“

”شکریہ۔“ آدم نے بڑی احتیاط سے چیک کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا: ”آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی جناب۔“ پھر اس نے کچھ رک کر لیونکس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ”جناب، کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کیا مال بھیج رہے ہیں؟“

”مال نہیں، وہ ایک لاش ہے۔“ لیونکس نے کہا۔

”لاش؟“

”ہاں، مسز ہورشن کی لاش ہے۔ پچھلے دنوں ہسپتال میں ایک آپریشن کے دوران اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی فیملی بین برج میں رہتی ہے۔ وہ لوگ لاش کو بین برج ہی میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے لاش وہاں بھیجی جا رہی ہے۔ ایئرپورٹ پر تجہیز و تکفین کے ایک ادارے والے لاش کو لے کر جائیں گے اور قبرستان میں دفن کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آدم واپس جانے کے لئے مڑا لیکن لیونکس نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ وہ پھر بول پڑا: ”اگر میں اس عورت کا شوہر ہوتا تو اس کی موت کو اتنی آسانی سے نظرانداز نہیں کر دیتا۔“ پھر اچانک وہ جیسے [illegible] گیا تھا۔ ”کفن و دفن کا کام کرنے کے ناطے مجھے یہ بات نہیں کرنا چاہیے لیکن بے وقت کی موت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میرا ایک عرصے سے مُردوں کے ساتھ ہی تعلق ہے۔ اس لئے میں یہ جانتا ہوں کہ اس عورت کو ابھی نہیں مرنا تھا۔ بہرحال یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔“

لیونکس اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ اس لئے آدم دفتر سے باہر چل دیا۔

بیکر، آدم سے طیارے پر ہی ملا حالانکہ بیکر چھوٹے قد کا آدمی تھا لیکن اس تابوت کو اٹھا کر طیارے کے اندر رکھنے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ بیکر نے بھی اپنا سامان طیارے پر لاد دیا اور آدم نے طیارے کا آخری جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اندر پہنچ کر آدم نے تمام آلات کی جانچ پڑتال کی اور اپنے اس پستول کو دیکھا جو اس کے پاس ایئرفورس کے زمانے سے تھا۔ اب حفاظت کی غرض سے ہر وقت اس پستول کو اپنے ساتھ رکھنا آدم کی عادت بن گیا تھا۔

اس نے پستول کے چیمبر کو چیک کیا۔ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پستول کو سیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے مڑ کر تابوت کی طرف دیکھا۔ پھر بیکر پر نظر ڈالی۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی اور اس کا دوران خون ایک دم تیز ہو گیا۔

”بین برج سے چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ہوائی پٹی ہے۔“ بیکر نے آدم کو بتایا۔ ”ایک مرتبہ اسے ایک کمپنی نے استعمال کیا تھا اور میری اطلاع کے مطابق یہ ابھی تک بہتر حالت میں ہے۔ آج کل اسے زیادہ تر کیمپ لگانے والے استعمال کرتے ہیں۔ تم مجھے وہاں اتار سکتے ہو۔ پھر میں اپنا سامان اٹھا کر کیمپنگ کے لئے پہاڑوں کی طرف نکل جاؤں گا۔“

طیارہ فضا میں پرواز کر چکا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ آدم نے کن انکھیوں سے اپنے پستول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بیکر کی توجہ کسی دوسری طرف تھی۔

پرواز کے دوران وہ زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ بیکر نے ایک مرتبہ اسے بتایا کہ وہ کس طرح اپنی چھٹیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ بالآخر ہوائی پٹی نظر آنے لگی۔ بیکر نے کہا: ”وہ دیکھو، وہ ہوائی پٹی نظر آ رہی ہے۔“

”پہلے ہم اس کا جائزہ لیں گے۔“ آدم نے طیارے کو نیچے لاتے ہوئے کہا۔ وہ ہوائی پٹی سے کچھ اوپر پرواز کرتا رہا پھر اس نے طیارے کو اوپر اٹھا لیا۔

”مجھے تو یہ بہتر ہی حالت میں معلوم ہوتا ہے۔“ بیکر نے کہا۔

”ہاں، لیکن تمہاری نظر کسی آدمی پر پڑی؟“ آدم نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ ویران معلوم ہوتا ہے۔“

آدم چکر لگا رہا تھا۔ اسے اچانک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جنگی مہم پر طیارے کو لے کر بمباری کے لئے نکلا ہو۔ پھر اس نے رن وے پر طیارے کو اتار لیا۔ طیارہ کچھ دور تک دوڑتا رہا پھر رک گیا۔ بیکر اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ آدم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

آدم نے نشست کے نیچے ہاتھ گھسا کر پستول تھام لیا۔ فیصلے کا لمحہ آپہنچا تھا۔ یہ ایک مناسب ترین موقع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہچکچاہٹ سے کام لیا اور وقت ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔ اس کا دوران خون پھر تیز ہو گیا۔ دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ بمشکل تمام اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور ٹھوس لہجے میں بولا: ”بیکر! اب جو قدم میں اٹھانے والا ہوں، اس پر مجھے تمام عمر افسوس رہے گا مگر کیا کروں۔ حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہوں۔ مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ کئی طرح سے اس بارے میں پریشان ہوں۔ میرے لئے یہ بہترین موقع ہے کہ اپنی تمام مشکلات اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر لوں۔“

بیکر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات عیاں تھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں کیونکہ آدم کی باتیں اس کے پلے نہیں پڑی تھیں۔ اس نے آدم کو نشست کے نیچے سے پستول نکالتے دیکھا تو حیران اور ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آدم نے ہاتھ بلند کیا اور گولیاں اپنے پارٹنر کے سینے میں اتار دیں۔ وہ ایک منٹ تک ساکت و صامت بیٹھا رہا پھر اس نے حواس درست کئے اور ادھورے کام کو مکمل کرنے لگا۔ اس نے احتیاط سے تابوت کھولا اور مسز ہورشن کی لاش کو باہر نکال لیا پھر اس نے تابوت میں لگے ہوئے کشن اکھاڑ دیئے اور بیکر کی لاش کو پشت کے بل لٹا دیا۔ کسی مشین کی سی مستعدی سے اس نے سارا خون صاف کیا اور خون آلود کپڑے بیکر کی لاش کے برابر ٹھونس دیئے۔

کشن بیکر کی لاش پر ڈال کر آدم نے مسز ہورشن کی لاش کو واپس

تابوت میں لٹا دیا۔ لاش ابھری ہوئی لگ رہی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ لاش کے نیچے کچھ ہے۔ مسز ہورشن کی لاش دوبارہ تابوت سے نکال کر اس نے بیکر کی لاش پر پڑے ہوئے کشن اٹھالئے اور اطراف کے کشن بے دردی سے پھاڑنے لگا۔ آدم نے اس مرتبہ مسز ہورشن کے مردہ جسم کو لٹایا تو خاصا فرق محسوس ہوا۔ اب پہلے کی سی بات نہیں رہی تھی۔ ایک نظر ڈالنے سے کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آدم نے ڈھکن مضبوطی سے تابوت پر جما دیا اور واپس پائلٹ کی سیٹ پر پہنچ گیا۔

آدم نے ایک مرتبہ پھر اپنے حواس درست کئے۔ طیارے کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے رن وے پر دوڑانے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد طیارہ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے ریڈیو پر بین برج کے ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کر لیا۔

بعد کو حالات وہی رہے جس کا منصوبہ آدم نے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ تدفین کمپنی کے آدمی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ وہ عجلت میں معلوم ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو سے آدم کو معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن پر ان کا پسندیدہ میچ آنے والا تھا اور وہ جلد از جلد مسز ہورشن کے تابوت کو دفنا کر اپنے گھروں کو پہنچ جانا چاہتے تھے۔

واپسی میں آدم نے بیکر کا کیمپنگ کا سامان نیچے پہاڑیوں میں گرانے کا فیصلہ کیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ اس کا یہ قدم خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ طیارے کو کسی اور سمت لے جا کر سامان دفن کر سکتا تھا۔

آدم کے دل و دماغ پر خوف کا غلبہ تھا اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ بیکر کے قتل کا راز فاش ہو جائے گا اور وہ عمر بھر جیل میں مشقت کرتا رہے گا۔ سنیچر کو وہ ساری رات اسی فکر میں سو نہیں سکا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور وہسکی کی آدھی بوتل چڑھا گیا۔ اتوار بھی اسی فکر اور پریشانی میں گزرا۔ شراب پی پی کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس نے بیکر کے بارے میں کئی ڈراؤنے خواب دیکھے۔ آخری ڈراؤنا خواب یہ تھا کہ بیکر دو پولیس والوں کو اسے گرفتار کرانے لایا تھا۔ سرخ سرخ خون اس کے سینے کے دو سوراخوں سے ابل رہا تھا۔ آدم نے ایک چیخ ماری اور اٹھ بیٹھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور کپڑے پسینے میں تربتر تھے۔ مسز ہورشن کی لاش بھی اسے خواب میں چلتی پھرتی دکھائی دی تھی۔

اتوار کی شب بھی بے آرام اور پریشان کن ثابت ہوئی۔ وہ خوف سے کانپتا رہا۔ پیر کی صبح اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دو اسپرین کی ٹکیاں نگلیں اور ایک دوسری ریاست کے مجوزہ دورے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس کا اعصابی تناؤ ختم ہو گیا۔ ہوائی جہاز میں دوسرا کوئی فرد موجود نہیں تھا اور وہ خود کو محفوظ تصور کر رہا تھا۔ زمین پر اس کے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا مگر ہزاروں فٹ اوپر اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ زمین پر خوف نے اس کا برا حال کر دیا تھا مگر فضا میں وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے جنگ کے ایام یاد آ رہے تھے جب وہ اپنے بمبار طیارے میں دشمن کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ چند گھنٹے بعد ایک بار پھر اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود سگریٹ نہیں سلگا سکا۔

پیر کی دوپہر آدم فارغ ہوا تو اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ طیارے کو واپس لے جا سکتا پھر اس پر تھکن بھی سوار تھی۔ اس نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور قریبی بار میں پہنچ کر جام پر جام چڑھانے لگا۔ وہ نشے میں دھت ہو گیا اور بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کپڑوں اور جوتوں سمیت اپنے بستر پر گرا اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

منگل کے روز آدم کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ گھر پہنچے گا تو پولیس کے حکام اس کے استقبال کو موجود ہوں گے اور پھر سوالات کا تکلیف دہ اور اذیت ناک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس کا طیارہ رن وے پر اترا تو اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑانے لگا۔ جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ اس کی کنپٹیوں پر دباؤ بتدریج بڑھنے لگا لیکن وہ گھر پہنچا تو کوئی بھی اس کا منتظر نہیں تھا۔ صورتحال ویسی ہی تھی۔ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

بدھ کی صبح دفتر پہنچ کر آدم نے فیصلہ کیا کہ کسی کو بیکر کی گمشدگی سے مطلع کر دینا چاہئے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس کا دل ڈوب رہا تھا لیکن ایسا کرنا بےحد ضروری تھا۔ اس نے انتہائی دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا۔ اس نے شمال مشرق میں واقع فاریسٹ رینجر اسٹیشن کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ بیکر کس جانب سے جنگل میں داخل ہوا تھا اور یہ کہ وہ پروگرام کے مطابق گھر نہیں پہنچا ہے۔ متعلقہ افسر نے آدم کو بتایا کہ اس طرف جنگل میں برفباری ہوئی ہے لہٰذا بیکر کی تلاش میں بےحد دشواری پیش آئے گی مگر وہ اس کے پارٹنر کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور اسے صورت حال سے باخبر رکھیں گے۔

آدم کی حالت اس وقت اور بھی غیر ہو گئی۔ جب ایک پولیس افسر نے اسے فون کر کے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی۔ وہ اس سے چند سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ اس نے پولیس کو وہی کہانی سنا دی جو وہ فاریسٹ آفیسر کو سنا چکا تھا۔ چند روز بعد پولیس نے آدم کو فون کر کے بتایا کہ انہوں نے اس کی بیان کردہ کہانی کی تفتیش کی ہے اور انہیں اس کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ آدم کی جان میں جان آئی۔ لاش کے ملنے تک انہیں کسی گڑبڑ کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس امر کا ذرہ سا بھی امکان نہیں تھا۔ آدم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور استدعا کی کہ انہیں کوئی نئی بات معلوم ہو تو اسے فوراً آگاہ کریں۔

تین ہفتے بعد آدم کا خوف کم ہونا شروع ہوا پکڑے جانے کے خدشات دن بدن معدوم ہونے لگے۔ شمال مشرق میں زبردست برفباری ہوئی تھی۔ جس کے نتیجے میں بیکر کی تلاش ختم کر دی گئی تھی۔ آدم کو یقین تھا کہ موسم بہار میں حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس نے انشورنس کمپنی سے ایک لاکھ ڈالر

کا مطالبہ کیا اور ایک ہفتے میں چند رسمی کارروائیوں کے بعد رقم اسے ادا کر دی گئی۔ آدم کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس نے معمولی مشاہرے پر ایک استقبالیہ کلرک کو ملازم رکھ لیا تاکہ وہ آرڈر وصول کرتی رہے۔ اس نے بیکر کی مقرر کردہ قیمتوں کو دوگنا کر دیا لیکن اس سے آرڈرز پر کوئی فرق نہیں پڑا دن بدن اس کا کام بڑھنے لگا۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ کمپنی کے اکاؤنٹ میں دھڑا دھڑ چیک جمع ہونے لگے۔ اس کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

بیکر کے قتل کا خیال جب بھی آدم کے ذہن کو پریشان کرتا۔ وہ جنگ کے دنوں کے بارے میں سوچنے لگتا۔ ان دنوں اس نے سینکڑوں بم گرائے تھے اور ہزاروں افراد کو ہلاک کیا تھا۔ بیکر کو اس نے اپنی ضرورت کے تحت قتل کیا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے یہ ٹھاٹ باٹ نہ ہوتے۔ اس کا کاروبار ترقی نہ کر رہا ہوتا۔ بیکر کے قتل کو اس نے ان ہزاروں اموات میں شامل کر لیا تھا جو اس کی بمباری کے نتیجے میں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اندر کے اس آدمی کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا جو اکثر اسے بیکر کے قتل پر لعنت ملامت کرتا تھا۔ اس نے اپنے دماغ سے جرم کے احساس کو مٹا دیا تھا اور اسی بنا پر اسے نیند بھی آنے لگی تھی۔ وہ سکون سے سونے لگا تھا۔ ڈراؤنے خواب بھی اسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ کھانا وہ پیٹ بھر کر کھانے لگا تھا برسوں بعد اسے اتنا آرام اور سکون میسر آیا تھا۔

آدم ایئر ٹرانسپورٹ کمپنی ترقی کے زینے طے کر رہی تھی۔ اسے علاقے کی سب سے بڑی کمپنی کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ آدم نے ایک نیا ہوائی جہاز خرید لیا تھا اور ایک تجربے کار ہوا باز کی خدمات حاصل کر لی تھیں وہ خود بھی ہوائی جہاز چلاتا تھا کیونکہ فضائے بسیط میں اسے بڑا سکون ملتا تھا نئے سال کا آغاز ہوا تو آدم کو مقامی چیمبر آف کامرس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ ذمے داریوں اور مصروفیتوں میں بیکر کے قتل کو فراموش کر چکا تھا۔ اس بارے میں اس نے کئی دلیلیں اور تاویلیں گھڑلی تھیں جن سے وہ خود کو بہلا لیا کرتا تھا اس راز کو اس نے جنگ کی یادوں میں دفن کر دیا تھا۔

وہ بیکر کے خیال سے مکمل طور پر پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ لوگ اکثر بیکر کا ذکر چھیڑ دیتے تھے اور یوں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مگر اس عرصے میں اس نے اپنے دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ بہت جلد وہ اس منحوس خیال سے چھٹکارا حاصل کر لیتا تھا۔

ایک روز آدم صبح آرڈر چیک کرنے دفتر پہنچا تو استقبالیہ کلرک مسکرا کر بولی ”جی ہاں۔ دو آرڈر موجود ہیں۔ ایک آرڈر سٹن کا ہے اور دوسرا بین برج کا۔“

آدم کا سر چکرا گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اپنی حالت پر قابو پایا۔ بیکر کی موت کو ایک سال ہو چکا تھا اور اس دوران بین برج کا یہ پہلا آرڈر موصول ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ وہ بین برج کا کام خود کرنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”سٹن کا آرڈر میں نمٹاؤں گا۔ ہاورڈ کو تم میرے کمرے تک بھیج دو۔ وہ بین برج چلا جائے گا مجھے اس سلسلے میں اس سے بات کرنا تھی۔“

پندرہ منٹ بعد پائلٹ ہاورڈ اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ آدم نے اسے بتا دیا کہ بین برج کا کام اسے نمٹانا پڑے گا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ ہاورڈ نے کہا۔

اس روز سہ پہر کو ہاورڈ کے آنے سے پہلے آدم دفتر پہنچ چکا تھا۔ وہ مہینے بھر کے آرڈرز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس مہینے تو اس نے سارے ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ تھوڑے عرصے میں اس نے بڑی تیزی سے کاروبار کو مستحکم کر لیا تھا اور وہ اس پر بجا طور پر ناز کرتا تھا۔ بیکر کو وہ دل و دماغ سے نکال چکا تھا اسے معلوم تھا کہ بیکر کی موت کا خیال اسے پریشان نہیں کر سکتا۔

ہاورڈ جلد ہی لوٹ آیا۔ وہ نوجوان اور محنتی پائلٹ تھا۔ اس پر پورے طور پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ کمپنی کو ایسے ہی ذہین اور محنتی آدمی کی ضرورت تھی۔

”تمہارا دورہ کیسا رہا؟“ آدم نے پوچھا

”جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گا۔ آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔“ ہاورڈ نے کہا۔

”کیوں نہیں کروں گا؟ کیا خراب موسم میں پھنس گئے تھے؟“

”نہیں موسم تو بے حد خوشگوار تھا۔ بس سامان نے پریشان کر دیا تھا۔“

”تم وہاں کیا سامان لے کر گئے تھے؟“

”میں وہاں کوئی سامان لے کر نہیں گیا تھا لیکن وہاں سے جو کچھ میں لایا ہوں۔ آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔ کل صبح میں سب سے پہلے طیارے کے اندر جراثیم کش دوائیں چھڑکوں گا۔ موجودہ صورت میں تو میں ہوائی جہاز نہیں چلا سکتا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“ آدم نے جلدی سے کہا۔

”سال بھر پہلے ایک عورت کا انتقال آپریشن ٹیبل پر ہو گیا تھا۔ اب انہیں ڈاکٹر پر غفلت اور لاپرواہی کے سلسلے میں مقدمہ چلانے کا خیال آیا ہے عورت کے ورثا نے عدالت سے لاش کے پوسٹ مارٹم کا حکم نامہ حاصل کر لیا ہے لہٰذا تابوت قبر سے نکال کر یہاں لانا پڑا۔ میں وہ تابوت ہسپتال پہنچا کر آ رہا ہوں۔ لاش کی سڑاند نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ ممکن ہے میں بیمار پڑ جاؤں۔“

لیکن آدم اس سے پہلے بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور جسم کپکپا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔

اقبال پاریکھ

ایک مجرم کی کہانی جس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت موجود تھا

”تو تم گزشتہ رات گیارہ بجے پلازہ ہوٹل سے میلوں دور تھے؟“ لیفٹیننٹ فلیچر نے سامنے بیٹھے ہوئے پریشان حال شخص کا جواب دہرایا۔

”بالکل۔ میں اس ہوٹل کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔“ ٹامی سن نے سر جھکا کر کہا۔ ”میں گزشتہ شب گیارہ بجے پلازہ ہوٹل سے بیس میل دور تھا۔ کیا آپ میرا یقین نہیں کریں گے؟“

فلیچر نے سگریٹ کا ٹوٹا ماربل کی ایش ٹرے میں بجھایا اور دفتر میں موجود نوجوان معاون کورسی ڈون کو استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ایک لحاظ سے اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت ہے۔“ کورسی نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹامی سن اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے تیز و تند لہجے میں کہا۔ ”ایک لحاظ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے جو گواہ پیش کیا ہے، کیا وہ کافی نہیں ہے؟ تم اپنے ساتھی پولیس افسر کے ساتھ اس سے مل چکے ہو۔ کیا شرلے نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے شب اس کے کمرے میں اس کے بستر پر گزاری ہے؟“

کورسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کرسی کے چوڑے ہتھے پر رکھے ہوئے پیڈ پر پنسل سے بہلے ہولے کچھ لکھ رہا تھا۔

”کیا تم ہمیں احمق سمجھتے ہو؟ کیا ہمیں شرلے ایسی عورت کی شہادت پر اعتبار کر لینا چاہئے؟“ فلیچر نے غصے سے کہا۔ ”اس قسم کی عورتیں چند سکوں کے عوض سب کچھ کر سکتی ہیں۔ مجھے اس طوائفہ پر رتی برابر اعتبار نہیں ہے۔“

ٹامی نے سہاری شانے لاپرواہی کے انداز میں ہلا دیئے۔ وہ چند لمحے چپکا رہا۔ پھر زہر خند سے کہا: "تم لوگ شریف شہریوں کو پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ تم نے کڑکڑاتی سردی میں صبح پانچ بجے جگا دیا اور اب اُوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔ مجھے بلاوجہ......"

"ہم نے تمہیں بلاوجہ پریشان نہیں کیا" کورسی نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "اس شہر میں سینکڑوں ذات شریف ہیں جنہیں ہم یہاں لا سکتے تھے لیکن ہم نے صحیح آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تم نے مجھے اور میرے ساتھی کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بتا دیا کہ شام چھ بجے سے رات دو بجے تک تم کہاں تھے۔ اس بے تابی کی وجہ بتا سکتے ہو؟"

لیفٹیننٹ فلیچر نے بڑے تحمل سے کہا: "تمہارے ساتھی پر یاد آیا، تم پیٹر کے کمرے میں جا کر دیکھو، ممکن ہے وہ واپس آچکا ہو۔ میرا خیال ہے وہ مزید کوئی اہم خبر لایا ہوگا۔"

کورسی نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیفٹیننٹ کے دفتر سے نکل کر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا پھر نپے تُلے قدم اٹھاتا رہزنی کے شعبے کی جانب بڑھ گیا۔

"میرا خیال ہے معاملہ پھر سے شروع کیا جائے۔" فلیچر نے کہا۔ "اب سے چند گھنٹے قبل گیارہ بجے شب دو آدمی چہروں پر نقاب ڈالے ہاتھوں میں پستولیں لئے پلازہ ہوٹل کے ہال میں داخل ہوئے انہوں نے استقبالیہ کلرک کے ہاتھ اٹھوا دیئے اور اسے تجوری دکھانے کا حکم دیا جہاں ہوٹل کے مسافر نقدی اور زیورات وغیرہ رکھتے ہیں، پھر......؟"

"ہاں ہاں ـــ" ٹامی نے ہاتھ اٹھا کر ناگواری سے کہا: "یہ واقعہ تم پہلے ہی مجھے تفصیل سے سنا چکے ہو ـــ"

"میں اسی وقت ہوٹل کا محافظ ہال میں پہنچ گیا ـــ" فلیچر نے ٹامی کی مداخلت کو نظر انداز کر کے کہا: "ان میں گولیوں کا تیز ترین تبادلہ ہوا۔ ایک دوسرے پر اندھا دھند فائر کئے گئے۔ دونوں بدمعاش صدر دروازے کی طرف بھاگے لیکن ایک بدمعاش کو باہر کھڑی ہوئی کار تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ ہوٹل کے محافظ کی گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکی تھی وہ منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ اس کا ساتھی کار میں بیٹھ گیا جو فوراً ہی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ہلاک ہونے والے بدمعاش کو شناخت کر لیا گیا۔ وہ نامی گرامی مجرم ریمنڈ تھا۔ تمہارا پرانا دوست اور جیل کا ساتھی ریمنڈ ـــ اب تم یہاں اپنی موجودگی کا سبب سمجھ گئے ہو گے؟"

ٹامی نے وحشت کے عالم میں انگلیاں بالوں میں پھیریں اور مستحکم لہجے میں بولا: "تمہارے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں پلازہ ہوٹل کی واردات میں شریک تھا۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میں شام سات بجے سے صبح دو بجے تک شرلے کے کمرے میں موجود تھا۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکتے ہو۔"

فلیچر نے پشت کرسی سے ٹکائی اور دفتر کی چھت کو گھورنے لگا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے پاس واقعی ثبوت نہیں تھا سوائے اس کے کہ ریمنڈ اس کا پرانا دوست اور جیل کا ساتھی تھا۔ ڈکیتی میں ٹامی کی شرکت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایک اور پتہ بھی تھا۔

کورسی واپس دفتر میں آگیا وہ قدرے پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چہرے پہ ہی کہا: "پیٹر آگیا ہے جناب! بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔"

"اوہ! میں سمجھ گیا۔" فلیچر نے کہا: "زخم کس ہتھیار سے.... آئے ہیں ـــ؟"

"بڑا اور تیز دھار چاقو استعمال کیا گیا تھا جناب! پوری تہ سینے اور پیٹھ پر اسے گھونپا گیا ہے۔" کورسی اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور پنسل سے پیڈ پر لکھنے لگا۔

ٹامی نے باری باری دونوں افسروں کا جائزہ لیا اور جھلّا کر بولا۔ "میری سمجھ میں یہ معمّہ نہیں آیا۔ آخر بات کیا ہے؟ کیا کسی بھی غریب آدمی کو واردات میں ملوّث کرنا مقصود ہے؟"

فلیچر نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا: "میں تمہیں آخری موقعہ دے رہا ہوں۔ سیدھی طرح اعتراف کر لو۔ کیا تم ریمنڈ کے ساتھ تھے ـــ؟"

"بکواس!" ٹامی نے زہر خند سے کہا: "میں جا رہا ہوں ـــ" یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

"واپس اپنی جگہ بیٹھ جاؤ ـــ" فلیچر غرّایا: "کورسی، اگر یہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرے تو بلا تکلف دو چار کرارے ہاتھ جما دینا۔"

ٹامی بڑبڑاتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارے متعلق پوری طرح اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔" فلیچر نے کہا: "تمہارا دعویٰ ہے کہ تم شام سات بجے سے رات گئے تک شرلے نامی لڑکی کے ساتھ تھے......؟"

"میں دو بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور مجھے سخت نیند آرہی تھی لہٰذا میں گھر آتے ہی بستر پر گر گیا۔ آفیسر کورسی اور اس کے ساتھی نے دروازہ دھڑ دھڑایا تو میری آنکھ کھلی۔ مجھ جیسے ہارے شخص کو پریشان کر کے تم لوگوں کو کیا حاصل ہوا ہے ـــ؟"

"کیا تم قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتے ہو؟" فلیچر نے پوچھا۔

"پچھلے ایک گھنٹے سے میں کیا کہہ رہا ہوں؟" ٹامی کی نگاہیں کورسی پر جمی ہوئی تھیں جو تیزی سے ایک نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ ٹامی بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

لیفٹیننٹ فلیچر نے کورسی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا: "کورسی! تم اور پیٹر ٹامی کے فلیٹ پر گئے تھے۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے وہاں جو کچھ پیش آیا مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"

"ہم اس کے فلیٹ پر پہنچے تو یہ سو رہا تھا۔" کورسی نے کہا: "ہمیں کئی بار دروازے کو پیٹنا پڑا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے ہمیں شرلے کے ہاں رات دو بجے تک رکنے کے بارے میں بتا دیا۔ ہم نے اسے لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی اور پھر اسے لے کر ہیڈ کوارٹرز کی طرف چل دیئے۔ راستے میں اس نے پھر اصرار کیا کہ وہ دو بجے تک شرلے کے فلیٹ پر تھا۔ ہم نے کار ایک میڈیکل اسٹور پر روک لی جو رات بھر کھلا رہتا ہے پیٹر نے وہاں سے شرلے کے فلیٹ پر فون کیا اور......"

"اور اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں رات دو بجے تک اس کے پاس موجود رہا تھا۔" ٹامی نے غصے سے اس کی بات کاٹ کر کہا: "لیکن اس کے باوجود تم مجھے یہاں گھسیٹ لائے ـــ یہ کہاں کی شرافت ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ پیٹر نے تمہاری محبوبہ شرلے سے بات نہیں کی تھی۔" کورسی نے بڑے سکون سے کہا: "اس نے عمارت کی مالکہ سے بات کی تھی ـــ"

ٹامی نے تعجب خیز لہجے میں کہا: "میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔ کیا......؟"

"پیٹر نے شرلے کا نمبر ڈائل کیا تھا۔" کورسی نے ہاتھ کے اشارے سے ٹامی کو خاموش کر کے کہا: "مگر اس نے ریسیور نہیں اٹھایا گھنٹی بجتی رہی۔ مجبوراً پیٹر نے عمارت کی مالکہ سے رابطہ قائم کر کے صورتحال سے مطلع کر دیا۔" کورسی نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے چھلے بنانے لگا۔

"بات دراصل یہ ہے۔" ٹامی نے جلدی سے کہا: "شرلے گہری نیند سونے کی عادی ہے۔ وہ گھوڑے بیچ کر سوتی ہے فون کی گھنٹی اس پر اثر انداز نہیں ہوئی ہوگی لیکن تم لوگوں نے اس سے رابطہ تو قائم کر لیا ہوگا ـــ؟"

کورسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے غور سے لیفٹیننٹ فلیچر کو دیکھ رہا تھا۔

"اوہ ہاں ـــ" فلیچر نے کہا: "افسران اس تک نہیں پہنچ سکے تھے.... ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم شرلے کے ساتھ رات گزارنے پر اصرار کیوں کر رہے ہو۔ تم کئی بار کہہ چکے ہو کہ شام سات بجے سے رات دو بجے تک تم اس کے فلیٹ پر تھے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ٹامی نے اضطراری کیفیت میں قمیض کا کالر مروڑتے ہوئے کہا: "یقیناً میں اس کے فلیٹ پر تھا۔ وہ اس امر کی گواہی دے گی۔"

کورسی نے پیڈ پر کچھ لکھا۔ پھر قلم رکھ کر بولا: "میں تمہیں بتاتا ہوں لیفٹیننٹ! غالباً کسی نے ٹامی کو شرلے کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ لیا ہوگا یہ بات چونکہ ٹامی کے علم میں بھی ہے لہٰذا وہ اس کے فلیٹ پر رکنے پر اصرار کرتا رہا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اسے احساس نہیں ہے کہ میڈیکل سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے پولیس سرجن ان دنوں صحیح فیصلہ کرتے ہیں ان کی بات غلط ثابت نہیں ہوتی۔ ان کے تعین کئے ہوئے موت کے وقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

لیفٹیننٹ نے ٹامی پر توجہ دیئے بغیر کہا: "ہاں تمہاری بات.... قرینِ قیاس معلوم دیتی ہے اس نے سوچا ہوگا کہ اس بارے میں آسانی سے ہمیں بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔"

"یہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟" ٹامی نے چلّا کر کہا۔ وہ اچھل پڑا اور سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ "تم لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟"

"بیٹھ جاؤ ـــ" فلیچر نے کہا: "میں تمہیں صرف ایک خبر سنانا چاہتا ہوں بیٹے۔ ہم نے دو رہزن بدمعاشوں سے ہوٹل کی ڈکیتی کے بارے میں پوچھ گچھ کی ہے جن میں تم بھی شامل ہو لیکن تمہارے پاس واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت موجود ہے تم رات شرلے کے فلیٹ پر موجود تھے۔ سارجنٹ پیٹر اس امر کی تفتیش کر چکے ہیں۔"

ٹامی آہستگی سے نشست پر بیٹھ گیا جیسے اس کے پیروں میں جان نہ رہی ہو۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ اس نے آستین سے منہ پونچھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا: "پھر کیا ہوا ـــ؟ میری سمجھ میں نہیں......"

"تم احمق ہو ٹامی ـــ" کورسی نے کہا: "تمہارا کیا خیال ہے پیٹر آدھے گھنٹے سے کہاں تھا؟"

ٹامی کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں چند لمحے لگے اور اس کا چہرہ کفن کی طرح سفید پڑ گیا۔

"تمہارا مطلب ہے...... تم لوگ چاقو گھونپے جانے کی بات شرلے کے بارے میں کر رہے تھے ؟"

کورسی اور فلیچر خاموشی سے اسے بغور دیکھتے رہے۔

"تم دونوں خاموش کیوں ہو ؟ بولتے کیوں نہیں ہو ؟"

"میں طویل عرصے سے انتظار کر رہا تھا۔" بالآخر فلیچر نے کہا "میں کسی موقع کی تلاش میں تھا تاکہ عمر بھر کے لئے تمہیں جیل بھجوا سکوں اب مجھے وہ موقع مل چکا ہے جب سے تم یہاں آئے ہو، ہم تمہارے گرد رسی باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب گرہ پڑ چکی ہے۔ تم بُری طرح جکڑے جا چکے ہو۔"

ٹامی مغلظات بکنے لگا، پھر اس نے کہا "اس لڑکی نے مجھے بُری طرح پھنسا دیا ہے۔ پتہ نہیں کتنے مردوں سے اس نے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ سبھی جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن کوئی دل جلا اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ یہ کام بھی کل رات ہی ہونا تھا۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔" فلیچر نے کہا "تم ایسا کیوں نہیں۔۔۔"

"میں کل رات اس کے فلیٹ پر نہیں تھا۔" ٹامی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے یہ پروگرام اس سے فون پر طے کر لیا تھا۔ ہاں! میں ہوٹل کی واردات میں شامل تھا۔ بے چارے فرینچی اور میں نے مل کر ہوٹل میں ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن ہوٹل کے محافظ نے عین وقت پر سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔"

فلیچر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا "گویا تم پٹری بدل رہے ہو ؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ہوٹل کی واردات میں شامل تھے ؟ تم قتل کا الزام اپنے سر سے ہٹانے کے لئے ڈکیتی میں ملوث ہونا چاہتے ہو لیکن ہم تمہارے چکر میں آنے والے نہیں ہیں۔ تم قسم کھا کر کہہ چکے ہو کہ تم رات دو بجے تک شرلے کے فلیٹ میں موجود تھے۔"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں لیفٹیننٹ۔ کئی ہفتوں سے میں نے شرلے کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے میں نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ میں نے جائے واردات سے عدم موجودگی کی گواہی کے لئے اسے معقول معاوضے کی پیشکش کی تھی۔ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی ؟"

کورسی نے نوٹ بک زانو پر ماری اور بولا "اس نوٹ بک میں تو کچھ اور لکھا ہوا ہے۔"

"خدا کے لئے سنجیدگی سے میری بات سن لو۔" ٹامی نے تھوک نگل کر کہا "واردات میں جو پستول میں نے استعمال کیا تھا اس کے بارے میں میں بتا دوں گا کہ میں نے کہاں پھینکا تھا۔ پستول سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ میں ہوٹل کی واردات میں شامل تھا میرے پستول کی گولیاں ہوٹل کی دیواروں میں پیوست ملیں گی، تم چاہو تو میرے پستول سے انہیں ملا سکتے ہو۔ میں نے قتل نہیں کیا لیفٹیننٹ۔ شرلے کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اگر تم شرلے کے قتل سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو تمہیں مکمل ثبوت دینا پڑے گا بیٹے۔" فلیچر نے کہا "ورنہ تمہیں جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

ٹامی کھڑا ہو کر بولا "میں تمہیں اسی وقت اس جگہ لے چلوں گا جہاں میں نے پستول چھپایا ہے۔ خدا کے لئے مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع تو دو۔۔۔"

لیفٹیننٹ متذبذب تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا "کورسی! تم اور پیٹر اس احمق کو جہاں یہ چاہے لے جاؤ لیکن یہ کسی قسم کی گڑبڑ کرے تو رعایت مت کرنا۔ اچھی طرح ٹھکائی کر دینا اگر یہ پستول برآمد کرانے کا بہانا کرے تو اسے خاص طریقے سے یاد دلا دینا۔"

کورسی اور ٹامی کے رخصت ہونے کے ایک منٹ بعد لیفٹیننٹ فلیچر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ایسا کم ہی ہوا تھا کہ کسی قاتل نے اپنے آپ کو تختۂ دار تک پہنچایا ہو۔ ظاہر ہے ٹامی کو حقیقت کا علم نہیں تھا اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل کے محافظ کو فائرنگ میں گولی لگ گئی تھی اور وہ جانبر نہیں ہو سکا تھا۔ ٹامی کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا اور اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی!"

ایک رزمیہ گیت گنگناتے ہوئے فلیچر اٹھ کھڑا ہوا، دروازے کے پاس پہنچا اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا وردی میں ملبوس ایک مستعد سپاہی باہر کھڑا ہوا تھا۔

"سنو ولسن!" لیفٹیننٹ نے کہا "حوالات سے اس حرافہ شرلے کو یہاں لے آؤ۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس عورت کو جھوٹ بولنے کا ذرا بھی سلیقہ نہیں ہے اور مجھے اس قسم کے لوگ پسند نہیں ہیں۔۔۔"

بدھ کی سہ پہر دوکان بند ہونے سے کچھ ہی دیر قبل، سپاٹ چہرے والا دہ بھاری بھرکم اجنبی ایلائٹ باربر شاپ میں داخل ہوا، تو آسا اپنے پرانے استرے کو تیز کرتے ہوئے گنگنانے میں مصروف تھا بوٹ پالش کے اسٹینڈ پر لیوری تنہا بیٹھا، اپنے خستہ حال جوتوں کو ایک میلے کچیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکی بھیگی ہوئی پیشانی سے پسینے کے چمکدار قطرے گر رہے تھے۔ وہ ایک ایلیم اسٹول پر بیٹھا تھا جس کی تین ٹانگیں تھیں۔ پسینے کی وجہ سے اس کا سیاہ چہرہ سنگِ سلیمانی کی طرح چمک رہا تھا۔

آسا سوچ رہا تھا کہ درجۂ حرارت مزید نہیں بڑھے گا مکھیاں گرمی کے نشے سے سرشار دکھائی دے رہی تھیں حالانکہ چھت کا پنکھا چل رہا تھا پنکھے کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ بلکہ اس کے پر ہوا میں تیرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

عقبی دیوار میں لگے ہوئے آئینے میں آسا نے اجنبی کو پلٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا۔ اجنبی دروازہ بند کر کے وہیں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے لیوری اور بوٹ پالش اسٹینڈ پر سرسری نگاہ ڈالی۔۔۔۔ پھر اس کی نگاہ حجام کی کرسی اور انتظار کے لیے رکھی ہوئی سیٹوں پر سے ہوتی ہوئی عقبی حصّے کے ایک دروازے پر جم گئی۔ یہ آسا کی رہائش گاہ کا دروازہ تھا۔ کاؤنٹر پر استرے اور قینچیاں قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ شوکیسوں سے نئے اور پرانے اوزار دکھائی دے رہے تھے۔

جب اجنبی ہر چیز کا جائزہ لے چکا تو آسا نے پذیرائی کے انداز میں کہا "واقعی آج بہت گرمی ہے۔ اگر کوئی شخص دیر تک دھوپ میں کھڑا رہے تو یقیناً اس کے جسم پر آبلے پڑ جائیں گے"

اجنبی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ بلکہ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آسا کے قریب آگیا جو اس وقت قطار میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے پہلی کرسی کے عقب میں ایستادہ تھا۔ اس نے موسم کے اعتبار سے ڈھیلی ڈھالی قمیص پہن رکھی تھی۔ اور آنکھوں پر کریم کلر کا چشمہ تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پچاس کے لگ بھگ تھا چہرے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے کوئی وزنی چیز مار کر چپٹا کر دیا ہو۔ ناک چپٹی اور چہرے پر پھیلی ہوئی تھی جبکہ ہونٹ بھی ابھرے ہوئے نہیں تھے۔

آسا جس کرسی کے قریب کھڑا تھا۔ شوکیس اس کے بائیں جانب تھے اجنبی وہیں رک گیا اور غور سے ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے جو شوکیس تھا۔ اس میں پرانے طرز کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ اجنبی نے ہاتھ بڑھا کر نقرئی دستے والا ایک برش اٹھا لیا۔۔۔۔ پھر وہ ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے بالائی لب میں ہلکی سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ خم کھا کر دوسرے لب سے قدرے اوپر اٹھ گیا۔ یہ اپنی نوعیت کی عجیب ترین مسکراہٹ تھی۔

"تم نے بہت اچھی چیزوں کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔" اجنبی نے کہا۔ اب تک آسا اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ شمالی علاقے کا رہنے والا ہے۔ ممکن ہے اس کا تعلق نیویارک سے رہا ہو۔ ڈی۔ وی پرانی۔۔۔ دو علاقوں کے باسی اس لہجے میں بات کرتے سنائی دیتے

بل پروف تیزی

شغبّر

حماد مون

وقت کے ساتھ
پرانی روایتوں کے
بُت ٹوٹ رہے ہیں،
تعصب بھی ختم ہو رہا ہے

تھے جس لہجے میں وہ اجنبی بول رہا تھا۔ "میرا خیال ہے آج کل ایسی پرانے زمانے کی چیزیں زیادہ تر دوکانوں پر نہیں ملتیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" آسا نے تائید میں کہا۔ "ہام کاؤنٹی میں میرے علاوہ ایسا سامان کسی اور کے پاس نہیں ہے۔"

"کیا یہ سامان بہت زیادہ فروخت ہوتا ہے؟"

"اتنا زیادہ بھی نہیں۔ جو برش تمہارے ہاتھ میں تھا، یہ گذشتہ دو سال سے یہاں پڑا ہے۔ میرے پاس کچھوے کی کھال کے دستے والے برش بھی موجود ہیں لیکن آج کل لوگ ایسی قدیم اشیا کا استعمال اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔"

"مجھے یہ سن کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ آج کل تو ہر کسی کو جدید قسم کے کباڑ خانے سے دلچسپی ہے۔ ہر کوئی جدید نظریات کا حامی بنا پھرتا ہے۔ اگر لوگ پرانی قدروں سے چمٹے رہیں تو انہیں زیادہ فائدے کا احساس ہوگا۔"

"بہرحال....!" آسا نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔"

"لیکن کوئی بہتر تبدیلی نہیں ہوتی۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض اوقات تو تبدیلیاں اپنی اہمیت منوائے بغیر نہیں رہتیں۔ آج کل جو سلو ٹیپ چلا ہوا ہے۔ اس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو ایک خرید لو۔ زیادہ مہنگا بھی نہیں ہے۔"

"نہیں" اجنبی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور شوکیس کے قریب سے ہٹ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آسا کی قیام گاہ کے دروازے تک پہنچا۔ دروازے میں رک کر اس نے کمرے کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اور آسا کی طرف پلٹ کر دریافت کیا۔

"تم یہیں رہتے ہو بڑے میاں؟"

"ہاں۔ کیا تمہارا تعلق مردم شماری کے محکمے سے ہے؟"

اجنبی کے حلق سے ایسی غراہٹ نکلی جیسے کسی کتے نے شکار کی بو محسوس کر لی ہو.... پھر وہ آسا کے قریب آگیا اور اس کی نگاہ دیوار گھڑی کی طرف بھٹک گئی۔ "پانچ بج رہے ہیں" اس نے کہا۔ "بیرونی دروازے پر جو اوقات کار درج ہیں، کیا تم اُن کی پابندی کرتے ہو؟"

"زیادہ تر میں ایسا ہی کرتا ہوں۔"

"آج کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟"

"اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں تمہارا کام کروں گا یا نہیں تو میرا جواب اثبات میں ہے۔ کیوں کہ میرا اصول ہے کہ اوقات کار ختم ہونے سے پہلے دکان میں داخل ہونے والے کو مایوس نہیں لوٹاتا۔"

"اوقات کار کے بعد کا کوئی کام تو نہیں لے رکھا؟"

آسا کی بھنویں کمان ہوگئیں۔ "میں دوکان بند کرنے کے بعد کسی کا کام کرنا پسند نہیں کرتا،" اس نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "کیا تم بال بھی کٹوانا چاہتے ہو؟ بال کافی لمبے ہو چکے ہیں اور کالروں سے نیچے دکھائی دینے لگے ہیں۔"

اجنبی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ سامنے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے سامنے ایک سائبان تھا جس کی وجہ سے دھوپ اندر نہیں آ رہی تھی۔ جب کہ دھوپ کی چمک کا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔ اس کھڑکی سے سنسان فٹ پاتھ کا صرف آدھا حصہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

آسا نے اپنے سفید چھدرے بالوں کو سنوارا۔ دکان میں یکایک ہی گہری خاموشی کا احساس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد جھاڑو کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ لیوری نے دکان کی صفائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ باہر وبلو اسٹریٹ بھی خاموشی میں لپٹی محسوس ہو رہی تھی۔ شدید گرمی کی وجہ سے ہر کوئی اپنے اپنے گھر میں دبکا بیٹھا تھا۔ پیدل چلنے والے تو درکنار کوئی کار یا گھوڑا گاڑی بھی سڑک پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

"میں نے پہلے تو تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔" آسا نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔ "کیا تم یہاں سے گذر کر کہیں آگے جا رہے ہو؟"

"ہاں ایک اعتبار سے تم یہ کہہ سکتے ہو۔"

"کہیں دور سے آئے ہو؟"

"بہت دور... دارالحکومت سے۔"

"اوہ، دارالحکومت سے۔ کتنی شاندار جگہ ہے وہ۔" آسا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، وے ویلی کے مقابلے میں دارالحکومت بہت اچھی جگہ ہے۔"

"ہاں... اور وہاں پر اس قصبے کے مقابلے میں حادثات و واقعات بھی زیادہ پیش آتے ہیں۔"

"لیکن اس کا انحصار تو اس بات پر ہے کہ تم ان حادثات اور واقعات کا کس حد تک اثر لیتے ہو۔"

"مثال کے طور پر...!" بھاری بھر کم شخص نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ گذشتہ ہفتے وہاں خاصا ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وے ویلی کا حجام آسا بیڈولی، اس معاملے میں بڑی حد تک ملوث تھا۔"

آسا نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر بعد اس نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تم جیسے آوارہ گرد کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

ایک بار پھر اجنبی کے بالائی لب نے خم کھا کر اٹھنے کی کوشش کی اور وہ دوسری بار اپنی نوعیت کی عجیب ترین مسکراہٹ دکھا کر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس قصبے کا حجام آسا، دارالحکومت

میں مقیم اپنے بھتیجے سے ملنے گیا تھا۔ چونکہ اس کا بھتیجا کام میں مصروف تھا۔ اس لیے چچا نے وقت گزاری کے لیے کتابوں کی دکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اسے کتابیں پڑھنے کا خاصا شوق معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک کھلے دروازے کی راہ داری میں اسے دو آدمیوں کے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔۔ یکایک ایک فائر ہوا اور پھر ریوالور ہاتھ میں لیے ایک آدمی دوڑتا ہوا دروازے سے نکلا۔ آسا نے صورتِ حال بھانپ لی اور فوراً ہی ایک طرف دبک گیا۔ یہی وجہ تھی کہ قاتل اسے دیکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔۔۔۔ البتہ آسا نے اس شخص کو اچھی طرح دیکھ لیا۔

وہ وہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن گیا اور مجرموں کی فہرست دیکھ کر اس نے قاتل کی نشان دہی کر دی۔ قاتل کا نام راؤلز تھا اور وہ گروہ کا ایک کار آمد رکن تھا۔ پولیس کو جب ایک ٹھوس اور چشم دید گواہ مل گیا تو اس سے زیادہ ان کے لیے خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ اس سارے معاملے میں آسا کو بس اتنا ہی فائدہ ہوا کہ وہ کسی گھٹیا ترین فلم کے ہیرو کی طرح مشہور ہوگیا۔۔۔ لیکن یہ بات راؤلز کو بالکل پسند نہیں آئی اور وہ آسا سے بے حد ناراض ہوگیا۔۔۔"

آسا نے بے چینی سے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اس کی نگاہ اجنبی کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔

"میں اب تک یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا ہوں" اجنبی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر بوڑھے آسا کو پولیس کے پاس دوڑے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر اس نے اپنی زبان کو قابو میں کیوں نہیں رکھا؟ اس نے جو کچھ بھی دیکھا تھا۔ اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول کیوں نہیں گیا؟"

"ممکن ہے آسا نے یہ سوچا ہو کہ پولیس کو حقائق سے آگاہ کرنا اس کا فرض ہے" بوڑھے آسا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فرض ۔۔۔!" اجنبی نے کہا۔ "یہ بھی جدید نظریات میں سے ایک ہے۔ ایسی باتوں سے چشم پوشی کیے بغیر، جن سے کسی کو کوئی بھی مطلب نہیں ہوتا، ہر کوئی فرض ادا کرنے پر تُلا بیٹھا ہے میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر پرانی قدروں کو ذہن میں رکھا جائے تو آدمی زیادہ فائدے میں رہتا ہے۔"

"لیکن پرانی قدریں ہمیشہ تو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتیں۔"

"مجھے افسوس ہے بڑے میاں۔ تمہارے احساسات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ تمہارا اندازِ فکر مایوس کن ہے۔" اجنبی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ اور ایک بار پھر دیوار گھڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "پانچ بج چکے ہیں۔ دکان بند کرنے کا وقت ہوچکا ہے۔"

"میں ابھی دکان بند نہیں کروں گا۔"

"یقیناً تم اسے بند کر دو گے۔ چلو، دروازہ مقفل کر دو۔"

"تم بلا وجہ مجھے پریشان۔۔۔۔"

آسا کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کیوں کہ اجنبی نے اپنی قمیص اٹھا کر اس کی توجہ ادھر مبذول کرا دی تھی۔ اس کے بیلٹ میں ریوالور کا سیاہ دستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اجنبی کے انداز سے مزید سختی جھلکنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ کھیل ختم ہونے کا وقت آچکا ہے۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ ریوالور کے دستے تک پہنچا اور پھر اسے جکڑتے ہوئے اجنبی نے کہا۔ "دروازہ مقفل کر دو۔ اور پھر بوٹ پالش کرنے والے نوجوان کے ساتھ۔۔۔"

اجنبی کی آواز یکایک بند ہوگئی۔

لیوری اس دوران دبے قدموں اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کے بازو نے اجنبی کی گردن جکڑ لی۔ جب کہ اس کے ریوالور کی نال اجنبی کی کنپٹی پر جم گئی۔ "ریوالور نکال کر فرش پر پھینک دو۔۔۔۔ اور اس کام کے لیے انگوٹھا اور انگشتِ شہادت استعمال کرو۔ آہستہ آہستہ اور احتیاط سے۔"

اجنبی بے بس تھا۔ لیوری کی بات پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی بے یقینی جھلک رہی تھی۔ وہ جب سے اندر آیا تھا اس نے ایک بار بھی لیوری کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ بلکہ یہ تک محسوس نہیں کیا تھا کہ بوٹ پالش والا ان کی باتیں سن رہا ہوگا۔

ریوالور پر قبضہ کر کے لیوری اس سے دو قدم دور ہٹ گیا۔۔۔

"آسا۔۔۔!" لیوری نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرے دفتر فون کر کے اطلاع دے دو۔"

"بہت بہتر جناب! ابھی جاتا ہوں۔" بوڑھے حجام نے کہا۔

اجنبی نے حیرت سے دہرایا۔ "دفتر!"

"اوہ ہاں۔" آسا نے ہنس کر کہا۔ "یہ نوجوان یہاں پچھلے دو روز سے بوٹ پالش والے کا کام کر رہا ہے۔ سٹی پولیس کو جیسے ہی اطلاع ملی تھی کہ راؤلز نے کسی قاتل کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ یہ نوجوان میری حفاظت کے لیے یہاں پہنچ گیا تھا۔۔۔۔ اس کا نام لیوری ہونز ہے۔۔۔۔ شیرف لیوری ہونز۔ ہام کاؤنٹی کی تاریخ کا پہلا سیاہ فام شیرف!"

بھاری بھرکم کرائے کا قاتل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیرف کو دیکھنے لگا۔ آسا کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ میرا خیال درست تھا۔ جب کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا ہے۔ اشیاء تغیر پذیر ہیں اور بعض اوقات یہ تبدیلیاں بے حد خوش گوار اور فائدے مند ہوتی ہیں۔"

اپنے پسندیدہ عجیب و غریب چور نک ویلوٹ سے ملیے

الیکٹرانک چور

اثر نعمانی

نک نے اپنی فیس بڑھا کر پچیس ہزار ڈالر کر دی ہے

[illegible] نے اسے لکھا ہے

فرسٹ سٹی سیونگ بینک کا ہیڈ کوارٹر لیگزنگٹن ایونیو کی ایک عالیشان بلند و بالا عمارت میں واقع تھا۔ تیز رفتار لفٹ میں ۵۶ ویں منزل پر جاتے ہوئے نک ویلوٹ سوچ رہا تھا کہ اس کی نوعمری کے زمانے کے مقابلے میں آج کل بینک اور ان کا انتظام کتنا بدل گیا ہے اور غالباً اسی کے ساتھ بینک لوٹنے کے طریقے بھی۔ جس وقت وہ سیکریٹری کے ساتھ ایک کمپیوٹر روم سے گزر رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اس مشینی دور میں اگر کوئی ان کمپیوٹروں کو دھوکا دے سکے تو اس کے لیے کسی ہتھیار اور تشدد کے استعمال کے بغیر بڑی سے بڑی رقم چرانا کس قدر آسان ہوگا۔ بینک کی طرح بینک کے صدر فلپ نارٹن کا دفتر بھی پہلے کے دفتروں کے مقابلے میں بہت مختلف تھا۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ فلپ نارٹن دورِ حاضر کا ایک کامیاب بینکر ہی نہیں سیاست کے میدان میں بھی تیزی سے ترقی کرتا ہوا ایک ذہین و خوبصورت سیاستداں بھی تھا۔ اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا وہ خاصا نمایاں اور ممتاز نظر آرہا تھا۔

"تمہارا نام نک ویلوٹ ہے؟" اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "میں تمہارے بارے میں بہت کچھ سنتا رہا ہوں۔"

نک مسکراتے ہوئے پیش کردہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے کس سے سنا ہوگا" وہ بولا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب میری شہرت بینکاروں کے حلقوں تک پہنچ چکی ہے۔"

"آج کل بینکروں کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے" نارٹن نے کہا "ہر وہ شخص جس کے پاس کچھ دولت ہے کسی نہ کسی انداز میں ایک بینک سے متعلق ہوتا ہے۔ اور پھر ہم تو اس بارے میں بھی بہت سے سوالات نہیں کرتے کہ جو روپیہ جمع کرایا جا رہا ہے وہ کہاں سے آیا۔ لیکن یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ میں نے تمہیں ایک خاص مشورے کے لئے زحمت دی ہے۔ اور میں تمہارے وقت کی پوری قیمت دینے کے لئے آمادہ ہوں۔"

"مشورہ" نک نے چونک کر پوچھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس بات کی توقع کی جا رہی ہے۔

"میں اپنی خدمات معاوضہ پر دیتا ہوں" اس نے کہا "اور جب تم نے مجھے بلایا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں میری خدمات کی نوعیت بھی معلوم ہوگی۔"

"میں جانتا ہوں" نارٹن بولا "تم معمولی اور بے قیمت چیزیں چراتے ہو اور اس کے لئے تمہاری فیس بیس ہزار ڈالر ہے۔"

"اب میری فیس پچیس ہزار ہے۔ گرانی اور زندگی کی بڑھتی ہوئی قدروں نے آخر کار مجھے بھی اپنی فیس میں اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"فیس کچھ بھی ہو مجھے تمہاری خدمات کی نہیں تمہاری ماہرانہ رائے کی ضرورت ہے۔ میری ایک چیز چرائی گئی ہے۔ ایک بے قیمت شے۔ اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔"

"میں کوئی جاسوس یا سراغ رساں نہیں ہوں مسٹر نارٹن۔"

"لیکن اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی طویل مدت میں تمہیں ایسی بے شمار وجوہات سے سابقہ پڑا ہوگا جو معمولی اور بے حقیقت چیزیں چرانے کا مقصد رہی ہوں۔"

"چرایا کیا گیا ہے؟" نک نے پوچھا۔

"میری میز پر رکھی رہنے والی شیشے کی ایک بھاری ایش ٹرے۔"

"کچھ معلوم ہے کہ اسے کس نے چرایا۔"

"ہاں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کیوں چرا لیا۔ وہ اس وقت غائب ہوئی جب کہ میں ایک مذہبی شخصیت پادری فیلکس میبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ صرف وہی اسے چرا کر لے جا سکتا تھا۔"

"ایش ٹرے کس طرح کی تھی؟"

"اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس طرح کی ایش ٹرے عام ملتی ہیں۔ شفاف شیشے کی مربع نما جس میں راکھ جھاڑنے کے لئے دائرہ نما گڑھا بنا تھا۔ وہ اندازاً پانچ انچ چوڑی اتنی ہی لمبی اور دو انچ موٹی تھی۔"

"کچھ پادری میبی کے بارے میں بتاؤ۔"

"اس کا پورا نام فیلکس میبی ہے وہ ون ٹرو ہوپ نامی چرچ کا منتظمِ اعلیٰ ہے۔ یہ چرچ لانگ آئی لینڈ پر واقع ہے۔ پادری میبی ایک دوسرا چرچ بنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بینک سے قرضہ لینے کے لئے آیا تھا۔"

"تم بینک کے صدر ہو کیا قرض وغیرہ جیسے معاملات سے نمٹنے کے لئے بینک میں کوئی علیحدہ افسر نہیں ہے۔؟"

"دراصل میرے ایک دوست نے سفارش کی تھی کہ میں اسے ملاقات کا موقع دوں۔" نارٹن نے جواب دیا "شاید یہ میری غلطی تھی۔ آخر میں نے اسے بینک کے قرض منظور کرنے والے افسر کے پاس بھجوا دیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے قرض نہیں دے سکیں گے۔"

"اس نے کتنے قرض کی درخواست کی تھی؟" نک نے پوچھا۔

"ڈھائی لاکھ ڈالر۔ جب کہ اس کے پاس چرچ کے نام کے علاوہ کوئی ضمانت بھی نہیں۔ اس کی درخواست ہرگز منظور نہیں ہوگی۔"

"کیا وہ ایش ٹرے اپنے کوٹ کے اندر چھپا کر لے گیا۔؟"

"ایسا ہی ہوا ہوگا۔ میں سگریٹ نہ بھی پی رہا ہوں تب بھی باتیں کرتے ہوئے عموماً اس سے کھیلتا رہتا ہوں۔ جیسے ہی وہ گیا میں نے دیکھا کہ ایش ٹرے غائب ہو چکی ہے۔"

"اس وقت ٹرے میں راکھ وغیرہ تو ہوگی۔"

"ممکن ہے۔ ایک آدھ ٹوٹا پڑا ہو۔ میں سگریٹ کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ سگریٹ پیتا ہی نہیں۔"

"راکھ کے علاوہ کوئی چیز مثلاً کوئی پھٹا ہوا کاغذ وغیرہ۔؟"

"نہیں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"کیا اس پر بینک کا نام یا نشان کندہ تھا۔؟"

"نہیں۔"

"اس واقعہ کو کتنا وقت گذرا۔؟"

"تین دن۔ گذشتہ پیر کا واقعہ ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس معاملہ میں کیا مدد کر سکتا ہوں" نک نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ شاید وہ چیزیں چرانے کی بیماری میں مبتلا ہوگا۔"

"تمہارے تجربے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا۔؟"

"بالکل نہیں۔"

"مجھے تو امید تھی کہ تم سے اس معاملے میں مفید مدد مل سکتی ہے۔" نارٹن نے کچھ مایوسی سے کہا۔

"کوشش میں کچھ کر سکتا ہوں" نک نے کہا "لیکن جیسا کہ میں نے بتایا میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا "ممکن ہے کبھی کوئی ایسی بات پیش آئے جس کا میری لائن سے کوئی تعلق ہو تب میں بڑی خوشی سے تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" نارٹن بھی کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر ہچکچا رہا ہو۔

نک ویلوٹ دروازے تک گیا۔ ابھی اس کا ہاتھ ہینڈل تک ہی پہنچا تھا کہ نارٹن کی آواز سنائی دی وہ بہت آہستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اگر تم پادری میبی سے وہ ایش ٹرے چرا کر لا دو تو میں تمہیں پچیس ہزار ڈالر دینے کے لئے تیار ہوں۔"

✪

نک ویلوٹ کبھی اپنے موکلوں سے ان کے مقصد کے بارے میں سوالات نہیں کرتا تھا اور نہ اس نے نارٹن سے ہی پوچھا کہ اسے اس بے حقیقت ایش ٹرے کی ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس کے لئے اتنی رقم خرچ کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ نک نے اس کام کو بھی اسی طرح قبول کر لیا جس طرح وہ پہلے بھی اس نوعیت کے کام لیتا رہا تھا۔ مطلوبہ چیز لانے کا وعدہ کیا اور پادری فیلکس میبی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا۔ جو کوئی ایسا دشوار کام ثابت نہیں ہوا۔ چرچ ون ٹرو ہوپ کو فون کرنے ہی سے اس کا کام بن گیا۔ اور پادری میبی نے اسی سہ پہر اسے ملاقات کے لئے وقت دے دیا۔

لیکن جب نک ویلوٹ دو بجے دن کے قریب چرچ پہنچا تو اسے توقع سے زیادہ معلومات ہاتھ آ گئیں۔ ایک سرخ بالوں والی لڑکی اپنے کندھے سے ایک ٹیپ ریکارڈر لٹکائے چرچ کے چوکیدار سے اندر جانے کے لئے الجھ رہی تھی۔

"تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو" وہ کہہ رہی تھی "میرا نام لان لارنس ہے۔ میرا تعلق ٹی وی چینل نمبر چھ کے خبروں کے شعبہ سے ہے اور میں یہاں انٹرویو لینے آئی ہوں۔"

"آج کوئی انٹرویو نہیں ہوگا۔" چوکیدار نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ نک نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری جانب ایک ٹی وی کیمرہ مین اپنا کیمرہ اٹھائے یہ سارا منظر محفوظ کرنے میں مصروف ہے۔ چوکیدار نے دروازہ بند کر لیا اور اسی کے ساتھ کیمرہ بھی رک گیا نک لڑکی کی طرف بڑھا۔

"یہاں کے لوگوں کا رویہ کچھ زیادہ دوستانہ نہیں کیوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے لٹکے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو سنبھالا۔ اور پھر بڑی میٹھی مسکراہٹ چہرے پر لئے نک کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا تم پادری میبی کے پاس کسی کام سے آئے ہو؟" اس نے کہا اور جواب ریکارڈ کرنے کے لئے مائکروفون آگے بڑھا دیا۔ نک جو

بیچارہ چارہ گر ریفری

◎ نظر کمزور ہو جائے تو ہاکی اور فٹبال کے کھلاڑی ریفری بن جاتے ہیں

◎ ریفری کو اپنے ججمنٹ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ گول ہونے سے پندرہ سیکنڈ قبل گول کی وِسل بجا دیا کرتا تھا۔

◎ مرتے وقت وہ اپنی ساری دولت بیوی کے نام کر گیا۔ ایک وِسل، پچیس جوڑے پرانے جوتے اور تیس گلو سڑے ہوئے ٹماٹر۔

◎ ہاکی فائنل ۔ اُس کھیل کو کہتے ہیں جس میں بائیس کھلاڑی، ایک گیند اور پچاس ہزار ریفری ہوں۔

◎ کیا تم اس لڑکی کے بارے میں جانتے ہو جو ریفری بننا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وِسل کی ہر آواز پر جب پچاس ہزار سوالیہ نظریں تمھاری طرف اٹھتی ہیں تو جسم میں کئی سیر خون بڑھ جاتا ہے۔

◎ ایک مشہور ریفری کا قول ہے کہ ممکن ہے قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہو لیکن وِسل بلاشک و شبہ دونوں سے زیادہ طاقتور ہے۔

◎ جنگ بندی کے مبصر دراصل ریفری ہوتے ہیں اور خیال رکھتے ہیں کہ کوئی ملک فاؤل نہ کرے۔

◎ دُنیا میں صرف چار بڑے ریفری ہیں اور مقامِ افسوس ہے کہ ان میں سے ایک بھی غیر جانبدار نہیں۔

◎ انگلینڈ میں ہماری کرکٹ ٹیم کے ہارنے کے تین اہم اسباب ہیں۔ موسم، امپائر اور امپائر۔

◎ جوئے میں آج تک کوئی نہیں جیتا۔ ریفری نہ ہو تو یہی ہوتا ہے۔

اپنے ایک حالیہ کیس میں ایک کالم نگار عورت سے الجھ چکا تھا۔ پھر دوبارہ کسی ایسی ہی ٹکر کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

"نو کمنٹ۔ کوئی تبصرہ نہیں۔" اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"کیا تم پادری میبی سے چرچ کو دی جانے والی ٹیکس کی چھوٹ کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہو؟" لان لارنس نے دوسرا سوال کیا

نک کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اور دروازہ کھلنے پر اندر چلا گیا۔

"کیا تمہارا کوئی اپائنٹمنٹ ہے؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"میرا نام نک ویلوٹ ہے اور مجھے دو بجے کا وقت دیا گیا تھا" نک نے جواب دیا۔

چوکیدار نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بالائی منزل۔ دائیں جانب پہلا کمرہ پادری صاحب کا آفس ہے۔" وہ بولا۔

پادری فیلکس میبی نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے نک کا استقبال کیا اور ایک آرام دہ کرسی پیش کی۔ نک نے بیٹھتے ہوئے سرسری نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دفتر میں ایک جانب ایکوریم میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

"تم نے فون پر ہمارے پاکیزہ مقصد کے لئے کسی ممکنہ امداد کے بارے میں کچھ کہا تھا۔" پادری میبی نے گفتگو شروع کی۔

نک نے میز پر دیکھا لیکن وہاں نارٹن کی ایش ٹرے نظر نہیں آئی۔

"میں ایک ایسے فرد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔" وہ بولا "جو اس سلسلہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن دروازے پر ایک جھگڑا ہو رہا تھا۔ جو مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔ آخر کیا معاملہ تھا۔"

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ رپورٹر مجھے ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ لوگ دن ٹرد ہوپ چرچ کو بھی مغربی ساحل پر واقع ان اداروں کی طرح قیاس کرتے ہیں جہاں ہر قسم کی بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں حالانکہ اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے۔"

"تمہارے اس چرچ سے کتنے لوگ وابستہ ہیں؟" نک ویلوٹ نے پوچھا۔

"اس علاقہ میں کم و بیش دو سو اور قومی پیمانے پر لگ بھگ سات سو افراد۔" پادری میبی نے جواب دیا۔

"یہ تو کچھ زیادہ نہیں۔"

"مگر ہمارے ممبر تبلیغی جذبے سے سرشار ہیں۔" پادری میبی نے کہا "ہمیں امید ہے کہ ہم سب اپنی مشترکہ جدوجہد سے آئندہ دس سال میں دس لاکھ افراد کو مسیحیت کے دامن میں لے آئیں گے۔"

نک نے بڑے سرسری انداز میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی ایش ٹرے نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"براہ کرم سگریٹ نہ پینا۔" پادری میبی نے جلدی سے کہا "یہ ہمارے چرچ کے اصول کے خلاف ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" نک نے پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایش ٹرے اسی اصول کی وجہ سے چرائی گئی ہو۔ مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ کوئی لوگوں کو سگریٹ نوشی سے روکنے کے لئے ان کی ایش ٹرے نہیں چرایا کرتا۔

"ہم نے اپنے چرچ کے لئے کئی مفید اور عظیم منصوبے بنائے ہیں۔" پادری میبی کہہ رہا تھا "اور ہمیں اس عظیم مقصد کے لئے لوگوں کے عطیات کی ضرورت ہے۔"

"اگر تمہارے ممبران کی اس تیز رفتاری سے بڑھنے کی توقع ہے۔ تب تو یہ موجودہ چرچ تمہارے لئے چھوٹا پڑے گا۔" نک نے کہا۔

"یقیناً" پادری میبی نے جوش میں کہا "ایک نئے چرچ کی تعمیر ہمارے ایجنڈے پر سب سے پہلا کام ہے مگر سوال روپیہ کا ہے۔"

"تم نے قرض لینے کی کوشش نہیں کی۔۔؟"

"ہاں مگر بینک قرض دینے میں ہچکچا رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرسٹ سٹی سیونگ بینک کی پالیسی ایسے قرضہ جات کے سلسلہ میں کافی نرم ہے۔"

"ہم نے وہاں بھی قرض کی درخواست دے رکھی ہے۔ مگر کامیابی کی زیادہ امید نہیں۔ میں خود اس ہفتے کے شروع میں بینک کے صدر سے ملا تھا مجھے وہ کوئی ایسا آدمی محسوس نہیں ہوا جو خدا کی خوشنودی کے لئے کوئی کام کرنے پر تیار ہو جائے۔"

نک ویلوٹ کے لئے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ یہ پادری اپنے مقصد میں کس حد تک سنجیدہ ہے۔ اپنے زمانے میں اسے بہت سے فریبی اور جعلساز افراد سے سابقہ پیش آیا تھا اور ان میں یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے مذہب کی مٹی کی آڑ میں شکار کھیلا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا کہ پادری میبی ان سے مختلف ہو۔ ممکن ہے اس نے نارٹن کی ایش ٹرے اپنی مذہبی مجالس کے دوران لوبان و اگر سلگانے کے لئے چرائی ہو۔ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد نک اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا کہ وہ اس ممکنہ عطیہ کے سلسلہ میں جلد ہی دوبارہ رابطہ قائم کرے گا۔ پادری بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ دروازے تک نک کو چھوڑنے گیا۔

چرچ سے باہر نکلنے کے بعد نک ویلوٹ کا سامنا ایک بار پھر اسی لڑکی لان لارنس سے ہو گیا۔ اور اسے اس پر کوئی حیرت بھی نہیں ہوئی کہ لان لارنس اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"دیکھو" وہ اپنے دونوں ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی "اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی مائکروفون نہیں ہے۔ کیا تم اب مجھ سے گفتگو کرنا پسند کرو گے" "کس بارے میں" نک نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"پادری میبی کے بارے میں۔" لان لارنس نے جواب دیا "تم اس کے پاس کس کام سے آئے تھے۔۔؟"

"یہ ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔"

"وہ ایک چھٹا ہوا جعلساز ہے۔ تم جانتے ہو۔"

"اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھا جائے تب تو وہ کوئی ولی معلوم ہوتا ہے۔" نک نے جواب دیا۔

"اس طرح میرا ظاہری حلیہ تو غالباً تمہیں کسی سوسائٹی گرل کی طرح نظر آ رہا ہوگا۔ لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔" لان لارنس نے کہا "حکومت کے چھ سے زیادہ ادارے فیلکس میبی کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ چرچ کو دی گئی ٹیکس کی چھوٹ واپس لے لی جائے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ چرچ کو ملنے والے چندے اور عطیات کا بڑا حصہ پادری میبی کی اپنی جیب میں جاتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو وہ کوئی پہلا فرد نہیں ہوگا۔" نک نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حکام ہمیشہ مذہبی اداروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچاتے ہیں خواہ مالی اعتبار سے وہاں کیسی ہی بدعنوانیاں کیوں نہ ہو رہی ہوں۔"

"یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد اور اداروں کو بے نقاب کرنے کا فرض پریس پر عائد ہوتا ہے؟"

"میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔" نک نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔

گلوریا مکان کے عقبی باغیچہ میں کچھ پودے لگا رہی تھی۔ نک کو دیکھ کر وہ اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"کہو اپنے موکل سے ملاقات کیسی رہی؟" اس نے پوچھا۔

"جیسی ہمیشہ رہتی ہے۔" نک نے بتایا "وہ ایک بینکر ہے۔ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی فیس میں پانچ ہزار پونڈ کا اضافہ کر دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا۔ کوئی خطرناک کام تو نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں۔" نک نے اطمینان دلایا۔

جب سے گلوریا کو نک کے حقیقی پیشہ کا پتہ چلا تھا وہ کبھی زیادہ سوالات نہیں کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتی تھی کہ نک کسی خطرناک مہم میں تو نہیں الجھا ہوا ہے۔ نک نے اندر جا کر ڈاک دیکھی لیکن اس میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ ایک لفافہ اسٹار سیکورٹی سسٹم کی جانب سے تھا۔ اپنے پیشے کے تقاضے کے مطابق نک قفل اور الارم سازی کی صنعت میں تازہ ترین جدت سے باخبر رہنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اسے اس بارے میں مختلف اداروں کی جانب سے لٹریچر ملتا رہے۔ اس لفافہ میں جو پمفلٹ ملفوف تھا۔ اس کے مطابق ایسے قفل بنائے گئے تھے جو چابی کے بجائے مقناطیسی نوعیت رکھنے والے کارڈ سے کھلا کرتے تھے۔ نک نے یہ معلومات پڑھنے کے بعد کچھ غور کیا اور پھر پمفلٹ میں دیئے ہوئے فون نمبر کو ڈائل کیا جو کہ بوسٹن کا تھا۔

رابطہ قائم ہونے پر نک نے سیلز مینجر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ فون پر آیا تو نک نے ایک فرضی نام سے اپنا تعارف کرایا۔

"میں ابھی تمہارا پمفلٹ دیکھ رہا تھا۔" اس نے بتایا "خاص طور سے وہ قفل جو مقناطیسی کارڈ سے کھل جاتے ہیں۔"

"درست ہے۔" سیلز مینجر نے جواب دیا "آج کل ان تالوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔"

"مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کہیں ایک الیکٹرونک قفل کے بارے میں پڑھا تھا جو کہ صرف نشانِ انگشت سے ہی کھل سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔"

"یقیناً۔ دستخط یا پھر انگلی کا نشان۔ اس کا اصول بہت سادہ ہے۔ جب دو ایک جیسے نشانات مل جاتے ہیں تو قفل کھل جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں انگلی کا نشان دستخط سے زیادہ مفید اور کارآمد رہتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص ایک ہی طرح کے دو دستخط نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ دستخط کو ترجیح دیتے ہیں انہیں نمونے کے دستخط کا ایک کارڈ اپنے پاس رکھنا پڑتا ہے اور یہ صورت تحفظ کے نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر نہیں۔"

"کیا تم انگلی کے نشانات والے قفل تیار کرتے ہو۔"

"نہیں۔ یہ بہت زیادہ مہنگے ہوتے ہیں اور چند خاص کمپنیاں ہی تیار کرتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہیں ایک فرم کا پتہ دے سکتا ہوں۔ اس وقت دیر ہو گئی ہے پھر بھی شاید ان کے دفتر میں کوئی موجود ہو۔"

مزید تین فون کالیں اور نصف گھنٹہ خرچ کرنے کے بعد نک کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں۔ اسے بتایا گیا کہ ایک ایسا ہی انگلی

کے نشان سے کھلنے والا قفل فرسٹ سٹی سیونگ بینک نیویارک کو فروخت کیا گیا ہے۔ جواب دینے والے نے کہا کہ اسے افسوس ہے مگر اس ضمن میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ مگر نک کے لئے یہ ہی بہت کافی تھا اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ اگلی صبح وہ ایک بار پھر بینکر فلپ نارٹن کے آفس میں موجود تھا نارٹن اسے دیکھ کر خوش ہوا اور فوراً ہی اصل موضوع پر آگیا۔

"کیا تم میری ایش ٹرے لے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" نک نے جواب دیا "مگر میں نے یہ معلوم کر لیا کہ اسے کیوں چرا لیا گیا تھا۔"

"کیا واقعی؟" نارٹن نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔

"کل تم نے بتایا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے تم عموماً اس سے کھیلتے رہا کرتے تھے۔ پادری میبی نے یقیناً تمہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے ایش ٹرے تمہاری انگلیوں کے نشانات کے لیے چرائی ہے۔"

"میری انگلیوں کے نشانات....."

"اس عمارت میں کہیں کسی جگہ کوئی دروازہ یا کوئی والٹ ایسا موجود ہے جس میں الیکٹرونک قفل لگا ہوا ہے جو صرف تمہاری انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے۔" نک نے بتایا۔

نارٹن کا چہرہ ایک دم سُتا ہوا نظر آنے لگا۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے۔ تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں یا نہیں۔"

"میں نے تمہاری خدمات ایش ٹرے واپس لانے کے لئے حاصل کی ہیں۔ تمہیں بینک کے حفاظتی انتظام کی ٹوہ لگانے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ بینک کے کسی والٹ میں کوئی ایسا قفل لگایا گیا ہو جس کے لئے ہر وقت تمہاری موجودگی ضروری پڑے۔" نک نے جواب دیا "اس لئے یہ امکان زیادہ ہے کہ وہ قفل تمہارے کسی ذاتی لاکر، والٹ یا اسٹرانگ روم میں لگایا گیا ہو۔ ایک اتنی بڑی عمارت میں ایسی کوئی بھی چیز بڑی آسانی سے بنائی جا سکتی ہے۔"

"بہت خوب مسٹر ویلوٹ" نارٹن نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بس یہ کافی ہے، بہت ہو چکا۔ مجھے تمہاری خدمات کی مزید کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ابھی میں نے تمہاری ایش ٹرے لا کر نہیں دی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب تم میرے لئے ہر قسم کی کوشش ترک کر دو اور کل سے اس وقت تک اپنے کام کے سلسلہ میں جو بھی معاوضہ بنتا ہو اس کا حساب بتا دو تاکہ میں ادائیگی کر دوں۔"

"میں گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے کام نہیں کرتا۔"

"تب پھر جتنا معاوضہ مناسب سمجھو طلب کر لو۔ لیکن اب تم میرے لئے کام نہیں کرو گے۔"

نک افسوس کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے نارٹن سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ جو بات بھی معلوم ہوا سے بتانے دوڑا جائے۔ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔

بظاہر نارٹن نے اسے اس لئے برطرف کر دیا تھا کہ اس نے نارٹن کے کسی ایسے اسٹرانگ روم کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا تھا جس میں انگلی کے نشان سے کھلنے والا قفل لگا ہو، نارٹن نک کے قبضہ میں ایسی معلومات کے آنے سے خوفزدہ ہو گیا شاید یہ سوچ کر کہ نک ایک چور ہے اور کہیں وہ ان معلومات کو اپنے فائدے کے لئے استعمال نہ کرے۔ لیکن نک ویلوٹ جیسے آدمی کو اس آسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے نارٹن نے اپنی ایش ٹرے چرانے کے لئے مامور کیا تھا اور وہ یہ کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ساس کے بارے میں چند مشاہرین کے بیانات

◉ جب میری ساس کو ایک پاگل کتے نے کاٹا تو وہ ہسپتال جانے کے بجائے اپنے ان دشمنوں کی فہرست بنانے بیٹھ گئی جنھیں وہ پاگل ہونے کے بعد کاٹنا چاہتی تھی۔
برنارڈ شا

◉ گزشتہ رات میں نے غلطی سے اپنی ساس کے ایک اعتراض کا جواب ذرا سختی سے دیدیا۔ اس نے غصے میں آ کر میرا سوٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میں ہرگز اس بات کی شکایت نہ کرتا، بشرطیکہ وہ سوٹ میرے بدن پر نہ ہوتا۔
کول مین

◉ پچھلے دنوں میری ساس نے ایک دکان پر نوکری کر لی مگر تیسرے ہی روز ملازمت چھوڑ دی۔ اسے شکایت تھی کہ دکاندار روزانہ تین مرتبہ چائے پلانے کے لئے اسے گہری نیند سے اٹھا دیتا ہے۔

◉ میری ساس اتنی بڑی جادوگر ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو تبدیل کر کے مباحثہ بنا دیتی ہے۔ شیفیلڈ

◉ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میری ساس موٹی ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی شادی کے بعد میرے سسر کو اسے گود میں اٹھا کر حجلۂ عروسی تک لے جانے کے لئے پورے تین پھیرے لگانے پڑے۔ گولڈ اسمتھ

◉ اگر میری انگلی کٹ جائے تو میری ساس روتی ہوئی میری طرف دوڑتی ہے۔ عموماً اس کے ہاتھ میں نمک ہوتا ہے جو وہ زخم پر چھڑکنا چاہتی ہے۔ ڈوڈاڈس

◉ میری ساس اپنی جگہ کے لئے انتہائی مناسب اور موزوں شخصیت ہے۔ مگر افسوس کہ ابھی تک قبرستان والوں نے اس کی جگہ تیار نہیں کی ہے۔ وِک فیلڈ

◉ میری ساس نے آج تک اپنی زندگی کا بیمہ نہیں کرایا لیکن وہ باقاعدگی سے آگ کے بیمے کا پریمیم ادا کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مرنے کے بعد اسے کہاں جانا ہے۔
جی ایم نوشاہی

◉ پریشان ہو کر کہ وہ موٹی بھینس بنتی جا رہی ہے میری ساس علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے اسے چند گولیاں لکھ دیں۔ گولیوں سے واقعی فائدہ ہوا۔ میری ساس دبلی تو نہیں ہو سکی تاہم اب اس نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ میکلین

◉ میری ساس اتنی شرمیلی ہے کہ جب وہ نہانے جاتی ہے تو غسل خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتی ہے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ غسل کر رہی ہے اور محتاط اتنی ہے کہ ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر کے پردے ڈال دیتی ہے۔ اس وقت جبکہ وہ اپنے خیالات بدلنے میں مصروف ہوتی ہے۔
این جے سعید

◉ کھانا کھاتے میں میری ساس کے منہ سے آوازیں نکلتی ہیں۔ پچھلے ہفتے جب وہ میرے ساتھ ایک ہوٹل میں چپ چپ کر کے کھانا کھا رہی تھیں، تو چھ جوڑے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور چپ چپ کی دھن پر ناچنے لگے۔ گریگری پیک

✿

اس نے اتوار کی صبح تک انتظار کیا جب پادری میبی ایک کرائے پر لئے ہوئے ہال میں مٹھی بھر افراد کے سامنے وعظ کر رہا تھا۔ نک اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چرچ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں عقبی دروازے سے بہت ہی آسانی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پادری میبی حفاظتی انتظامات کے سلسلہ میں کچھ دور اندیش واقع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں قدم رکھتے ہی نک پادری کے بالائی آفس میں داخل ہوا اور تلاشی شروع کر دی۔ الماری میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ ایک فائل کیبنٹ میں بے شمار پتے موجود تھے۔ میز کے خانوں میں صرف ایک تعجب خیز شے ملی۔ اعشاریہ ۳۸ بور کا ایک ریوالور نہایت حفاظت سے نچلی دراز میں پوشیدہ کیا گیا تھا۔ اگر خانے میں کوئی بائبل ملتی تو بھی شاید نک کو اتنی حیرت نہ ہوتی۔

پندرہ منٹ کی ناکام تلاش کے بعد نک کچھ مایوس ہو کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ چونکہ پادری میبی نے ایش ٹرے ذاتی طور پر چرائی تھی اس لئے نک کا خیال تھا کہ وہ عمارت میں کہیں اور رکھی جانے کے بجائے پادری کے اپنے ذاتی آفس میں ہی ہو سکتی ہے، کہیں اور رکھنے سے دوسروں کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ جب کہ یہاں دفتر میں وہ ہر طرح محفوظ تھی۔ پھر پادری ایک ایسا آدمی معلوم ہوتا تھا جو اسے کسی ایسی جگہ رکھنا پسند کرے گا جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ اور ایش ٹرے ایسی چیز ہے۔

پاگل پن

پاگل خانے کے گیٹ پر ایک گھبرایا ہوا شخص پہنچا اور وہاں کے محافظوں سے پوچھنے لگا "کیا آج یہاں سے کوئی پاگل فرار ہو گیا ہے؟"
"نہیں" محافظوں نے بتایا "سارے پاگل اپنی اپنی کوٹھریوں میں بند ہیں۔"
"تمہیں یقین ہے۔"
"ہاں، ہمیں یقین ہے مگر یہ تو بتاؤ، تم کیوں سمجھ رہے ہو کہ یہاں کا کوئی پاگل فرار ہوا ہے؟"
"بات یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے" گھبرائے ہوئے شخص نے کہا "ایک آدمی میری ساس کو بھگا لے گیا ہے۔"

جو کہیں بھی رکھی جا سکتی ہے لیکن شاید ایک ایسے شخص کے دفتر میں نہیں جس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتا۔ اس لئے اسے چھپانے کے لئے کوئی ایسی جگہ چاہیئے جو نظروں کے سامنے بھی ہو پھر بھی عام افراد کی نگاہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

اور تب اس وقت نک کی نظر ایک بار پھر مچھلیوں کے ایکیورم پر پڑی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے بلاتکلف اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور وہ اس کے ہاتھ آ گئی۔ بینکر نارٹن کی شفاف شیشے کی ایش ٹرے مچھلیوں کے ایکیوریم میں سب کے سامنے اور پھر بھی سب سے پوشیدہ موجود تھی۔ نک نے بڑی حفاظت سے اسے نکالا۔ اسے صاف کیا وہ اس کے کوٹ کی جیبوں کے لئے بڑی تھی چنانچہ اس نے اسے ایک اخبار میں لپیٹا اور بغل میں دبا لیا۔ نہایت مطمئن انداز میں وہ جس طرح اندر داخل ہوا تھا اسی طرح عقبی دروازہ بند کرتے ہوتے باہر آ گیا۔

پھر وہ اس جگہ پہنچا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں اس نے ایک جانے پہچانے منی ٹرک کو کھڑے دیکھا۔ ٹی وی چینل چھ کی ٹیم مصروف کار تھی۔

"ہیلو" لان لارنس نے اسے دیکھتے ہی آواز دی "کیا پادری میبی کا وعظ سننے آئے تھے"۔

"نہیں خاص طور پر اس لئے نہیں آیا تھا"

"تمہیں آج کا وعظ ضرور سننا چاہیئے تھا۔" لان لارنس بولی۔

"ایسی کیا خاص بات تھی آج۔"

"پادری صاحب نے ابھی اعلان کیا ہے کہ فرسٹ سٹی سیونگ بینک نے ان کے نئے چرچ کے لئے ڈھائی لاکھ ڈالر کا قرضہ منظور کر لیا ہے۔"

○

نک پیر کے دن ایک بار پھر بینک گیا۔ شیشے کی ایش ٹرے اس کے بریف کیس میں رکھی تھی۔ نارٹن کی سیکریٹری نے پہلے اسے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ وہ مختلف قسم کی میٹنگ میں دن بھر مصروف رہے گا۔ لیکن نک نے اصرار کرتے ہوتے کہا۔

"اس سے کہنا کہ میرے پاس ایک بہت اہم شے ہے جو صرف ذاتی طور پر اسے دی جا سکتی ہے۔"

سیکریٹری نے فون پر نارٹن سے کچھ بات کی اور پھر نک کی طرف متوجہ ہوتے ہوتے بولی۔

"پندرہ منٹ انتظار کرو۔ مسٹر نارٹن تمہیں بلا لیں گے۔"

ایک مختصر انتظار کے بعد نک دفتر میں داخل ہوا تو نارٹن نے بڑی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔

"اب کیا بات ہے ویلوٹ؟" اس نے پوچھا "میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

نک نے بریف کیس کھول کر ایش ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"جیسا کہ تم نے ہدایت کی تھی ایش ٹرے حاضر ہے" اس نے کہا۔ نارٹن مبہوت سا بنا اسے دیکھتا رہا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" آخر اس نے پوچھا۔

"جہاں پادری میبی نے اسے چھپایا تھا۔ مچھلیوں کے ایکیورم میں جو کہ اس کے دفتر میں رکھا ہے" نک نے جواب دیا۔

"ایکیورم میں" نارٹن نے حیرت سے دہرایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خود بھی وہاں جا کر دیکھ چکے ہو۔"

"ہاں میں وہاں گیا تھا۔"

"یہ برا ہوا کہ میرے ایش ٹرے لانے سے پہلے ہی بینک نے اسے قرض دینا منظور کر لیا" نک بولا۔ نارٹن کے چہرے پر سرخی آ گئی۔

"اسے دیتے جانے والے قرض کا میری ایش ٹرے کی چوری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ کونسا دروازہ ہے جس کا قفل تمہاری انگلیوں کے نشان سے کھلتا ہے" نک نے پوچھا "اور اس میں کیا رکھا ہوا ہے؟"

"گڈ ڈے مسٹر ویلوٹ" نارٹن نے ناگواری سے کہا "ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے"۔

"ابھی مکمل طور پر نہیں" نک نے کہا "تمہیں ابھی میری فیس کے پچیس ہزار ڈالر ادا کرنا ہیں۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ تم نے چیز برآمد کر کے واپس لانے میں دیر کر دی۔"

"واپس لانے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں لگائی گئی

تھی" نک نے جواب دیا "میں نے اسے ایک ہفتے سے بھی کم وقت میں لا کر دے دیا ہے"۔

"مجھے افسوس ہے ویلوٹ۔"

"میں اپنی فیس لیے بغیر نہیں جاؤں گا" نک بولا۔

لیکن نارٹن نے یقیناً پہلے سے اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا۔ تقریباً فوراً ہی کسی پوشیدہ الارم کا اشارہ پا کر ایک مسلح گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

"مسٹر ویلوٹ کو باہر کا راستہ دکھاؤ" نارٹن نے گارڈ سے کہا۔ مگر نک خود ہی کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہیں بل بھیج دوں گا۔" اس نے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

لفٹ میں عمارت سے باہر نکلتے ہوتے وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ یہ صورتحال پرانے ناولوں سے مختلف نہیں تھی۔ ایک خفیہ کمرہ کسی بے نام راز کا حامل جسے پوشیدہ اور مقفل رکھنا ضروری نہیں ہو۔ فرق یہ تھا کہ یہ کمرہ کسی قدیم حویلی میں نہیں ایک ماڈرن بلڈنگ میں تھا۔ نک سوچ رہا تھا کہ لیکن سے پادری میبی کو یہ راز معلوم ہو گیا تھا یا کم سے کم اسے اس راز کی کنجی ہاتھ آ گئی ہے اس کے بل بوتے پر اس نے ڈھائی لاکھ ڈالر کا قرضہ منظور کرا لیا۔ نک کے ذہن میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ پادری میبی یقیناً ایک جعلساز اور فراڈ آدمی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آیا نارٹن بڑا بدمعاش ہے یا پادری میبی مگر خواہ کوئی بھی ہو وہ اپنی فیس کیسے حاصل کرے اس کے لیے ظاہر تھا کہ اسے بھی کوئی چالاکی کرنا پڑے گی۔ اس نے سوچا ممکن ہے لان لارنس کی مدد سے وہ کوئی ایسی ترکیب بروئے کار لانے میں کامیاب ہو جاتے۔

○

لان لارنس نے بڑی توجہ سے نک کی باتیں سنیں۔

"مجھے واضح طور پر سمجھنے دو" آخر وہ بولی "تم یہ چاہتے ہو کہ میں فرسٹ سٹی سیونگ بینک کے صدر فلپ نارٹن سے انٹرویو لوں۔"

"ہاں اور بینک کی عمارت میں اس کے آفس کے اندر۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ کام کر سکتی ہو۔"

"اس میں میرے ہاتھ کیا آئے گا" لان لارنس نے پوچھا۔

"ایک بہترین کہانی" نک نے جواب دیا "اگر میرے شبہات درست ثابت ہوتے تب۔ یوں بھی چونکہ تم آج کل پادری میبی کے پیچھے لگی ہوئی ہو اس لئے تم اسے اس کی ایک کڑی سمجھ کر کام کر سکتی ہو کیونکہ بہرحال پادری کو نارٹن کے بینک نے قرضہ دیا ہے۔"

"چلو منظور ہے۔" لان لارنس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس میں کہاں فٹ ہوتے ہو۔؟"

"میں تمہارے ساتھ انٹرویو لینے چلوں گا" نک مسکرا کر بولا "اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم میرے لئے جگہ پیدا کرو۔"

"یہ ناممکن ہے۔ ہماری یونین۔۔۔۔"

"کوئی بات ناممکن نہیں ہے" نک نے بات کاٹ دی۔

بدھ تک لان لارنس نے انٹرویو کا انتظام کر لیا۔ اور اسی روز سہ پہر کو وہ نارٹن کے دفتر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک کیمرہ مین اور ایک ساؤنڈ ٹیکنیشن بھی تھے۔ آخری آدمی کا کردار نک ویلوٹ ادا کر رہا تھا۔ اس نے ایک وگ اور مصنوعی مونچھیں لگا رکھی تھیں یہ کوئی اچھا اور معیاری میک اپ نہیں تھا۔ لیکن نک کو یقین تھا کہ کمرے میں لان لارنس کی موجودگی میں نارٹن کسی اور طرف متوجہ نہیں ہو گا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مس لارنس" نارٹن نے کہا "آخر تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو۔؟"

"میں اس قرضے کے بارے معلوم کرنا چاہتی ہوں جو آپ نے پادری میبی کو نئے چرچ کی تعمیر کے لئے دیا ہے" لان نے جواب دیا۔

"میں شعبہ قرضہ جات کے فیصلے کو زیر بحث نہیں لا سکتا۔"

"لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ نے ذاتی طور پر قرضے کی درخواست منظور کی ہے۔"

"چرچ ایک ایسا مذہبی ادارہ ہے جسے حکومت کی طرف سے ٹیکس کی چھوٹ دی گئی ہے اور جب تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے لئے قرض منظور نہ کیا جاتے"۔

"کیا یہی بات کیمرے کے سامنے کہہ سکیں گے" لان نے پوچھا۔

نارٹن نے ناگواری سے کیمرہ مین کی طرف دیکھا۔

"یقیناً" وہ بولا "مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کیمرے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ نک ساؤنڈ وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور اس وقت بھی جب وہ مائکروفون کو صحیح زاویہ پر رکھنے کے لئے میز پر جھکا نارٹن نے اس کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر جب تک انٹرویو مکمل ہوا اور وہ لوگ رخصت ہوتے تو نارٹن کی ایش ٹرے بڑی صفائی سے اس بکس میں منتقل ہو چکی تھی جس میں ایمپلی فائر وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

○

ایش ٹرے پر قبضہ کرنے کے بعد نک کو چین کہاں آتا اس نے اسی سہ پہر نارٹن کو فون کیا۔

"تم میری فیس ادا کرنے کے بعد اپنی ایش ٹرے واپس لے سکتے ہو" نک نے کہا "رقم کی تعداد یاد نہ رہی تو بتا دوں کہ وہ پچیس ہزار ڈالر ہے۔"

"ویلوٹ" نارٹن کی حیرت زدہ آواز سنائی دی "تم اسے کس طرح۔۔۔۔؟"

"اصولاً تو مجھے دگنی فیس کا مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ اسے مجھے دو مرتبہ چرانا پڑا ہے" نک نے بات کاٹی۔

"اس لعنتی ایش ٹرے کو تم اپنے پاس ہی رکھو" نارٹن نے کہا۔ "وہ اب مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی"۔

"یہ بات اتنے یقین سے مت کہو" نک نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

اگلی صبح وہ پھر پادری میبی سے ملاقات کرنے پہنچ گیا۔ پادری نے حسب سابق مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

"تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسٹر ویلوٹ" اس نے کہا۔ "کیا تم نے اپنے موکل سے عطیے کے بارے میں بات کی۔؟"

جواب دینے کے بجائے نک اٹھ کر ایکیوریم کے پاس آکھڑا ہوا۔ وہ بولا۔ "آج اس میں پانی کی سطح اس روز سے کچھ کم معلوم ہوتی ہے"۔

"وکیا" پادری نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے"۔ نک نے گویا جواب دیا۔

"میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے فلپ نارٹن کی ایش ٹرے تمہارے ایکیوریم سے نکالی ہے" نک نے بتایا۔

پادری میبی کا ہاتھ اپنی میز کی دراز کی طرف بڑھا لیکن نک اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے لات مار کر دراز بند کردی نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کا ہاتھ دراز کی زد میں آگیا۔ اس کے منہ سے ایک دبی چیخ نکلی۔

"تمہیں ریوالور نکالنے کی ضرورت نہیں ہے" نک بولا "میں تمہارے نہیں نارٹن کے پیچھے پڑا ہوا ہوں"۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" پادری میبی نے اپنا ہاتھ نکال کر کلائی ملتے ہوئے پوچھا۔

"معلومات" نک نے جواب دیا "تم نے ایش ٹرے کو نارٹن سے زبردستی قرضہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا تھا"۔

"تو پھر"۔

"میں پوری داستان سننا چاہتا ہوں اور اگر تم نے انکار کیا تو جو کچھ مجھے معلوم ہے اسی کے ساتھ پولیس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی رپورٹر للن لارنس اس خفیہ والٹ کے بارے میں یقیناً دلچسپی لے گی جو صرف نارٹن کی انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے"۔

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔؟"

"میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے"۔

"کیا تم مجھ پر کسی بدعنوانی کا الزام لگا رہے ہو؟" پادری میبی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"صرف حقائق بیان کر رہا ہوں۔ اگر بلیک میل کوئی بدعنوانی ہے تو پھر شاید میں تمہیں اسی کا مرتکب قرار دے رہا ہوں"۔

"تو پھر تمہاری اطلاع کے لئے بتاتا ہوں کہ نارٹن مجھ سے کہیں زیادہ بڑا مجرم ہے" پادری میز پر جھکتے ہوئے بولا۔

"مثلاً کس بات کا؟" نک نے فوراً پوچھا۔

"گذشتہ سال ایک عورت۔ ایک بوڑھی بیوہ۔ ہمارے چرچ کی ممبر بنی۔ کافی مالدار تھی۔ اگر میں یہ کام کیلیفورنیا میں کر رہا ہوتا تو وہاں دولت مند گھرانوں کے لڑکوں لڑکیوں کو پھانسنا مفید ہوتا۔ لیکن یہاں نیویارک میں ہمیں امیر بوڑھی عورتوں کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن اس عورت کے معاملہ میں مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھ سے پہلے ہاتھ صاف کر چکا ہے"۔

"فلپ نارٹن؟" نک نے پوچھا۔

"ہاں" پادری نے اثبات میں سر ہلایا "وہ اس کا بینکر تھا۔ اور ایک خوبصورت شیطان بھی۔ اس نے عورت سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلئے۔ عورت کا مرحوم شوہر اس کے لئے کئی چیزیں چھوڑ گیا تھا۔ جن میں سب سے قیمتی چیز پرانے نایاب سکوں اور ٹکٹوں کا ایک ذخیرہ تھا جس کی قیمت ادنیٰ اندازے کے مطابق ایک لاکھ ڈالر سے کہیں زیادہ تھی۔ عورت چاہتی تھی کہ یہ ذخیرہ اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کو ملے۔ اس سے پہلے نہیں سوال یہ تھا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ گھر میں وہ چوروں کی دسترس سے محفوظ نہ رہتا اور اگر بینک میں رکھتی تو یقینی طور پر اس کا علم حکومت کو ہو جاتا اور پھر اس کی موت کے بعد ورثہ تقسیم ہونے سے پہلے اس پر اتنے ٹیکس عائد ہو جاتے کہ وارثوں کو معقول حصہ نہ ملتا۔ اس مشکل کا حل اس کے بینکر فلپ نارٹن نے پیش کیا۔ اس کا دوست اور مالی مشیر ہونے کی حیثیت سے اس نے مشورہ دیا کہ اس ذخیرے کو بینک میں اس کے ذاتی والٹ میں محفوظ کر دیا جائے اس کے بارے میں بینک کو یا حکومت کو اس ذخیرے کا پتہ نہیں لگے گا۔ اور وہ عورت کے مرنے کے بعد جوں کا توں اس کے وارثوں کے سپرد کر دے گا عورت کو اس پر مکمل اعتماد تھا اس نے اپنا ذخیرہ نارٹن کے حوالے کر دیا۔ نارٹن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس بارے میں ایک علیحدہ تحریر لکھ کر اپنے فائل میں لگا دے گا تاکہ اگر اتفاق سے اس کا انتقال عورت سے قبل ہو جائے تو اس کا وکیل اس ذخیرے کو عورت یا اس کے وارثوں کو واپس کر دے۔ لیکن اس نے یہ چالاکی کی کہ عورت کو اس تحریر کی کوئی نقل نہیں دی تاکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ رہے، عورت نے مجھے بتایا کہ اس نے کبھی یہ نقل مانگی بھی نہیں"۔

"تم ایش ٹرے پر بنے ہوئے اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے" نک نے پوچھا "کیا تمہیں یہ توقع تھی کہ اتنے حفاظتی انتظامات کے باوجود بینک میں موجود اس کے ذاتی والٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ گے"۔

"نہیں" پادری میبی نے جواب دیا "ظاہر ہے کہ میں انگلی کا نشان حاصل کرنے کے باوجود والٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ نارٹن کو معلوم ہو جائے کہ میں اس کے خفیہ والٹ کی موجودگی سے واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ اس کے اندر کیا کچھ رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے ایش ٹرے چرائے جانے سے اندازہ لگا لیا۔ سمجھ گیا کہ میں اس کا راز جانتا ہوں یہ بھی وجہ تھی کہ اس نے میری قرضے کی درخواست منظور کرنے کی اجازت دے دی"۔

"کیا صرف اس بوڑھی بیوہ کے سکوں اور ٹکٹوں کے ذخیرے کی وجہ سے؟" نک نے پوچھا۔

"صرف وہ ہی ایک نہیں تھی۔ مجھے ایک دوسری بیوہ عورت کے بارے میں بھی معلوم ہے جس نے اسے اپنے تمام چاندی کے برتن اور زیورات والٹ میں رکھنے کے لئے دے دیئے تھے اور یہ سب آف دی ریکارڈ۔ گویا یہ ایک بینک کے اندر دوسرا پرائیویٹ بینک قائم تھا۔ اور بھی معلوم نہیں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ نارٹن کا والٹ روم کسی بڑے خزانے سے کم نہیں ہوگا۔"

"حکومت کے نزدیک یہ حرکت یقیناً ناپسندیدہ ہوگی اور اسی طرح بینک کے اسٹاک ہولڈروں کے لئے بھی" نک نے کہا "بات کھل جائے تو نارٹن ایک لمحے کے لئے بھی اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہ سکتا"۔

"چنانچہ میری حرکت بلیک میل ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی" پادری پہلی مرتبہ مسکرایا "اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔؟"

"تم دونوں جعلساز اور فراڈیئے ہو" نک بولا "جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن نارٹن کے بارے میں پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے۔ وہ عورت کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو وہ ذخیرہ دے ہی دے"۔

"اس کا انتقال ہو چکا ہے" پادری میبی نے بتایا۔ "اور نارٹن نے ذخیرہ واپس نہیں کیا"۔

"وہ مر چکی ہے؟" نک نے چونک کر پوچھا۔

"ایک ماہ ہوا۔ اور نارٹن نے اس کے وارثوں کو ذخیرے کی ہوا نہیں لگنے دی۔ میں اس لیے جانتا ہوں کہ میں نے ان سے پوچھا تھا"۔

"پھر تم نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی"۔

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مجھے یہ ہی مناسب معلوم ہوا کہ میں اس معاملے کو اپنے طور پر نبٹوں"۔

"میری بات سنو" نک نے دفعتاً کہا۔ "میں نے ایش ٹرے دوبارہ حاصل کرلی ہے۔ میں نے اسے نارٹن کو دیا تھا مگر اس نے میری فیس ادا نہیں کی۔ چنانچہ میں نے پھر چرا لیا۔ ہم دونوں مل کر اسے نارٹن کے والٹ میں داخل ہونے کا ذریعہ بنائیں گے"۔

"اب اس پر نارٹن کی انگلی کے نشانات نہیں ہونگے" پادری میبی نے کہا "وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے مجھے بھی اس کی امید نہیں ہے"۔

"تب پھر ہم والٹ میں کیسے داخل ہو سکیں گے"۔

"فلپ نارٹن خود ہمارے لیے والٹ کھولے گا" نک نے جواب دیا۔

o

نک کو سب سے پہلے جو بات معلوم کرنا تھی وہ یہ تھی کہ نارٹن کا ذاتی والٹ بینک میں کس جگہ واقع ہے۔ اس سلسلہ میں اسے نیویارک کنسٹرکشن کمپنی سے مدد ملی جس نے بینک کی عمارت تعمیر کی تھی کمپنی کے فائلوں میں بینک کی عمارت کا نقشہ اب بھی موجود تھا۔ اس نے متعلقہ فرد کو مناسب رشوت پیش کی۔ اور اسے اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ ایک گھنٹے تک تنہا اس فائل کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ نک نے نقشے میں دیکھا کہ عمارت کی ۵۶ ویں منزل پر جہاں نارٹن کا آفس تھا کوئی والٹ نہیں دکھایا گیا تھا البتہ ایک الماری کے جتنے سائز کا ایک اسٹرانگ روم اس سے نچلی منزل یعنی ۵۵ ویں فلور پر ضرور موجود تھا۔ عمارت کی ڈائرکٹری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فلور پر تمام متعلقہ شعبہ جات کی سیکرٹری کام کرتی تھیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ انہیں کسی اسٹرانگ روم کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس لیے لازمی تھا کہ یہ ہی نارٹن کا ذاتی والٹ ہو۔

اس سے اگلی صبح حسب پروگرام نک پادری میبی سے بینک کی عمارت کے باہر ملا۔

"تمہیں پتہ ہی ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے" نک نے پوچھا۔

"جانتا ہوں۔ مگر یہ مجھے پسند نہیں۔ تم مجھے بہت گہرائی میں لیے جا رہے ہو"۔

"تم پہلے ہی کافی گہرے اتر چکے ہو۔ اگر اس ترکیب سے تمہیں للن لارنس سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ تو تمہیں میرا ممنون ہونا چاہیئے"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو" پادری میبی نے جواب دیا "وہ ہے کہاں۔ میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ وہ بھی اس پلان میں شامل ہے؟"

"جب اس کی ضرورت ہوگی وہ بھی آجائے گی" نک نے جواب دیا۔

وہ لفٹ کے ذریعہ ۵۵ ویں منزل تک پہنچے۔ نک نے نقشے کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ الیکٹریکل فیوز بکس کس جگہ ہے۔ وہ سیدھا وہیں پہنچا۔

"الارم سسٹم کا تعلق لازماً اس فیوز بکس سے بھی ہوگا"۔ اس نے پادری سے کہا۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ نارٹن کے پرائیویٹ والٹ میں الارم بھی لگا ہے۔؟"

"ایک ایسے بینک میں ہر مقفل دروازے میں کوئی نہ کوئی الارم فٹ ہوگا۔"

"اگر تم نے فیروز بکس کو چھوا یا چھیڑا تو عین ممکن ہے کہ والٹ کا الارم بجنے لگے۔"

"میں بالکل یہی کرنا چاہتا ہوں۔" نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

○

فلپ نارٹن اس وقت مختلف شعبہ جات کے مینجروں کے کے اجلاس میں مصروف تھا۔ اچانک اس کی سیکرٹری نے فنا کر دیا۔

"۵۵ ویں منزل پر الارم بج رہا ہے۔ کوئی آپ کے والٹ میں گھسنے کی کوشش نہ کر رہا ہو۔"

"پھر مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔" نارٹن نے ناگواری سے کہا۔ "سیکورٹی گارڈ کو لے جاؤ۔"

سیکرٹری کچھ دیر کے بعد پھر واپس آئی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جناب۔" وہ بولی۔ "کہ کوئی آپ کے والٹ میں بند ہو گیا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ کوئی شخص والٹ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک ......" نارٹن کہتے کہتے رک گیا۔

اس نے میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے افراد کی طرف دیکھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں حضرات۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ایک ضروری کام میری فوری توجہ چاہتا ہے۔"

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ سیکرٹری اس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے ۵۵ ویں منزل پر آئے۔ یہاں تمام سیکرٹریوں میں بوکھلاہٹ مچی ہوئی تھی۔ الارم کی گھنٹی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ نارٹن مختلف دفاتر سے گزرتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں اس کا نجی والٹ واقع تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں پادری فیلکس مینی کے ساتھ ہی دو سیکورٹی گارڈ بھی کھڑے ہیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" نارٹن نے پادری سے پوچھا۔

"دیلوٹ والٹ کے اندر بند ہو گیا ہے۔" پادری مینی نے فرش پر پڑی ہوئی ایش ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے تمہاری انگلی کا نشان ایش ٹرے سے حاصل کر کے اس سے والٹ کھول لیا۔"

یہاں الارم کی گھنٹی کا شور زیادہ تھا۔ نارٹن سیکورٹی گارڈ کی طرف گھوما۔

"اس الارم کو بند کر دو۔" اس نے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تم نے اسے اندر آتے جاتے دیکھا تھا؟"

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

جب دیلوٹ نے گارڈ کو آتے دیکھا تو اس نے اندر سے والٹ کا دروازہ بند کر لیا۔ پادری بول اٹھا۔ "معلوم نہیں اس سے کیا گڑبڑ ہو گئی کہ جب اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔" نارٹن نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں والٹ کھولنا ہی پڑے گا۔" ایک گارڈ اپنا ریوالور نکالتے ہوئے بولا۔

"بڑی خوشی سے۔" نارٹن نے کہا۔ "میں خود اس حرکت کے لیے دیلوٹ کو جیل میں سڑائے بغیر نہیں مانوں گا۔ کوئی وکیل اسے بینک میں ڈاکہ ڈالنے کے الزام سے بری نہیں کرا سکتا۔"

نارٹن نے والٹ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اوپر لگے ہوئے ایک چھوٹے سے چوکور شیشے پر رکھ دیا۔ اس کے انگوٹھا رکھتے ہی قفل کا الیکٹرانک سسٹم حرکت میں آیا۔ نارٹن کے انگوٹھے کا عکس الیکٹرانک سسٹم میں محفوظ عکس سے ملتے ہی قفل کھل گیا۔ نارٹن نے دروازہ کھول دیا مگر اسٹرانگ روم بالکل خالی تھا۔

○

"کیا مجھے تلاش کر رہے ہو؟" پیچھے سے نک کی آواز آئی۔

"تم کہاں تھے؟" نارٹن نے تیزی سے پلٹ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

"میں برابر کے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔" نک نے جواب دیا۔ "یہ محض تمہیں والٹ کھولنے پر آمادہ کرنے کی ایک ترکیب تھی۔ ظاہر ہے کہ میں خود یہ حرکت کر کے کسی جرم کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔"

نارٹن نے گھوم کر پادری مینی کی طرف دیکھا۔

"تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔" اس نے کہا۔ "تم کہہ رہے تھے کہ یہ اندر ہے۔"

"ممکن ہے میرے الفاظ نے تمہیں کوئی ایسا تاثر دیا ہو۔" پادری نے جواب دیا۔

نارٹن نے خود کو سیکورٹی گارڈز اور بینک کے دوسرے عملے کے درمیان گھرا پا کر سنبھلنے کی کوشش کی۔

"اچھی بات ہے دیلوٹ۔" اس نے کہا۔ "تم خود دیکھ سکتے ہو کہ میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے میں چھپانے کی کوشش کروں۔ میرا یہ نام نہاد والٹ اندر سے بالکل خالی ہے۔"

نک نے والٹ میں داخل ہو کر دیکھا۔ نارٹن بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ والٹ میں کئی کھلی الماری نما خانے بنے ہوئے تھے مگر وہ سب خالی تھے۔

"ٹھیک ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے بلند آواز سے لان لارنس کو پکارا۔

اور دفعتاً پتہ نہیں کہاں سے نکل کر لان لارنس مع اپنے کیمرہ مین وغیرہ کے سامنے آ گئی۔

"ہمیں کس شے کی منظر کشی کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک خالی والٹ کا۔ اس کی منظر کشی کرو اور اسے چھ بجے کی خبروں میں ٹیلی کاسٹ کرنے کا انتظام کرو۔ میں اس کے ساتھ بیان کرنے کے لیے تمہیں ایک دلچسپ کہانی فراہم کر دوں گا۔"

فلپ نارٹن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "تم ایک خالی والٹ کی فلم کیوں بنانا چاہتے ہو؟"

"اس سے بالکل برعکس جو میں اور پادری مینی کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔" نک نے جواب دیا۔ "اسے ایش ٹرے کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ تمہارے انگوٹھے کے نشان کی مدد سے اس والٹ میں داخل ہو کر وہ خزانہ چرا سکے۔ جو اس کے خیال میں یہاں پوشیدہ تھا۔ یا اگر خزانہ نہ ملے تو چرانے کی دھمکی دے کر تم سے اپنا کام کرا لے۔ اور میں اس کے برعکس صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس والٹ میں اب کوئی خزانہ موجود نہیں ہے۔ ٹی وی پر اس خالی والٹ کی فلم بہت سی بیوہ عورتیں دیکھیں گی۔ اور حیرت و تعجب سے سوچیں گی کہ ان کے زیورات، ان کے چاندی کے برتنوں اور قدیم سکوں اور ٹکٹوں کا کیا بنا جو انہوں نے تمہیں اس والٹ میں رکھنے کے لیے دیئے تھے۔ یقین کرو کہ کل صبح تمہیں بہت سی معزز خواتین کے سامنے اس کی کوئی معقول وضاحت پیش کرنا پڑے گی۔"

مارٹن جس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا بہت ہی آہستہ آواز میں بولا۔

"لعنت ہو دیلوٹ۔ اس عورت اور اس کے کیمرہ مین کو روک لو۔ میں تمہیں تمہاری فیس ادا کر دوں گا۔"

"دے نہیں دوں گا۔ بلکہ ابھی دو۔ اور وہ بھی نقد۔"

"منظور ہے۔" نارٹن کو کہنا پڑا۔

نک دیلوٹ مسکرایا اور لان لارنس کی طرف دیکھا۔

"بس کافی ہے لان۔ اب فلم نہیں بنائی جائے گی۔"

اس کے بیس منٹ بعد نک بینک سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اس کی جیب میں اس کی مطلوبہ فیس موجود تھی۔ پچیس ہزار ڈالر کے بالکل نئے اور کرارے نوٹ جو نارٹن نے اسی وقت اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے نکلوا کر دیئے تھے اس ادائیگی کے وقت لان لارنس بھی موجود تھی اور رقم کی وصولیابی کے بعد اس کے ساتھ ہی باہر جا رہی تھی۔

"میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" وہ بولی۔ "مگر پھر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ اس نے تو سچ مچ تمہیں رقم ادا کر دی۔"

"ہاں وہ فیس جو ایک کاروباری معاہدے کے سلسلے میں کئی دن سے واجب تھی۔"

"ممکن ہے بعد میں وہ پولیس میں رپورٹ کر کے یہ دعویٰ کرے کہ اسے تم نے چرایا ہے۔"

"کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے کئی گواہوں کی موجودگی میں خود اپنے ہاتھوں سے رقم دی ہے۔"

"کیا وہ یہ تو نہیں سمجھ رہا ہے کہ تمہیں فیس ادا کر کے اس نے مجھے یہ داستان استعمال کرنے سے بھی روک دیا ہے۔"

"ممکن ہے اس نے یہی تاثر لیا ہو۔" نک نے جواب دیا۔ "غلط نتائج اخذ کرنے میں وہ بہت تیز ہے۔"

"اس کیس میں پادری مینی کہاں فٹ ہوتا ہے۔" لان لارنس نے پوچھا۔

"وہ تمہیں اس بارے میں بتلائے گا کہ حقیقت میں اس والٹ کے اندر کیا ہونا چاہیے تھا۔" نک نے کہا۔ "ایک ایسا خزانہ جسے نارٹن نے کئی دولت مند بیوہ عورتوں کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جمع کیا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے بینک کا صدر فراڈ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔؟"

"کوئی اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا اور اس لیے وہ ابھی تک بڑی کامیابی سے دوسروں کی دولت پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ اس کی نجی زندگی کو چیک کرنا ممکن ہے۔ تمہیں پتہ چلے کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ ممکن ہے وہ بینک کے اثاثے کو بھی اپنے ذاتی قرض ادا کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہو۔ کچھ بھی سہی اس نے غالباً وہ تمام چیزیں فروخت کر دی ہیں جو بیوہ عورتوں نے امانتاً اس کے سپرد کی تھیں۔ نارٹن جیسے آدمی پر شبہ کرنے کے لیے پادری مینی جیسے جعلساز کا ذہن ہی کام کر سکتا تھا۔"

"اور اسے شکست دینے کے لیے تم جیسے ایک چور کی ضرورت تھی۔" لان لارنس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید۔" نک نے اعتراف کیا۔ "لیکن اپنی کہانی میں میرا نام شامل مت کرنا۔ میں پبلسٹی قطعی پسند نہیں کرتا۔"

نک دیلوٹ اسے بینک کے سامنے چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ لیکن گھر جاتے ہوئے اس کے ذہن کو یہ خیال پھر بھی پریشان کر رہا تھا کہ اس کیس میں اس نے ایک چیز دو مرتبہ چرائی مگر اسے فیس صرف ایک مرتبہ کی وصول ہوئی۔

چاہتی۔ مجھے بھی کوئی وجہ نظر نہیں آئی کہ خواہ مخواہ اس سے جرح کرتا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔ "ایک بات تمہیں بتاؤں ــــ؟"

"بتاؤ۔" اس کا جواب موصول ہوا۔

"اب مجھے تم سے ڈر نہیں لگتا ــــ"

وہ یکایک کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اور ہرچند کہ آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر مجھے چاندی کی گھنٹیوں کا خیال آگیا۔ اس کی ہنسی کا تاثر ننھی ننھی گھنٹیوں کی جھنکار سے مشابہ تھا۔ وہ چند لمحے ہنستی رہی۔ پھر بولی ــــ "کیا پہلے ڈرتے تھے ــــ؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "پہلے مجھے واقعی ڈر لگتا تھا ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"شاید اس لئے کہ تم دکھائی نہیں دیتیں، نہ ہی تمہاری آواز سنائی دیتی ہے۔ میں تمہیں اور تمہاری آواز کو صرف محسوس کرتا ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ــــ؟"

اس نے سرگوشی میں کہا ــــ "مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچاتی ــــ"

قدرے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "کیا تمہیں میرے موجودہ حالات کا علم ہے ــــ؟"

"ہاں کسی حد تک ــــ"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کنپٹی پر پھیرا اور مایوسی سے اس طرف دیکھا، جدھر میرے احساس کے مطابق وہ بیٹھی تھی۔ پھر میں نے کہا۔ "میں ہر طرف سے مصائب میں گھرا ہوا ہوں۔ وہ لوگ مجھے چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میں اس ریگستان سے زندہ اور محفوظ نکل سکوں گا۔ کیا تمہیں ان تمام باتوں کا علم ہے۔ اور کیا تم بتا سکتی ہو کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکوں گا یا نہیں ــــ؟"

اس نے اس بات کا جواب دینے کے بجائے کہا ــــ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے فرار ہو کر صحیح قدم اٹھایا ہے ــــ؟"

"کیا میں نے غلط قدم اٹھایا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس کا جواب محسوس ہوا۔ "مگر یہ طے ہے کہ تم نے ہزاروں دشمن پیدا کر لئے ہیں۔ اور تم اکیلے ان سب کا مقابلہ کب تک......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ یکایک میرے کانوں میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ دائیں جانب سے پیڈی بے تحاشا دوڑتا چلا آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کی سانس بری طرح پھول رہی ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ــــ "کیا بات ہے پیڈی ــــ؟"

"ماسٹر وہ...... وہ۔" اس نے ہانپتے ہوئے الفاظ ٹکڑوں میں ادا کئے۔ "...... ادھر...... وہاں...... ماریا کی لاش پڑی ہے ــــ"

"ماریا کی لاش ــــ کہاں ــــ کدھر ــــ؟" میں نے سٹ پٹا کر پوچھا۔

"اس طرف۔ میرے ساتھ آیئے ــــ"

یہ کہہ کر وہ واپس گھوما اور پھر دوڑنے لگا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ میرے تصور میں ماریا کا سانولا لیکن دلکش چہرہ گھوم رہا تھا۔ اور وہ منظر جب میں نے اسے باربرا کے بستر پر بظاہر مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ اگر پیڈی نے واقعی ماریا کی لاش دیکھی ہے تو یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوا ہوگا۔ کیا وہ تنہا تھی یا اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے، جو اس کی موت کے بعد اس کی لاش وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر اس کی موت کا سبب کیا ہوگا؟ میں انہی خیالوں میں الجھا ہوا دوڑتا رہا۔ ہم نے تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ پھر ہم ایک دراڑ سے گزر کر ایک اونچے ٹیلے کے دامن میں پہنچے۔ اور تب پیڈی یکایک سٹ پٹا کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت بوند بوند کر کے ٹپک رہی تھی۔

"یہاں تو کوئی لاش نہیں ہے۔" میں برگشتہ ہو کر اسے گھورا۔

"ماسٹر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ لاش یہیں تھی، اس جگہ۔" پھر اس نے گھوم کر ہاتھ سے اپنے عقب میں اشارہ کیا۔ "میں نے اس چٹان سے لاش دیکھی تھی۔ پھر میں یہاں آیا تو پتہ چلا کہ وہ لاش ماریا کی ہے۔ ٹھیک اس جگہ، یہ دیکھئے، نشان بھی صاف موجود ہے۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کے بعد میں بھاگ کے آپ کو اطلاع دینے گیا تھا۔"

میں نے تذبذب اور شک و شبہے کے ساتھ پیڈی کو گھورا۔ پھر زمین کے اس حصے کو دیکھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس جگہ، نرم ریتیلی زمین پر واقعی ایک انسانی جسم کا خاصا واضح نشان موجود تھا جیسے کوئی شخص وہاں کچھ دیر لیٹا رہا ہو۔ مگر وہاں کوئی لاش نہیں تھی ــــ کیا پیڈی نے کوئی سپنا دیکھا تھا؟

(باقی آئندہ ماہ)

کیرن کے شوہر نے اپنی بیوک لاس اینجلز ائیرپورٹ کی اس سڑک پر موڑ دی جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ حسب عادت کیرن کا موڈ بگڑ گیا اور وہ کھنچی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہیں پتہ نہیں، یہاں پارکنگ ممنوع ہے؟ کیا چالان کروانے کا شوق ہے؟"

"چالان ہوتا ہے تو ہونے دو۔" ارل نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ وہ اپنی بیوی کے اس لب و لہجے کا عادی ہو چکا تھا۔ کڑوی کسیلی باتیں اب اس پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔ اس کی بک بک جھک جھک کی اہمیت نہیں رہی تھی۔

"تم رئیس زادے تو نہیں ہو جو جرمانے کی بھاری رقم کے متحمل ہو سکو۔ یہاں گاڑی کھڑی کی تو کم از کم پچاس ڈالر جرمانہ دینا پڑے گا۔"

"تم طیارے میں سوار ہونا نہیں چاہتیں؟"

"کیوں نہیں چاہتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم چالان کرواتے پھرو۔"

ارل نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر کے ہینڈ بریک دبا دیا۔ انجن بند کر کے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "تمہارے پاس صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد تم جہاز پر سوار نہیں ہو سکو گی۔ پھر تم نے بورڈنگ کارڈ وغیرہ بھی نہیں لیا۔ اب کیا کہتی ہو؟ چلو جلدی کرو، وقت بہت کم ہے، واپسی پر جتنا جی چاہے لڑ لینا۔"

ارل نے جلدی سے ڈکی کھول کر کیرن کا سوٹ کیس نکالا اور ڈکی کو دوبارہ مقفل کر دیا۔ اتنے میں ایک قلی سامان کے لیے آگے بڑھا۔

ایک بوڑھے کروڑپتی کی بیوی
چاروں طرف سے خطرات میں گھر گئی تھی
بیوی سے تنگ آئے ہوئے
ایک نوجوان نے
اس کا ساتھ دیا تھا

امریکا سے تازہ ترین
اس کہانی کا عنوان
آپ کو منتخب کرنا ہے

شہلا پاریکھ

ارل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بھگا دیا اور تیز قدموں سے ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے اندرونی پروازوں کے لیے مخصوص وسیع و عریض ہال میں داخل ہوگئے۔

"ڈینور کو جانے والی فلائیٹ تین سات" ۔ کلرک نے کہا۔ اس نے کیرن کے ٹکٹ کو دیکھا پھر کلائی گھڑی پر نظر ڈالی "جہاز آٹھ بج کر پچیس منٹ پر روانہ ہوگا۔ نو نمبر گیٹ سے آپ طیارے کی طرف جاسکتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمام مسافروں کا سامان جہاز پر رکھا جاچکا ہے۔ آپ کو سوٹ کیس خود ہی گیٹ تک لیجانا پڑے گا۔ جلدی کیجئے، ورنہ آپ جہاز پر سوار نہیں ہوسکیں گی۔"

جگمگ کرتے صاف ستھرے ہال میں وہ دونوں خودکار زینے کی جانب بڑھنے لگے۔ آن کی آن میں وہ نو ہی گیٹ پر پہنچ چکے تھے وہاں کھڑے ہوئے منتظم نے کیرن کے ٹکٹ کا جائزہ لیا اور اسے بتایا کہ پانچ منٹ بعد طیارے سے سیڑھیاں ہٹالی جائیں گی۔ اس نے سوٹ کیس کیرن کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ دونوں گیٹ سے نکل آئے سامنے ہی دیوہیکل طیارہ پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔

ارل طویل قامت اور وجیہہ شخص تھا۔ عمر چھتیس برس تھی مگر دیکھنے میں تیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اس کی نوکری کچھ اس قسم کی تھی کہ اسے ہر دم مسکراتے رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ وہ اینگل ووڈ بینک میں لون آفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔

کیرن نے سرد مہری سے کہا۔ "میں کل رات تمہیں فون کروں گی۔ ٹھیک آٹھ بجے جب ٹرنک کال کے ریٹ کم ہوجاتے ہیں۔ بھولنا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ فون کی گھنٹی بجتی رہے اور کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔"

ارل نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں بھلا کہاں جاؤں گا؟ کسی کلب میں عیاشی کرنے سے تو رہا۔"

"تم فلم دیکھنے تو جا ہی سکتے ہو۔"

"آج کل کی واہیات فلموں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں دو دن کے لیے تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں لیکن میرا جانا ناگزیر ہے۔ اس کے لیے تم مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ کیا تمہیں اس امر کا احساس نہیں کہ میری ماں سے یہ ملاقات آخری بھی ثابت ہوسکتی ہے؟"

بہت خوب، ارل نے سوچا، ماں بسترِ مرگ پر پڑی ہے تو لاڈلی بیٹی کو اس کا خیال آیا ہے۔ کیا اس سے پہلے اس کی خبر نہیں لے سکتی تھی؟

ظاہر ہے، وہ اس قسم کی بات اپنی تیز طرار بیوی سے نہیں کہہ سکتا تھا لہٰذا اس نے شیریں لہجے میں کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسے نازک وقت میں تمہیں ان کے قریب ہونا چاہیے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور...... " ایک مرتے ہوئے شخص کو کیا پیغام دیا جاسکتا ہے؟ وہ کوئی مناسب بات نہیں سوچ سکا۔

"میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو" کیرن نے طیارے پر نظریں جما کر کہا۔ "مجھے چلنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ سیڑھیاں ہٹا دیں ـــ" اس کے چہرے پر اداسی چھاگئی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے ارل سے بچھڑنے کا دکھ نہیں تھا۔ وہ کیرن کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ آج تک وہ جذباتی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عملی قسم کی عورت تھی۔ سچ وغم کو حماقت سمجھتی تھی۔

کیرن کے چھوٹے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے۔ اس کی عمر اکتیس برس تھی مگر دیکھنے میں ارل سے بڑی لگتی تھی۔ قبول صورت اور پستہ قد تھی۔ اطوار بھی مردانہ سے تھے۔ باتوں میں اس سے کوئی جیت نہیں سکتا تھا۔ شوہر کو ہاتھ تلے میں رکھنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ ایک تو گداز اور مشتعل کر دینے والا جسم اوپر سے وہ چست لباس پہنتی تو مرد اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ وہ اسے بھوکی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ارل نے بھی ایک مرتبہ کیرن کو اسی انداز سے دیکھا تھا مگر اب اس کے لیے کیرن میں ذرا بھی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی عادت بن گئی تھی۔ ارل کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

"اچھا تو پھر اتوار کی شب ملاقات ہوگی" کیرن نے کہا۔ "زیادہ تر گھر ہی میں رہنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری عدم موجودگی میں تم فضول خرچی کرتے پھرو ـــ"

"میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا ڈارلنگ۔"

"جہاز شام ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جائے گا" وہ طیارے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اتوار کی شام ٹریفک کی بھرمار ہوتی ہے میں ٹیکسی کر کے گھر پہنچ جاؤں گی۔ سات بجے میرا انتظار کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ ـــ" ارل نے قدرے جھلا کر کہا۔

"خدا حافظ ڈارلنگ ـــ" کیرن نے اس کا لٹکا ہوا الوداعی بوسہ لیا اور جہاز کی طرف دوڑنے لگی۔

ارل خالی خالی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے لگا اسے اپنی بیوی کے رخصت ہونے کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا نفرت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جو وہ اکثر ابھار دیا کرتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔ وہ اب تک ایسا کر چکا ہوتا مگر حالات نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ طلاق کی صورت میں عدالت کیرن کے لیے جو گزارہ الاؤنس منظور کرتی اسے ادا کرنے کے بعد اس کے پاس بمشکل کھانے کے پیسے بچتے۔ وہ ارل سے علیحدگی کے لیے لمبے چوڑے مطالبات بھی کرسکتی تھی۔ کیرن کو یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ارل کو اس سے علیحدگی کے لیے آمادہ نہیں کرسکتی۔ اس احساس نے کیرن کا مزاج بگاڑ رکھا ہوا تھا۔ ارل پوری طرح اس سے بیزار ہوچکا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس بیہودہ عورت کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے دل میں ازدواجی زندگی کی کوئی امنگ، ولولہ اور جوش باقی نہیں رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ مایوس نہیں تھا۔ اس گھور اندھیرے میں اسے امید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ اس کی بور اور بیزار کن زندگی میں ایک نیا موڑ ضرور آئے گا۔ کوئی ایسی بات ظہور پذیر ہوگی کہ اس کے سارے دلدر دُور ہوجائیں گے۔

بالآخر اس کی قسمت کھل گئی۔ قطعی غیر متوقع طور پر اسے دولت ملنے کی امید ہوگئی۔ ہوا یوں کہ اس کے ایک چچا کا انتقال ہوگیا ارل اس کا واحد رشتے دار تھا۔ چچا نے اس کے لیے ستائیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم چھوڑی تھی۔ ارل کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بڑے میاں اس سے اتنی محبت کرتے ہوں گے۔

وصیت کے عملدرآمد میں دو ایک قانونی پیچیدگیاں حائل تھیں۔ وصیت ہر لحاظ سے مکمل تھی مگر اسے ستائیس ہزار ڈالر کے لیے کئی مہینے انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار اس کے لیے سخت ذہنی کوفت اور اذیت کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رقم متعلقہ افراد سے چھین کر لے آئے۔ وہ کیرن کی مطلوبہ رقم اس کے منہ پر مار کر یورپ اور ایشیا کی سیر کو نکل جانا چاہتا تھا۔ فی الحال تو وہ آنے والے وقت کے دل خوش کن تصورات کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔

کیرن طیارے میں داخل ہوگئی۔ تو وہ واپس چل دیا۔ خودکار زینے کے ذریعے وہ مرکزی ہال میں پہنچ گیا۔ جہاں سینکڑوں افراد اپنے عزیز رشتے داروں اور دوستوں کو الوداع کہنے آئے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کر رہے تھے۔ ارل ذہن پر انجانا سا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ کیرن کے رخصت ہونے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ہال میں جدائی کے رقت آمیز مناظر نے اسے اداس کر دیا تھا۔

ارل کا جی سڑک کے پار ائیرپورٹ بار میں مشروب پینے کو چاہ رہا تھا مگر وہ بیوک کو اس سڑک پر کھڑی کرنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ بیزاری کا احساس لیے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہال سے باہر آگیا۔

ارل دیر سے باہر پہنچا تھا۔ کوئی پولیس افسر اپنا کام کر کے جاچکا تھا۔ چالان کی رسید بیوک کی ونڈ شیلڈ پر چپکی ہوئی تھی۔ لعنت ہو کیرن پر، اس کا خیال اکثر و بیشتر صحیح ثابت ہوتا تھا۔ بیوک کو اب ہٹانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چالان تو ہو ہی چکا تھا۔

ائیرپورٹ بار روم بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ طویل کاؤنٹر پر ایک اسٹول خالی تھا۔ جس پر ارل نے جلدی سے قبضہ جما لیا۔ ارل کے برابر لانبے سیاہ بالوں والی ایک حسین اور دیدہ زیب لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے تھوڑے آگے بار روم میں داخل ہوئی تھی۔

ارل کن انکھیوں سے اس کے سراپا قیامت کا جائزہ لینے لگا۔ لڑکی کی عمر پچیس سے تیس سال کے درمیان ہوگی۔ اس نے چمکیلے بالوں کو سلیقے سے پونی ٹیل کے انداز میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اور وہ باوقار انداز سے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں میں سونے کے قیمتی ایئرنگ جھول رہے تھے۔ لباس بھی عمدہ تراش کا اور بیش قیمت معلوم ہوتا تھا کم از کم کیرن کو تو آج تک ایسا لباس نصیب نہیں ہوا تھا۔ لڑکی کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں بڑی سی ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ارل نے ایسی خوبصورت اور پُروقار عورتیں بہت کم دیکھی تھیں۔ لڑکی کو گھورنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی پہنچ سے کہیں زیادہ باہر تھی۔ یہ کسی عجائب گھر کے شوکیس میں نادر اور نایاب زیورات دیکھنے والی بات تھی۔ وہ کسی طور بھی لڑکی کو حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ احمقوں کی جنت میں نہیں رہتا تھا۔ جو اس امر پر سنجیدگی سے غور کرتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ ارل کی موجودگی سے لاعلم تھی۔ اس کی تمام تر توجہ بار کے دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے ایک طویل قامت نوجوان پر تھی جو کسی میز کے خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نوجوان کا جسم مضبوط اور کسرتی تھا۔ صبح اور شام ورزش کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں گھورتی ہوئی عقابی سی تھیں۔ ارل نے نوجوان پر نظریں مرکوز کر دیں۔ جو لڑکی میں بظاہر زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ لڑکی نے اپنی نظریں جھکا لیں اور مشروب کے گلاس سے کھیلنے لگی۔ ارل اب پوری طرح ان دونوں کی جانب متوجہ ہوچکا تھا۔ اس کی تجسس طبیعت ان کے تعلق کا پتہ لگانا چاہتی تھی لیکن وہ جلد ہی اس جوڑے کو بھول گیا۔ اس نے مشروب کا پہلا گلاس ختم کیا اور دوسرے گلاس کا آرڈر دے دیا۔ ابھی وہ دوسرے گلاس کی ایک چسکی ہی لے پایا تھا کہ اسے اپنے شانے پر کسی کے نرم و نازک ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہی حسین اور دلکش لڑکی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیباکی سے کھڑی تھی۔

"معاف کیجئے" لڑکی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "کیا میں آپ سے چند لمحے گفتگو کرسکتی ہوں؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں یہ بات کہی تھی۔ وہ خاصی شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ ندامت سے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"یقیناً۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ ارل نے اپنے اندرونی جوش کو چھپاتے ہوئے پُروقار انداز میں کہا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں...... دراصل میں ایک خطرے میں گھر چکی ہوں ـــ" لڑکی نے نرم اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے مدد کی ضرورت ہے لیکن.... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس معاملے کو کہاں سے شروع کروں۔ مجھے

وضاحت پیش کرنے میں دقت ہو رہی ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تفصیل سے آپ کو سمجھا سکوں۔ معاملہ کچھ پیچیدہ ہے۔" گفتگو کا انداز دل کو لبھانے والا تھا۔ وہ اپنے اطوار سے مہذب اور پڑھی لکھی لگ رہی تھی۔ مردوں کی توجہ حاصل کرنے کا سلیقہ اسے خوب آتا تھا۔

"مختصر طور پر بتا دیں۔" ارل نے کہا۔ "مگر پہلے اپنے اوسان کو قابو میں رکھیں اور مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ لیں۔"

لڑکی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور بولی۔ "آپ مجھے مہربان اور پُرخلوص آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال وہ سرے پر جو طویل قامت شخص کھڑا ہے میرے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ چہرے سے پرلے درجے کا بدمعاش لگتا ہے۔"

ارل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں، میں نے چند منٹ قبل اسے بھرپور انداز سے دیکھا تھا۔ کیا آپ اس سے خطرہ محسوس کر رہی ہیں؟"

"بالکل! اس کی موجودگی میں مَیں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہوں۔"

"کیا آپ اس سے واقف ہیں؟"

"بالکل نہیں۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی ہے اور میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ اسی سڑک کے کونے سے وہ میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو لاتعلق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ میرا تعاقب کرتا ہوا بار میں داخل ہو گیا۔ اس وقت سے وہ مسلسل مجھے دیکھے جا رہا ہے۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوتی ہوں تو نظریں بچا جاتا ہے۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"بہرطور میں نے اس معاملے کا سنجیدگی سے اثر نہیں لیا۔ غالباً آپ کو اپنی سحر انگیز شخصیت کا احساس نہیں ہے۔ کوئی بھی مرد آپ کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش کر سکتا ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ "تعریف کا شکریہ، مگر میں اس قسم کے لوگوں سے خوب واقف ہوں۔ روزانہ لیے بیسیوں لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جو مجھے دیکھتے ہی مر مٹتے ہیں۔ یہ شخص ان تمام مردوں سے مختلف ہے اس نے ایک خوبصورت عورت سمجھ کر مجھ پر توجہ نہیں دی۔ وہ ایک پیشہ ور شکاری ہے جسے مجھ پر قابو پانے اور مجھے شکار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اسے میرا خاتمہ کرنے کے لیے بھاری معاوضہ دیا گیا ہے۔"

"آپ یقیناً مذاق کر رہی ہیں۔" ارل نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ "آپ کو بھلا کوئی کیوں قتل کروانے لگا؟"

"میرا شوہر میری جان کے درپے ہے۔"

"آپ کا شوہر؟"

"ہاں۔ خدا کے لیے یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ میں کسی دماغی امراض کے ہسپتال سے فرار ہو کر یہاں پہنچی ہوں۔ مجھے اس نوعیت کا تجربہ ہو چکا ہے اور اس وقت میں بقائمی ہوش و حواس طویل قامت شخص پر شبہ کر رہی ہوں۔ میں اپنے شوہر کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہوں اس کے گھر سے فرار ہو کر آئی ہوں۔ میرے شوہر کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دینا چاہیے۔"

"آپ اس کے گھر سے بھاگ چکی ہیں اور اب اس نے آپ کے پیچھے آدمی لگا دیتے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

لڑکی نے مشروب کا بڑا سا گھونٹ لیا۔ پرس سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور قیمتی طلائی لائٹر سے سلگا لیا۔

"آج دوپہر کی بات ہے۔" وہ ایک طویل کش لے کر بولی۔ "میں اپنے شوہر اور چند دوستوں کے ساتھ نیو یارک کے ایک ریستوران میں کھانے کے لیے گئی تھی۔ کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے اور میک اپ درست کرنے کے بہانے اٹھی۔ اور بغلی دروازے سے باہر آ گئی پھر میں نے ٹیکسی لی اور گرانڈ سینٹرل ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ جہاں ایک لاکر میں میرا سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ شکاگو جانے کے لیے تیز رفتار ٹرین تیار کھڑی تھی۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور ٹرین پر سوار ہو گئی لیکن اگلے اسٹیشن پر اتر گئی۔ باہر آ کر میں نے پھر ٹیکسی لی۔ اور ایک ہوٹل میں پہنچ گئی۔ صدر دروازے سے ہوٹل میں داخل ہو کر میں عقبی دروازے سے باہر آ گئی۔ میں نے پھر ٹیکسی لی اور اسے ایئرپورٹ چلنے کی ہدایت کی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا ہے اور وہ لوگ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ افسوس کہ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا اب بھی میرے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ اس سے قبل بھی میں کئی مرتبہ گھر سے بھاگ چکی ہوں۔ مگر میرے شوہر کے جاسوسوں نے ہر بار مجھے تلاش کر لیا۔ چوٹی کے بدمعاشوں سے اس کے وسیع روابط ہیں۔ اب تو اس نے باقاعدہ دو آدمی میرے پیچھے لگا دیئے ہیں۔ دونوں باری باری ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور مجھے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ اس نے کبھی ان بدمعاشوں کو دوبارہ استعمال نہیں کیا کیونکہ میں انہیں پہچان لیتی تھی۔ میں نے فرار کے لیے ہر بار نیا طریقہ اختیار کیا مگر اس کے گرگوں نے کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔"

"آپ کو تلاش کر کے انہوں نے کیا قدم اٹھایا تھا؟"

"وہ میرے کسی جگہ ٹھہرنے کا انتظار کرتے تھے۔ پھر مطمئن ہو کر میرے شوہر فلائڈ کو فون پر مطلع کر دیتے اور وہ وہاں پہنچ کر مجھے زبردستی گھر لے جاتا تھا۔ میں نے ہر مرتبہ مزاحمت کی مگر فلائڈ نے میری ایک نہیں چلنے دی۔"

"کیا آپ نے کبھی پولیس کو صورتحال سے آگاہ کرنے کے بارے میں سوچا تھا؟"

"بے شک۔ میں پولیس کو فلائڈ کے ستم کی داستان سنا چکی ہوں۔ لیکن انہوں نے کبھی فلائڈ یا اس کے گرگوں کو رنگے ہاتھوں نہیں پکڑا۔ پھر پولیس نے میری کہانی پر یقین نہیں کیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ معاندانہ رویہ روا رکھا تھا۔ کبھی تو انہوں نے مجھے پاگل سمجھا اور کبھی

میرے شوہر نے انہیں خرید لیا۔ وہ چاہے تو کسی بھی شہر کی ساری پولیس فورس کو خرید سکتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے اکاؤنٹ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ ممکن ہے یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ فلائڈ دنیا کے چند امیر ترین لوگوں میں ایک ہے۔ پیسوں کے بل پر وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"مائرا۔"

"مائرا......؟"

وہ متذبذب ہو کر بولی۔ "کیا آپ مجھے اپنا پیشہ بتلانا پسند کریں گے؟"

ارل مسکرا کر بولا۔ "میں دولت مند نہیں ہوں مگر نوٹوں کی خوشبو سے بخوبی واقف ہوں۔ میں ایک بینک میں لون آفیسر کے عہدے پر فائز ہوں میرا نام ارل شیلے ہے۔"

"میں اپنے بارے میں آپ کو بتلانے میں ہرج نہیں سمجھتی۔ میں آپ کو بے ضرر مانتی ہوں۔ میرے شوہر فلائڈ انڈر ووڈ، معروف جہازراں کمپنی انڈر ووڈ شپنگ انٹرپرائز کے مالک ہیں۔ ان کا سرمایہ بیسیوں صنعتی منصوبوں میں لگا ہوا ہے۔"

"میرے خدا! آپ تو واقعی بہت بڑے آدمی کی بیوی ہیں۔ میں آپ کے شوہر کی کمپنی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ واقعی ان کی دولت کا کوئی حساب نہیں ہے۔ قدرت نے انہیں بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں خود بھی اپنی بے حساب دولت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ آپ کو دنیا کی ہر آسائش مہیا کر سکتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ انہیں پسند نہیں کرتیں۔"

"مجھے اس خبیث سے نفرت ہے! وہ انتہائی مکروہ اور ظالم بوڑھا ہے۔ اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ کسی طور پر بھی چاہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ میں اس کی زیادتیوں پر خاصی ضخیم کتاب لکھ سکتی ہوں۔"

"لیکن وہ یقیناً خطرناک نہیں ہے۔ جہاں تک آپ کے قتل کا تعلق ہے تو......"

"اوہ نہیں! وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے قتل کرنے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن اس نے مجھے سخت لہجے میں کہا تھا کہ آئندہ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ میرا آخری فرار ہو گا۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ میرا اس سے ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ پھر مجھ میں اس کے لیے ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں رہے گی۔ اس کے پاس مجھے قتل کروانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہو گا تاکہ کوئی دوسرا مرد مجھے چھو نہ سکے۔"

"آپ کو اس امر کا یقین ہے؟"

"بالکل۔ میں فلائڈ کی کینہ پرور فطرت سے خوب واقف ہوں۔ وہ ہر اس چیز کو تباہ کروا دیتا ہے جس پر اس کا اختیار نہیں رہتا۔ کوئی فرد اس کے قبضے سے نکل کر موت کے منہ میں ہی جا سکتا ہے۔"

ارل نے مشروب کا بڑا سا گھونٹ لیا اور پے در پے سگریٹ کے تین چار کش لے ڈالے۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"

"اگر آپ اس طویل قامت شخص کو پانچ منٹ تک باتوں میں الجھائے رکھیں تو مجھے بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ بعد کو کسی جگہ میں آپ سے مل لوں گی اور اس خدمت کا صلہ دے دوں گی۔ میں خالی ہاتھ بوڑھے خبیث کے گھر سے فرار نہیں ہوئی۔ بہت کچھ اپنے ساتھ لائی ہوں۔"

ارل نے بار میں موجود "دشمن" پر نظر ڈالی اس کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ ارل کو اس سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کئی بدمعاشوں سے برد آزما ہو چکا تھا۔ کئی مرحلوں پر کامیابی سے لاتوں اور گھونسوں کی مدد سے اپنا دفاع کر چکا تھا لیکن طویل قامت دشمن سے نپٹنا آسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے پیشہ ور بدمعاش لگ رہا تھا۔ اس سے بھڑنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود اس دلربا عورت نے ارل کا خون گرما دیا تھا۔ اس کی قربت کی خاطر وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا سکتا تھا۔ تقدیر نے اسے سنہرا موقع فراہم کیا تھا اور وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ان حضرت سے نپٹ لوں گا۔" ارل نے کہا۔ "اور یہ سب پیسوں کے لیے نہیں ہو گا۔ چند ذاتی وجوہ کی بنا پر میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ایک وجہ تو آپ بآسانی سمجھ سکتی ہیں۔"

پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں پر بھرپور دلآویز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ارل کو اس کی چمکدار آنکھوں میں اپنے لیے محبت اور اپنائیت نظر آئی تھی۔

"ہمیں اس ضمن میں منصوبہ بندی کرنا پڑے گی" ارل نے بے تکلفی سے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ چکا ہے۔ میں اس ذاتِ شریف کو... الجھا لوں گا۔ تم اس دوران کھسک لینا۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے نکل کر دائیں طرف دوڑنا شروع کر دینا۔ آگے تمہیں سفید بیوک کھڑی ملے گی۔ میں نے بیوک کو اس انداز سے کھڑا کیا ہے کہ وہ تمہاری نظروں میں آئے بغیر نہیں رہے گی۔ ونڈ شیلڈ پر تمہیں چالان کی رسید چسپاں ملے گی۔ دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ جانا اور کھڑکیوں کے شیشے اوپر چڑھا کر دروازے مقفل کر دینا۔ پھر دونوں سیٹوں کی درمیانی جگہ پر لیٹ جانا تاکہ باہر سے تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ طویل قامت شخص سے پیچھا چھڑا کر میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر بار میں اس کا دوست موجود ہوا تو برا ہو گا۔ وہ ہمارا تعاقب کر سکتا ہے لیکن فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں گاڑی چلانے میں بہت ماہر ہوں۔ اسٹیئرنگ

وسیل ہاتھ میں آتے ہی میں اسے چکمہ دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کیا آپ واقعی میری مدد کرنا چاہتے ہیں؟ سوچ لیجئے۔ آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ آپ زخمی بھی ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے آپ ......"

"قتل بھی کر دیا جاؤں؟"

مائرا اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی، ایسا ہونا عین ممکن ہے۔"

"ایسے بھی دن گزرے ہیں کہ میں موت کو گلے لگا سکتا تھا۔" ارل مسکرا کر بولا۔ اس نے مشروب کے پیسے پلیٹ میں رکھے اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے بات کرنے تک اپنی جگہ سے مت ہلنا۔

وہ بار کے سرے پر طویل قامت شخص کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ خالی خالی نظروں سے ارل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ارل نے رفتار تیز کر دی اور اس سے ٹکرا گیا۔ توقع کے مطابق طویل قامت شخص کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ اس کی توجہ مائرا کی طرف سے ہٹ چکی تھی۔

"میری جان ـــ" ارل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "خاتون نے مجھے تمہیں ایک پیغام دینے کے لیے کہا ہے۔ وہ چاہتی ہیں تم ان کا پیچھا چھوڑ دو ـــ"

مائرا کے شوہر کے اس پالتو کتے کا قد ارل سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کے شانے چوڑے اور مضبوط تھے۔ اس کے طاقتور جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لڑنے بھڑنے کا عادی ہے۔

"ہوش میں تو ہو؟ کس خاتون کی بات کر رہے ہو؟" اس نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"میں خوب سمجھتا ہوں، بچو زیادہ ادائیں مت دکھاؤ اور شرافت سے مائرا کا پیچھا چھوڑ دو ـــ" ارل نے کن انکھیوں سے مائرا کو بار سے نکلتے دیکھا اور اسے سکون محسوس ہوا۔

"بکواس مت کرو!" دراز قد نوجوان نے دائیں ہاتھ سے ارل کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اس بار میں کوئی ایسی عورت نہیں ہے جس سے میرا دور کا بھی تعلق ہو۔ اب شرافت سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ ورنہ تمہاری پسلی ایک کر دوں گا۔"

ارل نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔ "میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم جیسے لوگوں سے اچھی طرح نمٹنا جانتا ہوں۔"

دراز قد نوجوان نے مشروب کا گلاس میز پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ اس نے سرد اور سرسراتی آواز میں کہا۔ "اگر تم نے مزید بکواس کی تو تمہارا بہت برا حشر ہو گا۔"

اس نے کچھ اس انداز سے یہ بات کہی تھی کہ ارل کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی ـــ اس نے بمشکل اپنے خوف پر قابو پایا اور مارچ کرتا ہوا بار سے باہر آ گیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ دراز قد نوجوان واقعی اسے قتل کر دینا چاہتا تھا۔ صرف وقت اور جگہ مناسب نہ ہونے کی وجہ سے باز رہا تھا۔ ارل تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی کار تک پہنچا تو وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ چالان کی رسید ونڈ شیلڈ سے ہٹا کر اس نے دروازہ کھولا۔ مگر وہ مائرا کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ وہیں ہو گی۔ اگلی نشست کے آگے فلور بورڈ پر ایک سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ یقیناً مائرا بار سے نکلتے ہوئے بیگیج روم سے اپنا سوٹ کیس اٹھا لائی تھی۔

ارل نے کار اسٹارٹ کی اور احتیاط سے چلاتا ہوا مین روڈ پر آ گیا جہاں ٹریفک کا اژدہام اس کا منتظر تھا۔ کاریں ٹرک اور دوسری گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔ ارل نے بائیں طرف چھوٹی سڑک پر کار موڑی اور ایک فرلانگ کے فاصلے پر سان ڈیگو کی شاہراہ پر پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے نصف درجن کاریں چلی آ رہی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہو گا۔

"خدا کا شکر ہے، ہم بار سے صحیح سلامت نکل آئے۔" ارل نے پیچھے رخ کیے بغیر مائرا سے کہا۔ "تم تو ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔ کیا میں اب سیٹ پر بیٹھ سکتی ہوں؟" مائرا عقب سے متمنائی۔

"فی الحال وہیں دبکی رہو۔ چند منٹ بعد ہم اگلی شاہراہ پر پہنچ جائیں گے پھر میں ایک چھوٹا سا تجربہ کروں گا۔"

ارل نے دائیں جانب کشادہ گلی میں تیزی سے کار موڑی اور شہر کے مشرقی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ بار بار اس کی نگاہیں عقبی آئینے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دو فرلانگ تک پیچھے تاریکی رہی پھر اس نے ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں۔ غالباً کوئی کار گلی میں داخل ہوئی تھی۔ ارل نے کار کی رفتار میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ پچھلی گاڑی کے ڈرائیور نے فاصلہ کم نہیں کیا تو ارل نے سوچا کہ یہ محض مذاق بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے بائیں طرف کار موڑ لی۔ ایک فرلانگ آگے وہ پھر بائیں جانب گلی میں گھس گیا۔ سایرا اسٹریٹ سے نکل کر وہ کینین ایونیو پر پہنچ گیا۔ یہاں حد رفتار بیس میل تھی مگر اس کے میٹر کی سوئی چالیس پر لرز رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسے پولیس کی گشتی کار کی بھی پروا نہیں تھی۔ دو تین منٹ بعد رفتار بتلانے والی سوئی ساٹھ سے اوپر پہنچ چکی تھی اور اب ستر کے ہندسے کو چھونے لگی تھی۔

"تم سیٹ پر بیٹھ سکتی ہو مائرا۔" ارل نے کہا۔ "اس مرحلے پر اگر وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں تو انہیں کار میں تمہاری موجودگی کا علم ہے کیونکہ منطقی اعتبار سے مجھ اکیلے کا پیچھا کرنے کی کوئی تک نہیں ہے۔

اسے مجھ پر اتنا شدید غصہ تھا کہ مجھے قتل کی دھمکی دے دی تھی لیکن وہ اتنا پاگل نہیں تھا کہ تمہیں چھوڑ کر میرے پیچھے چل دیتا۔ اب تم اطمینان سے بیٹھ کر پیچھے آنے والی گاڑیوں پر نظر رکھو۔"

ارل نے سوٹ کیس اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور مائرا بندر کی طرح جست لگا کر اگلی نشست پر آ بیٹھی۔ مائرا کی قربت نے اس میں انوکھا جوش بھر دیا تھا۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی سینٹ کی بھینی بھینی مہک اسے مسحور کیے دے رہی تھی۔ پچھلے دس سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنی دل پسند عورت کی قربت حاصل ہوئی تھی۔ اپنی بیوی کی موجودگی میں ایسا جوش اور جذبا اس میں کبھی نہیں ابھرا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مائرا ایسی حسین عورت کا قرب اسے نصیب ہو گا۔ ارل نے مائرا کو بار میں موجود دراز قد نوجوان سے زبانی مقابلے کے بارے میں بتایا تو وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "دیکھا تم نے! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ نوجوان بے حد خطرناک اور میری جان کے درپے ہے۔ اب ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔"

وہ پیچھے آنے والی گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارل نے کہا۔ "گاڑیاں چلانے والوں میں دوست دشمن کی تمیز نہیں کی جا سکتی۔ بڑی شاہراہ پر عموماً لوگ اندھا دھند کاریں چلاتے ہیں۔"

مائرا کھڑکی سے میلوں پھیلی ہوئی لاکھوں روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ شہر سے دور مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ یہ علاقہ بھی ایک شہر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

"یہ روشنیاں کتنی دلفریب ہیں ـــ" مائرا خوابناک لہجے میں بولی۔ "ہر روشنی چھپنے کی ایک بہترین جگہ کی نشاندہی کر رہی ہے۔ روشنیوں کے اس گورکھ دھندے میں باسانی گم ہوا جا سکتا ہے۔ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟"

"مالیبو ہوٹل ـــ" ارل نے کہا۔ "یہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جس کے سامنے سمندر پھیلا ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ ہوٹل بڑی شاہراہ سے ہٹ کر واقع ہے میرا خیال ہے، یہ ہوٹل عارضی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہارے ذہن میں اس سے بہتر کوئی جگہ ہے؟"

"میرا ارادہ پلازہ ہوٹل میں پناہ لینے کا تھا جو بیورلی ہلز کے علاقے میں واقع ہے لیکن اب چونکہ مجھے اپنے پیچھے لگے ہوئے آدمی کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ تمہاری تجویز کردہ جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

"ان اطراف میں تمہارا کوئی واقف ہے؟" ارل نے پوچھا۔

"ہاں۔ چند لوگوں کو جانتی ہوں لیکن فلائڈ بھی ان کے بارے میں جانتا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ "تم شادی شدہ ہو ارل؟"

"ایک اعتبار سے مجھے شادی شدہ کہا جا سکتا ہے۔"

مائرا نے دو سگریٹ سلگائے اور ایک سگریٹ ارل کی طرف بڑھا کر بولی۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم دونوں نام کے میاں بیوی ہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہیں لیکن جو ہم آہنگی شوہر اور بیوی میں ہوتی ہے۔ ہم میں مفقود ہے۔" ارل کار کو ایک دوسرے مین روڈ پر موڑ چکا تھا۔ جہاں ٹریفک کا زور نسبتاً کم تھا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے پوری طرح بیزار ہو چکا ہوں۔ میرے رہا ہوتے ہی تمہیں رقم ملنے والی ہے۔ میں مناسب گھڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس جہنم کدے سے میری رہائی میں چند ہی مہینے رہ گئے ہیں۔"

"کیا تمہاری بیوی کو اس بات کا علم ہے؟"

"میرا خیال ہے میری گمشدگی پر اسے شدید دھچکا پہنچے گا! اسے میرے ہاتھ سے جانے کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ اس کا ہر حکم ماننے والا شوہر اسے کہاں ملے گا۔ مجھے اس سے دو روز کے لیے نجات مل چکی ہے۔ وہ اپنی بیمار ماں کو دیکھنے ڈینور گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایئرپورٹ پر موجود تھا۔"

اسی لمحے ارل کی توجہ عقبی آئینے میں نظر آنے والی روشنیوں پر مبذول ہو گئی۔ لمحہ بہ لمحہ یہ روشنیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک تیز کار ان سے دو سو گز کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ جس سڑک پر کار دوڑ رہی تھی، وہ خاصی چوڑی تھی اور لوہے کے جنگلے سے دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ ارل نے دوسری سڑک پر نظر ڈالی۔ مخالف سمت سے تیز رفتار کاریں ہر دسویں سیکنڈ پر اسے کراس کر رہی تھیں۔ ارل عقب سے آنے والی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے اپنی کار جنگلے کے قریب دوڑانے لگا مگر اس گاڑی نے اوور ٹیک کرنے کی بجائے پوری رفتار سے ارل کی کار کے بائیں حصے پر زور دار ٹکر ماری

بریک چرچرائے اور ارل کا جسم جھنجھنا کر رہ گیا۔ اگر اسٹیئرنگ وہیل پر اس کی گرفت مضبوط نہ ہوتی تو اس کی کار جنگلہ توڑ کر برابر سڑک پر سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی لپیٹ میں آچکی ہوتی۔ ارل کی کار کو ٹکر مارنے والی گاڑی تیزی سے آگے جا چکی تھی۔ ان کی کار نے جھٹکے سے گھوم کر سڑک کو گھیر لیا تھا اور ارل کے سنبھلنے سے پہلے ایک اسٹیشن ویگن اس کی کار کے درمیانی حصے سے ٹکرا گئی۔ دوسرے حادثے نے ارل کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسٹیشن ویگن کے پیچھے گاڑیاں نہیں تھیں ورنہ کئی حادثے ہو جاتے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ ان کی کار ٹکر سے الٹی نہیں تھی ورنہ وہ دونوں شدید زخمی ہو جاتے۔

ارل کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ گرم گرم خون اس کی کنپٹیوں سے بہتا ہوا قمیص کو بھگو رہا تھا مگر اسے چوٹ کا احساس نہیں تھا۔ مائرا کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی مگر اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اسٹیشن ویگن کا ڈرائیور ارل کی کار کا معائنہ کر کے افسوس کے انداز میں سر ہلاتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا۔ دوسری گاڑیاں آہستگی سے ان کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ کسی نے کار روک کر انہیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" ارل نے مائرا کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

مائرا چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارل کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں مگر مجھے تمہاری تشویش ہے۔ تم غالباً بہت زخمی ہوئے ہو۔"

مائرا نے پرس سے رومال نکالا اور اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی۔ پھر وہ اس کے بالکل قریب آگئی اور بالوں کو ہٹا کر اس کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔

"زخم گہرا نہیں ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "صرف ایک جگہ سے جلد پھٹ گئی ہے۔ اوہ میرے خدایا! یہ معجزہ ہے کہ ہم دونوں زندہ سلامت کار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"اس خبیث نے تو ہمیں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" ارل نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ "لیکن مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔"

"اب بھی وقت ہے۔ تم چاہو تو مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میرے ساتھ مارے جاؤ۔" مائرا نے اس کے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

ارل کو اس کی بات بڑی وزن دار محسوس ہوئی تھی مگر وہ سر جھکا کر بولا۔ "نہیں۔ میں اس نازک موقع پر بھاگنا نہیں چاہتا۔ میں نے آخری سانس تک تمہارا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آؤ دیکھیں کار کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔"

انہوں نے گھوم کر تباہ شدہ کار کا معائنہ کیا۔ ارل کی اکلوتی کار کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ وہ حادثے کے ذمے دار ڈرائیور کو صلواتیں سنانے لگا۔ یہ اس کی زندگی کی واحد آسائش تھی جس کا بیڑا غرق ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ حسرت بھری نظروں سے تباہ شدہ کار کو دیکھ رہا تھا۔

مائرا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور ہمدردی سے ارل کو دیکھنے لگی۔ وہ دونوں پھر کار میں بیٹھ گئے۔ ارل نے کار اسٹارٹ کی اور بولا۔ "چلو یہی کیا کم ہے کہ انجن محفوظ ہے۔"

مائرا نے پرس کھولا اور سو ڈالر کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال لی۔ اس نے گڈی سے دس نوٹ علیحدہ کیے اور ارل کی جیب میں ٹھونسنے لگی۔ ارل نے یہ کہہ کر نوٹ واپس کرنے چاہے کہ انشورنس کمپنی اس کا بیشتر نقصان پورا کر دے گی۔

"تم نے میری زندگی کا تحفظ کیا ہے۔" مائرا نے نوٹ دوبارہ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا احسان کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں سے نہیں اتار سکتی۔ اگر تم نے رقم واپس کی تو مجھے دکھ ہوگا۔"

دس منٹ بعد وہ مالیبو ہوٹل کی پرشکوہ عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل پہاڑی کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ہر کمرے سے نیلگوں ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ دائیں جانب نیچے ساحل پر پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا تاکہ مسافر غسل وغیرہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔ بڑی شاہراہ سے ہوٹل کی عمارت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس طرح وہی لوگ ہوٹل تک پہنچ سکتے تھے جنہیں اس کا علم تھا۔ کار پارکنگ کا بڑا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں عموماً وہ جوڑے آتے تھے جو اپنے تعلقات چھپانا چاہتے تھے۔ جنہیں اپنی نیک نامی عزیز ہوتی تھی۔ یہاں عیاشی کرنے والوں کے نام اخبارات میں شہ سرخیوں میں آسکتے تھے۔ ارل کو یہاں قیام کا تجربہ نہیں تھا۔ اتنے مہنگے ہوٹل کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہوٹل کی ساکھ کے بارے میں اس نے کئی لوگوں سے سن رکھا تھا۔

"بڑی خاموش اور پرسکون جگہ ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایسا ہوٹل دیکھا ہے۔" مائرا نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"میرا خیال ہے تمہیں ہوٹل پسند آئے گا۔" ارل نے کہا۔ "اور مجھے امید ہے کہ تم یہاں محفوظ رہو گی۔"

ارل ساکت و صامت کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مائرا کے آگے بڑھنے کا منتظر تھا اور بالآخر اس نے ارل کی خواہش پوری کر دی۔

"کیا تم مجھے رخصت کر دو گے؟" مائرا نے کہا۔ "مجھے اس گرداب میں چھوڑ کر چلے تو نہیں جاؤ گے؟ تمہاری عدم موجودگی میں میں انتہائی غیر محفوظ ہو جاؤں گی۔"

ارل مسکرا کر بولا۔ "اگر تم مجھے محافظ کے طور پر رکھنا چاہتی ہو تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی سنیچر اور اتوار کے لیے میں نے کوئی پروگرام نہیں بنا رکھا۔ میں تو اکیلا شام تک سفری ہوں۔"

مائرا پرجوش انداز میں ارل سے لپٹ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت اس کے ہاتھوں میں آگئی ہو۔

مائرا تھوڑی دیر ارل کے چوڑے سینے پر سر رکھے رہی پھر آہستگی سے بولی۔ "کیوں نہ ہم فرضی ناموں سے ہوٹل میں دو کمرے حاصل کر لیں؟ یہاں ایسے بھی کمرے ہیں جنہیں ایک دروازے کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ کیا خیال ہے ایسے کمرے مناسب رہیں گے؟"

"بالکل۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"اس قسم کے کمروں کی تجویز میں نے اسی لیے پیش کی تھی کہ خطرے کی صورت میں بغیر وقت ضائع کیے تم تک پہنچ سکوں۔ اگر میرا کمرہ دور ہوا تو قاتل اپنی مکروہ کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" مائرا نے مسکرا کر کہا۔ "پھر اس دروازے کو مقفل بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک رومانی ناول میں ایلس کین نامی کردار کو بہت پسند کیا تھا۔ میں یہی نام اختیار کروں گی؟"

"بڑا خوبصورت نام ہے۔ میرا نام چک ویگنر کیسا رہے گا؟"

"بہت خوب۔ گویا تم نے بھی ایک ناول کا کردار منتخب کیا ہے۔"

"آؤ چلیں۔" ارل نے اس کا سوٹ کیس اٹھا کر کہا۔

انہیں دوسری منزل پر اپنی پسند کے کمرے مل گئے۔ ارل کمرے کی دیدہ زیب سجاوٹ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ دائیں جانب کنگ سائز بیڈ پڑا ہوا تھا جس پر بڑی آسانی سے دو افراد سو سکتے تھے۔ فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ان پر خوش رنگ قیمتی ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔

ارل جہازی سائز کے بستر پر نیم دراز سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ ارل کی نظریں کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس نے ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پلٹ کر مائرا کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ دستک دے کر ارل کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے کھلتے ہوئے رنگ کا دیدہ زیب گاؤن زیب تن کر رکھا تھا۔ بال دونوں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ارل پلکیں جھپکائے بغیر مائرا کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کی توجہ مائرا کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ تین آٹھ کے چھوٹے ریوالور کی طرف مبذول ہو گئی۔ مائرا اس کے برابر بستر پر بیٹھ چکی تھی۔

"میں تمہارے لیے ایک دوست لائی ہوں"۔ ماترا ریوالور اس کی طرف بڑھا کر بولی "میں نے قسم کھائی تھی کہ فلانڈ کے کسی بھی گرگے پر استعمال سے دریغ نہیں کروں گی لیکن میں نہیں سمجھتی کہ وقت پڑنے پر اس کا ٹریگر دبا سکوں گی۔"

ارل ریوالور کا معائنہ کرنے لگا۔ اعشاریہ تین آٹھ کا چھوٹا اور ہلکا ریوالور بھرا ہوا تھا۔ ماترا نے پوچھا "کیا تم اس کے استعمال سے واقف ہو؟"

"بے شک۔ نشانہ لے کر ٹریگر ہی تو دبانا پڑتا ہے۔ تم ایسی لڑکی کے لیے یہ خطرناک کھلونا ہے۔"

"اگر میں کسی بڑے خطرے میں گھر جاؤں تو شاید ریوالور چلاتے ہوئے نہیں ہچکچاؤں گی۔"

ارل نے پستول تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

"میں بے حد خوفزدہ ہوں"۔ ماترا نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ میری جان لینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ مجھے مارنے کے بعد وہ کچھ اس قسم کا انتظام کریں گے کہ میری موت حادثاتی معلوم ہو۔"

"ان سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"بار میں موجود دراز قد نوجوان کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں تمہاری کار میں سوار ہو چکی ہوں تاوقتیکہ باہر کھڑے ہوتے اس کے ساتھی نے اسے بتا نہ دیا ہو۔ مجھے بار سے ملحق کمرے سے سوٹ کیس اٹھانے میں بمشکل آدھا منٹ لگا تھا کہ میں پہلے ہی دربان کی مٹھی گرم کر کے اس امر کا اہتمام کر چکی تھی۔ وہ دروازے پر سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لیا اور قلانچیں بھرتی ہوئی تمہاری کار تک پہنچ گئی تھی۔"

ارل نے کہا "جس گاڑی نے ہماری کار کو جان بوجھ کر ٹکر ماری تھی، میں اس میں ایک ہی شخص کو دیکھ سکا تھا۔ میں اسے پہچان نہیں سکا تھا لیکن میرا خیال ہے تمہاری بات صحیح ہے۔ وہ دو اشخاص تھے جو ایک دوسرے کی معاونت کر رہے تھے۔ کیا وہ لوگ جہاز پر موجود تھے؟ کیا وہ نیویارک سے تمہارا تعاقب کر رہے تھے؟"

"ممکن ہے نیویارک میں میرا پیچھا کرنے والے اور لوگ ہوں۔ اور انہوں نے یہاں فون کر کے ان پیشہ ور قاتلوں کو میری موجودگی سے مطلع کر دیا ہو۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشہ ور قاتل کہا جاتا ہے نا ارل؟"

"ہاں۔ اگر اس قسم کے لوگوں سے رابطہ ہو تو بیس پچیس ہزار ڈالر میں کسی بھی فرد کو مروایا جا سکتا ہے۔"

"توبہ توبہ یہ لوگ کتنے سنگدل اور بے رحم ہوتے ہیں!" ماترا نے رخساروں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ان کے ظلم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری جان کی خاطر وہ تمہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے ہیں۔" وہ ارل کے قریب ہو گئی اور اپنی خوبصورت بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ "میں بہت خودغرض ہوں ارل۔ مجھے تمہیں اس خطرناک کھیل میں ملوث نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر گھر نہیں جا سکتے؟ اپنی جان نہیں چھڑا سکتے؟"

ارل نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ میرا خیال ہے ہم خطرات سے دور رہ چکے ہیں۔ انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالات خواہ کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں۔ میں نے تمہارا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔۔۔ آج تک میرا واسطہ تم جیسی خوبصورت اور پُرخلوص لڑکی سے نہیں پڑا۔ تم سے جدائی کے بعد میری زندگی صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی سی ہو جائے گی جس کے پاس پانی کی ایک بوند بھی نہ رہی ہو۔"

"اوہ ارل! تم کتنے اچھے ہو!" ماترا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ایسے مہربان دوست سے ملاقات ہو جائے گی۔ تم فرشتہ بن کر میری مدد کو پہنچے ہو۔ میں تمہیں اپنے لیے قدرت کا ایک انعام سمجھتی ہوں۔ آج تک کسی نے میرے ساتھ اتنا خلوص نہیں برتا۔"

ماترا نے ارل کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور وہ اس کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ ماترا کو تسخیر کر چکا تھا اور اس خوشی میں اس کا دل دیوانہ وار رقص کرنے کو چاہ رہا تھا۔

❁

سنیچر کی دوپہر پہاڑی کے نیچے میلوں پھیلے ہوئے ساحل پر وہ دونوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ وہ غسل کے لباس میں ملبوس تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ملبوسات اور دو بڑے تولیے انہوں نے مالیبو ہوٹل سے خریدے تھے۔ ماترا ارل کو تھوڑی دیر کے لیے بھی تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے ارل کے لیے شب خوابی کا لباس، شیو کا سامان اور مردانہ استعمال کی چند چیزیں خرید لی تھیں۔ ماترا کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والے ٹریولرز چیک کی بہت سی گڈیاں تھیں جنہیں وہ بے دریغ بھنا رہی تھی۔ اس کے پرس میں چار پانچ ہزار ڈالر کے کرارے ہرے نوٹ بھرے تھے۔

"تم لاس اینجلس سے یہاں کیوں آئی تھیں؟" ارل نے پوچھا۔

"میں سیاحوں کی جنت ہوائی نامی جزیرے پر جا رہی تھی۔" ماترا نے رخساروں پر سورج کی تمازت سے محفوظ رکھنے والا قیمتی محلول ملتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہاں محض چند دن رکنے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے پہلے یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے۔"

"ہوائی جزیرے پر جانے کی کیا تک ہے؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر ہوائی میں میرا دل نہیں لگا تو میں ایک قریبی بڑے سے جزیرے کونا پر چلی جاؤں گی۔ وہاں انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیتے جی جنت میں آ گیا ہو۔۔۔ پُرکیف ہوائیں، برسات کی رم جھم، جھومتے ہوئے ناریل کے بلند و بالا درخت اور شفاف چشمے آنکھوں کو تراوٹ بخشتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر شہر کی ہنگامہ پرور اور سنگینی زندگی کی طرف لوٹنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ میں عرصے سے ایسی جگہ کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ وہاں کی خاموشی اور صحت افزا فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔ ایک آدھ مہینہ رہ کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں ہوائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" ارل نے کہا۔ "میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ البتہ میں نے کئی مرتبہ خوابوں اور تصورات میں ان خوابناک جزائر کی سیر کی ہے۔ میری بھی دیرینہ خواہش ہے کہ پندرہ بیس روز ان رومان پرور جزائر پر گزاروں۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے! اگر تمہارا ساتھ ہو جائے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے! آؤ میرے ساتھ چلو وہاں ہم اپنے تمام دکھ درد بھلا دیں گے۔"

"غالباً تم میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ارل۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔" ماترا نے پُرجوش انداز میں اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "میں واقعی تمہیں ساتھ لے جانا چاہتی ہوں ارل۔ ایمانداری سے کہہ رہی ہوں۔"

"ممکن ہے یہ تمہارا وقتی جذبہ ہو۔" ارل نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تم پر خوف طاری ہے۔ خطرہ تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ تم اپنی موت کو ٹالنا چاہ رہی ہو۔ ان نازک حالات میں تحفظ حاصل کرنا فطری امر ہے۔ بہرحال میں وہاں کے بھاری اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تمہیں چند ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں وہاں تم سے آ ملوں گا۔"

"تم میرے مہمان کی حیثیت سے چلو گے۔" ماترا نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پیسوں کے بارے میں میرا انداز فکر عام لوگوں سے قطعی مختلف ہے۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ساری عمر عیش و آرام سے گزار سکتی ہوں۔ میں اس ختم نہ ہونے والی دولت میں تمہیں بھی شریک کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں وہاں لے جا کر میں تم پر عنایت نہیں کروں گی بلکہ یہ مجھ پر تمہارا کرم ہوگا۔"

"تم مجھے بے قابو کیے دے رہی ہو۔" ارل نے کہا۔ وہ تصور میں خود کو ماترا کے ساتھ ہوائی کے ٹھنڈے ساحل پر گھومتے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی تصورات کی دنیا سے لوٹ آیا اور سنبھل کر بولا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے ماترا۔ فی الحال میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ چند ماہ بعد خاصی بڑی رقم میرے ہاتھ آ جائے گی تو میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وقت آنے پر دنیا کی کوئی طاقت مجھے تمہارے پاس جانے سے نہیں روک سکے گی۔ میں تمہارے بنا اتنے دن کس طرح گزاروں گا، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اس وقت میرا جانا کسی لحاظ سے بھی سودمند نہیں ہوگا۔ تمہاری دولت پر تفریحات کرنے سے میری حیثیت تمہاری نظر میں کم نہیں ہوگی لیکن اس طرح میں آپ ہی اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔ احساس کمتری مجھے چین نہیں لینے دے گا۔ اور پھر کیرن کا مسئلہ بھی ہے۔ میں یکایک غائب نہیں ہو سکتا۔ مجھے کیرن کو طلاق کے لیے آمادہ کر کے اس کے مطالبات کو پورا کرنا ہوگا۔ دیر آید درست آید۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"میرے ساتھ آج تک ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کسی نے اپنا وعدہ ایفا کیا ہو۔" ماترا نے دنیا جہاں کی اداسیاں اپنے لہجے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن۔۔۔۔۔۔ تمہارے بارے میں میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ضرور وعدے کے مطابق مجھ سے آ ملو گے۔ خیر چھوڑو، آؤ دو چار ڈبکیاں لگا لیں۔"

ارل کا دل سمندر میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر ماترا کا دل رکھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پانی اس کی توقع کے مطابق ٹھنڈا تھا۔ اس لیے

ایک ڈبکی لگائی تو اس کا جسم پانی کی ٹھنڈک سے مانوس ہوگیا۔ ان کے اردگرد بیسیوں افراد غسل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالتے ہوئے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ دو من چلے ربڑ کی کشتی میں دور نکل گئے تھے۔ ماترا کی تیراکی نے ارل کو بے حد متاثر کیا تھا۔ دس منٹ تک وہ مسلسل سمندر میں غوطہ زن رہی۔ پھر پشت کے بل تیرنے لگی۔

"آہا، کتنا لطف آرہا ہے!" ماترا آنکھوں سے پانی پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ مزا تو مجھے بھی بہت آرہا ہے۔" ارل نے کہا۔ "اگلے سال گرمیوں کی تعطیلات میں وہیں گزاروں گا۔" ارل نے کہا۔

وہ پندرہ منٹ تک تیرتے رہے۔ پھر ارل ماترا کی معیت میں ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں سینکڑوں لوگ ریت پر رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ بچے وسیع و عریض ساحل پر فٹ بال کھیل رہے تھے۔

"میں نے کیا قصور کیا ہے!" ارل نے سوچا۔ "مجھے بھی پُرمسرت زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ میں بھی ان کی طرح ہر فکر سے آزاد ہو کر دنیا جہاں کی آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔"

ماترا نے معاً چلا کر کہا۔ "سنبھلو ارل!" وہ دیوانہ وار ہاتھ پیر چلاتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ ارل نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا اسے سوائے پانی کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس لمحے اس نے اپنے برابر کسی کو پانی سے ابھرتے دیکھا۔ اس شخص نے پوری قوت سے ارل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ غوطہ خوری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ پشت پر آکسیجن کی چھوٹی ٹنکی لدی ہوئی تھی۔ جسامت میں ارل سے بھاری دکھائی دے رہا تھا۔ ارل خود کو چھڑانے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسے امید نہیں رہی تھی کہ وہ ساحل پر زندہ سلامت پہنچ سکے گا۔ خوف کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ ارل پر حملہ کرنے والے نے بے خبری میں اسے جا لیا تھا۔ وہ خود کو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا مگر اسے ذرا بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ حملہ آور آکسیجن کا سیٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس بنا پر اسے ارل پر قابو رکھنے میں دقت پیش آرہی تھی۔

صورتحال کو نازک پا کر ارل نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ مصنوعی بے ہوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ حملہ آور کی توجہ ارل پر مرکوز رہی ابھی وہ انتہائی قدم اٹھانے کو تھا کہ ارل نے پھرتی سے جوابی حملہ کر دیا۔ وہ پوری قوت سے غوطہ خور کا گلا دبانے لگا۔ حملہ آور نے پینترا بدلا اور اسے پانی میں لیے چلا گیا۔ ارل کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ بمشکل تمام اس نے خود کو حملہ آور کی گرفت سے چھڑایا اور پانی کی سطح سے ابھر کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر وہ تیزی سے ساحل کی جانب تیرنے لگا۔

ماترا اس کی منتظر تھی۔ ارل کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ ارل ٹھنڈی ریت پر بے دم ہو کر گر پڑا اور اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماترا تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں نے اسے تمہاری طرف بڑھتے دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ وہ تمہیں ہلاک کرنے کے درپے ہے۔" ماترا اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "وہ بڑی چالاکی سے تمہارے عقب میں پانی سے ابھرا تھا۔ وہ غوطہ خوری کا ماسک پہنے ہوئے تھا۔ لہٰذا میں اسے پہچان نہیں سکی۔ اصل میں اس کا ارادہ مجھے مارنے کا تھا مگر تمہیں راستے میں حائل دیکھ کر اس نے پہلے تمہیں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔ اپنی بزدلی پر مجھے ندامت محسوس ہو رہی ہے۔ دراصل میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ میں سخت دہشت زدہ اور نروس ہو گئی تھی......"

"ایسا ہونا فطری امر ہے۔" ارل نے مسکرا کر کہا۔ "میں خود بھی بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ذرا سی کسر رہ گئی تھی ورنہ میں نے اسے جان سے مار دیا ہوتا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بچ گیا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے۔ میں خود کو قاتل کہلانا پسند نہیں کرتا۔"

ارل سمندر میں اس جانب دیکھنے لگا۔ جہاں حملہ آور سے اس کی کشمکش ہوئی تھی مگر وہاں کوئی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔

ماترا نے کہا۔ "کیوں نہ ہم پولیس کو اس حملے کی اطلاع دے دیں۔ کنارے پر آنے پر اسے دھر لیا جائے گا۔ کیا خیال ہے؟"

ارل نے نفی میں سر کو جنبش دی اور سنجیدگی سے کہا۔ "وقت کا زیاں ہوگا۔ وہ پانی میں نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا دور نکل جائے گا۔ یہ ساحل بے ترتیب اور میلوں پھیلا ہوا ہے۔ وہ غوطہ خوری کا سامان تہہ میں چھوڑ کر سامنے بھیڑ میں شامل ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے پولیس کو بتانا بے سود رہے گا۔"

ماترا نے بھنویں اچکائیں اور بولی۔ "غوطہ خوری کا سامان اس نے کہاں سے لیا ہوگا اور اسے کس طرح معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں غسل کریں گے؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"آسان سی بات ہے۔ وہ مسلسل ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ ہمیں ساحل پر آئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم جلد یا بدیر پانی میں ضرور جائیں گے۔ غوطہ خوری کا سامان کسی بھی جگہوں سے کرایہ پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

ارل کی سانسیں اعتدال پر آچکی تھیں۔ لہٰذا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بدن سے ریت جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ مشروب کے ایک آدھ گلاس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"آؤ چلیں۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔" ماترا

نے کہا۔ "ہم فون کر کے مشروب اپنے کمرے میں منگوا لیں گے۔"

ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ارل نے کہا۔ "وہ شخص تنہا ہے اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ پیشہ ور قاتل عموماً تنہا کام کرتے ہیں۔ اگر دو آدمی ہوتے تو دو اطراف سے بیک وقت ہم پر حملہ آور ہو جاتے۔"

"یہ وہی شخص تو نہیں تھا جس سے ایئرپورٹ بار میں تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟"

"ممکن ہے وہی شخص ہو۔ قد و قامت ویسا ہی تھا۔ ہمارے بچ نکلنے پر وہ بری طرح تلملا رہا ہوگا۔ اس کا بس چلے تو مجھے کچا ہی چبا جائے۔ اب وہ شدومد سے پہلے مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تاکہ تمہیں آسانی سے ٹھکانے لگا سکے۔"

انہوں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیے اور تھوڑی دیر بعد ماترا اس کے کمرے میں مسکراتے ہوئی داخل ہوئی۔ اور پوچھا کہ کیوں نہ ہم ہوٹل کا حساب کر کے بھاگ لیں۔ ارل نے جواب میں کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ پیشہ ور قاتل ان کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ ان کے پاس ریوالور موجود ہے۔ خطرہ پڑنے پر وہ اس سے کام لے سکتے ہیں۔

سچی بات تو یہ تھی کہ ارل اس طرح فرار ہو کر اپنی کمزوری کا ثبوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اس کے وقار کا مسئلہ تھا۔ پھر وہ ماترا کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی ہیٹی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے فون کر کے ہوٹل کے بار سے مشروبات منگوا لیے اور دیر تک بیٹھے پیتے پلاتے رہے۔ کھانا بھی انہوں نے کمرے میں منگوا لیا تھا مگر ان سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ ان کی طبیعت باتوں کی طرف بھی مائل نہیں ہو رہی تھی۔ ماترا نروس تھی۔ اس کے اعصاب کشیدہ تھے۔ اس کا خیال تھا کہ فلائڈ اسے اس طرح مروانا چاہتا ہے کہ اس کی موت ایک حادثہ معلوم ہو۔ پہلے ان کی کار کو ٹکر ماری گئی۔ اور پھر اسے ڈبونے کی کوشش کی گئی۔ لیکن دوسری مرتبہ کی ناکامی کے بعد یقیناً اسے براہ راست گولی ماردی جائے گی۔ اب جو حملہ ہوگا حتمی ثابت ہو جائے گا۔ ارل نے اسے تسلی دی کہ وہ ساری رات پستول ہاتھ میں لیے اس کی حفاظت کرے گا اور صبح سویرے اسے ہوائی جانے والے طیارے پر سوار کرا دے گا۔ لیکن اس کے الفاظ ماترا پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے۔ لحہ بہ لحہ اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

ارل اپنی بیوی کی تاکید کو نہیں بھولا تھا۔ آٹھ بجے شب اسے کیرن سے فون پر بات کرنا تھی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی جو موجودہ صورتحال میں اس کی معصومیت کا یقین کر لیتی۔ وہ اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دیتی۔ اسے طلاق کے لیے عدالت میں گھسیٹ کر لے جاتی۔ اور اس کے کپڑے تک اتروا لیتی۔ کیرن سے یہ بات بعید نہیں تھی۔ اس نے آج تک کسی معاملے میں سمجھداری اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا

تھا۔ بہتر تو ہے کہ وہ کیرن سے فون کرنے سے پہلے ہوٹل کے پبلک ٹیلیفون پر اس سے رابطہ قائم کر لے۔ ماترا تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا وہ اسے نیچے لے آیا۔ ارل نے کاؤنٹر سے مطلوبہ سکے لیے اور آپریٹر کو ڈینور کے لیے فون ملانے کی ہدایت کی۔

"تم نے فون کیوں کیا؟" کیرن نے چھوٹتے ہی کہا۔ "کیا میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کہ میں خود فون کروں گی۔ میرا خیال ہے۔ میں نے واضح الفاظ میں تمہیں سمجھا دیا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد ٹرنک کال کے ریٹ گر جاتے ہیں اور میں اس وقت فون کرنا چاہ رہی تھی۔"

کیرن کے بیہودہ رویے سے وہ سخت دل برداشتہ ہوا تھا۔ اس نے جل کر کہہ دیا کہ وہ اس ویران مکان میں محض اس کے فون کے انتظار میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ کیرن کے انداز گفتگو نے اسے اپنے پروگرام پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے ماترا کا اپنی بیوی سے موازنہ کیا تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوا۔ اس لمحے اسے کیرن سے شدید ترین نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر کیرن نے ریسیور اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ وہ اپنی ساس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بستر مرگ پر پڑی تھی۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں مناسب الفاظ نہیں آرہے تھے لیکن اس کے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں رہی تھی۔ اس نے بے ڈھنگے انداز میں ساس کی عیادت کی۔ کیرن نے دوبارہ ریسیور سنبھال لیا اور یہ دلخراش خبر سنائی کہ وہ پروگرام کے مطابق اتوار کی شام سات بجے پہنچ رہی ہے لہٰذا گھر پر اس کی موجودگی ضروری ہے۔

"ضروری نہیں کہ میری تم سے ملاقات ہو ہی جائے۔" ارل نے دل ہی دل میں کہا۔

بوتھ سے نکل کر ماترا کی طرف بڑھتے ہوئے ارل کیرن کے عبرتناک انجام پر غور کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس کے لیے کسی اور کو قصوروار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے بدترین انجام کی خود ذمے دار تھی۔ ایک تو وہ کاری زخم لگاتی اور اوپر سے مسلسل نمک چھڑکتی رہتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ ماترا کے ساتھ ہوائی جا کر کیرن کو فراموش کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا وہ سنجیدگی سے اس بارے میں غور کر رہا تھا۔

وہ بستر پر جانے سے پہلے ماترا کے کمرے میں بیٹھا مشروب سے شغل کر رہا تھا جو ایک طرح سے ارل کا کمرہ بن چکا تھا۔ ارل نے کمرہ بدلنے کی تجویز پیش کی جس سے ماترا نے بے حد محظوظ ہوتی اور اس کا اظہار کر دیا۔ وہ شب خوابی کے باریک لباس میں سرتاپا

قیامت لگ رہی تھی۔ ارل اسے سلگتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں آخری پیگ لیے کھڑکی کے قریب کھڑی باہر تاریکی میں گھور رہی تھی۔ معاً وہ پلٹ کر ارل کے پاس آئی اور پیگ میز پر رکھ کر بولی۔ "میرا تو برا حال ہو رہا ہے۔ میرے جذبات ابھر رہے ہیں۔ پینے کے بعد میری کیفیت اسی قسم کی ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے جان کھینچ لی ہو۔"

"بے شک۔ پینے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے مجھے نیند نہیں آئے گی۔ لیکن میں سونے کی کوشش ضرور کروں گی۔" مائرا نے دونوں ہاتھ بلند کر کے توبہ شکن انگڑائی لی۔ "تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ میں کسی قدر خود غرض اور آرام طلب واقع ہوئی ہوں۔ یہ خود غرضی ہی تو ہے کہ تم رات بھر جاگ کر میری حفاظت کرو گے اور میں ٹانگیں پسار کر سو رہی ہوں گی۔"

"میری فکر مت کرو جانِ من!" ارل نے اسے جانے کا اشارہ کر کے کہا۔ "میری آنکھوں میں دور تک نیند کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ان حالات میں مجھے نیند آ ہی نہیں سکتی۔ پھر مجھے چند اہم معاملات پر غور کرنا ہے۔ جس کا تعلق میرے اور تمہارے مستقبل سے ہے۔ میری رات تو غور و فکر میں بسر ہو جائے گی۔ جاؤ تم کیوں اپنی نیند حرام کر رہی ہو۔"

"میرا دل دوسرے کمرے میں جانے کو نہیں چاہ رہا۔" مائرا نے پھر انگڑائی لی۔ "تم مجھے مطلبی اور خود غرض تو خیال نہیں کر رہے؟"

"نہیں بھئی۔ اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آ رہا ہوں۔"

"تم واقعی ہمدرد اور نیک انسان ہو ارل!" مائرا نے سنجیدگی سے کہا۔ "افسوس کہ تمہاری بیوی نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ خبیث دروازہ توڑ کر تو نہیں گھس آئے گا؟"

"میرا خیال ہے وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا۔ ممکن ہے وہ کسی ترکیب سے قفل کھول کر دبے قدموں اندر آنے کی کوشش کرے اور اسی لیے میں ریوالور ہاتھ میں لیے اس کے استقبال کو تیار بیٹھا ہوں۔"

مائرا نے اپنی گہری سیاہ بھنویں اچکائیں اور بولی۔ "تمہارے خیال میں وہ واقعی اندر گھسنے کی سعی کرے گا؟"

"اصولاً تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایک پیشہ ور قاتل سے اس قسم کی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"اگر میں درمیانی دروازہ کھلا رہنے دوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

ارل نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیا یہ سوال احمقانہ نہیں ہے؟ اگر تمہیں نیند نہ آئے تو بلا جھجک یہاں چلی آنا۔ میں تمہیں اسی حالت میں ملوں گا۔"

مائرا نے آگے بڑھ کر ارل کے رخسار پر بوسہ دیا مگر اس میں وہ گرمجوشی نہیں تھی جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ بہرحال اپنائیت کے اس اظہار سے اسے خوشی ہوئی تھی۔ وہ جذباتی انداز میں بولا۔ "تم میری بیوی سے قطعی مختلف ہو مائرا۔ شادی کے ابتدائی سالوں میں سونے سے پہلے وہ میرے رخسار پر اس طرح بوسہ دیا کرتی تھی۔ دن بدن اس کا طرزِ عمل سرد ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں تو وہ اس انداز میں شب بخیر کہتی ہے جیسے میں اس کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔"

"یہی بات میں فلائڈ کے بارے میں کہہ سکتی ہوں۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ انتہائی سرد اور معاندانہ ہو گیا تھا۔ میں اس قسم کے آدمی کے ساتھ کسی صورت میں زندگی بسر نہیں کر سکتی۔"

ارل نے شانے اچکا دیے اور وہ شب بخیر کہہ کر دروازے کی طرف چل دی۔

"مائرا! ایک بات تو سنو۔" ارل نے کہا۔

وہ دروازے کے قریب رک گئی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر میں اپنا ارادہ بدل دوں اور تمہارے ساتھ ہوائی چلوں تو کیسا رہے گا؟"

مائرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ "میں تمہارے منہ سے یہ الفاظ سننے کی منتظر تھی!"

"ہم صبح اس بارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔"

"اچھا، پھر شب بخیر۔"

مائرا نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چند لمحے بعد اس کے کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ ارل نے بھی ہاتھ بڑھا کر ایک بلب کے سوا دوسری روشنیاں بجھا دیں۔ وہ اس انداز میں بیٹھ گیا کہ کھلے دروازے سے مائرا کا کمرہ اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ دونوں کمروں کے صدر دروازے وہ پہلے ہی مقفل کر چکا تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ کمرے میں ایئرکنڈیشنر کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہونا آسان بات نہیں تھی۔ شور پیدا کیے بغیر یہاں آنا تقریباً ناممکن تھا۔

صبح تین بجے ارل پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے بڑی کوشش سے پریشان کن خیالات سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ دو گھنٹے کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ مائرا کے ساتھ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اسے اپنی بیوی کی ذرہ برابر پروا نہیں رہی تھی۔ اپنے فیصلے پر اسے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی۔ گوکہ اس بات کا امکان تھا کہ مائرا کی رفاقت اسے نصیب نہیں ہو سکے گی۔ اس نے شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا۔ بستر پر نیم دراز سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے وہ مستقل مائرا کے دل خوش کن تصورات میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ مائرا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

تھا۔ اس بے کیف اور ویران زندگی سے موت بہتر تھی۔ جمعرات کی شب اور سنیچر کی دوپہر کے واقعات کے بعد وہ مائرا سے اور قریب ہو گیا تھا۔

ارل کو جھپکی آ گئی تھی۔ نیند گہری نہیں تھی۔ لہٰذا اس ہلکی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ آواز مائرا کے کمرے سے آئی تھی۔ ارل نے آواز کا تصور کیا اور اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ آواز کس چیز کی تھی۔ مائرا کے کمرے کے صدر دروازے کے قفل کو کسی چیز سے کھولا جا رہا تھا۔ پنجوں کے بل بغیر آواز پیدا کیے وہ مائرا کے ۔۔۔۔۔۔۔ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک کھڑکی کا پردہ قدرے ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے چاندنی کمرے میں در آئی تھی۔ نیم تاریکی میں مائرا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جہازی سائز کے بستر پر کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ وہ شخص دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور محتاط انداز میں بستر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معاً مائرا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دراز قد شخص پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ مائرا کے چلانے سے حملہ آور اچھل پڑا۔ اس نے پھرتی سے ایک لانبا تیز دھار چاقو بیلٹ سے نکال لیا۔ اس نے مائرا کے نرم و نازک جسم پر چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحے ارل نے ہاتھ اٹھا کر گولی چلا دی۔ حملہ آور کی پشت میں سوراخ ہو گیا۔ اور سرخ خون فرش پر گرنے لگا۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ مائرا سسکتی چیختی بستر کے کونے میں دبک گئی۔ ارل نے بمشکل سوئچ بورڈ تلاش کیا اور روشنی کر دی۔

ارل نے مائرا کو سینے سے لگا کر تسلی دی۔ اسے آرام کرسی پر بٹھایا اور حملہ آور کی لاش کو سیدھا کر کے اس کا جائزہ لینے لگا۔ ارل کی مڈبھیڑ اس سے ایئرپورٹ بار میں ہو چکی تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑ رہی تھیں۔ شکاری چاقو لاش سے ایک فٹ پرے فرش پر چمک رہا تھا۔

مائرا نے کہا۔ "یہ وہی شخص ہے نا جس سے بار میں ہماری ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے اسے جہنم رسید کر دیا ہے۔" ارل جو خود پر قابو پا چکا تھا۔ سرد لہجے میں بولا۔

"اس نے دو مرتبہ قاتلانہ حملہ کیا تھا؟"

"ہاں یہی وہ خبیث ہے۔"

"اب ہم کیا کریں گے؟" مائرا نے سرگوشی میں کہا۔

"ہمیں پولیس کو مطلع کرنا چاہیے۔"

مائرا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ خفگی سے ارل کی طرف دیکھنے لگی۔

"پولیس کو اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟ نہیں میں پولیس کو قتل کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی!"

"کیوں نہیں بتانا چاہتیں؟" ارل نے کپکپاتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا لیا۔ اس کی نظریں لاش پر مرکوز تھیں۔

"اس لیے کہ یہ خبر ملک بھر کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپے گی۔ ملک کا سب سے بڑا اسکینڈل بنے گا اور میرے لیے منہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ ممکن ہے یہ بات تمہیں بری لگے مگر میں اب بھی فلائڈ کی بیوی ہوں۔ تم خود بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اس مصیبت کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔" ارل مائرا کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم اس مصیبت سے بچ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کوشش کر کے اس بلا کو ٹالا جا سکتا ہے۔ اگر میں اس شخص کے قتل میں ملوث ہو گئی۔ تو میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہے گی۔ تفتیش مکمل ہونے تک میں شہر نہیں چھوڑ سکوں گی۔ ایک لحاظ سے قید ہو کر رہ جاؤں گی۔ فلائڈ کے گرگے مجھے بآسانی تلاش کر لیں گے۔ فلائڈ کا مارے خوف کے برا حال ہوگا۔ اسے خدشہ ہوگا کہ میں اسے بے نقاب کر دوں گی، پھر وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اخبارات میں قتل کی خبر چھپتے ہی وہ مجھے ایک گھنٹے کے اندر مروانے کی سرتوڑ کوشش کرے گا چاہے اسے لاکھوں ڈالر خرچ کرنا پڑیں۔"

ارل نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ قتل کی خبر ملتے ہی وہ تمہیں ہر صورت میں قتل کروانے کی کوشش کرے گا کیونکہ یہ اسکینڈل اسے برباد کر دے گا۔ اس کے دامن پر کبھی نہ مٹنے والا دھبہ لگ جائے گا۔ اچھی بات ہے۔ میں تمہیں ہوائی کے لیے جہاز میں سوار کرا دوں گا اور یہاں رک کر حالات کا جائزہ لیتا رہوں گا۔ پھر موقع ملتے ہی تم سے آ ملوں گا۔"

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چل رہے؟"

ارل کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں جانِ من! میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ چند دنوں تک تو کسی صورت میں نہیں جا سکتا۔ مجھے ضرور اشتہاری مجرم قرار دے دیا جائے گا! کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں؟"

"پولیس کو معلوم ہو جائے گا کہ مقتول جرائم پیشہ تھا۔ وہ انہیں دوسرے جرائم پیشہ افراد سے رقابت کا شاخسانہ قرار دیں گے۔" مائرا کا لہجہ التجا آمیز تھا۔ "بہرحال ایسے آدمی کے قاتل کو تلاش کرنے کے لیے پولیس زیادہ سرگرمی نہیں دکھائے گی سرسری تفتیش کے بعد فائل بند کر دی جائے گی۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" ارل نے دروازے کے پاس جا کر کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ساری کھڑکیاں بند ہیں کمروں کی دیواریں موٹی ہیں۔ ریوالور بہت چھوٹا ہے۔ مجھے یقین ہے باہر کسی

لے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ بہرحال اگر انہوں نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تو میں بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ دیکھا جائے تو میرا اس میں قصور بھی نہیں ہے۔ میں نے محض اسے تمہارے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میری بات غور سے سنو ماٹرا۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ وہ ہمیں اس قتل میں ملوث نہیں کر سکتے۔ مجھ پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکے گا۔"

ارل دوبارہ لاش کے پاس پہنچ گیا۔ وہ چند لمحے مرنے والے کی صورت تکتا رہا۔ پھر بولا "ہمیں مقتول کا نام معلوم کرنا چاہیئے انگلیوں کے نشانات بھی صاف کر دینے چاہئیں۔ میں اس کے بٹوے کو چھوئے بغیر نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس دستانے ہوں گے؟"

ماٹرا نے اثبات میں سر ہلا دیا "دستانے تو ہیں مگر وہ تمہارے سائز کے نہیں ہوں گے۔"

ارل مسکرا کر بولا "پھر بٹوا تمہی کو نکالنا پڑے گا۔"

ماٹرا نے پرس سے دستانے نکال کر پہن لیے۔ ارل لاش سے دور ہو گیا تاکہ ماٹرا اس کی جیب سے بٹوا نکال لے۔ ماٹرا نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور بٹوا کھول کر دیکھنے لگی "مقتول کا نام اوین کراس تھا۔" وہ مقتول کے ڈرائیونگ لائسنس پر نظریں مرکوز کر کے بولی "عمر چھتیس برس۔ رہائش کلورسٹی میں ہے۔"

"اوین کراس، کلورسٹی" ارل نے پرخیال لہجے میں کہا "اس سے تو زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ دیکھو اس کے بٹوے میں اور کیا ہے؟"

ماٹرا نے بٹوے سے ایک اور کاغذ نکال لیا "انیس سو ساٹھ کے ماڈل کی کرائسلر کار کا رجسٹریشن ہے۔ ایک کلب کی ممبر شپ اور چند کریڈٹ کارڈ بھی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک عدد لائبریری کارڈ بھی موجود ہے۔ بھلا اس شخص کو کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دو سو ڈالر کے نوٹ بھی ہیں۔ بس یہی کچھ ہے۔" ماٹرا نے بٹوا دوبارہ مقتول کی جیب میں رکھ دیا۔

"اس کے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی نہیں لوگی؟"

ماٹرا نے جیبیں ٹٹولیں تو ایک چابی برآمد ہوئی جسے اس نے ارل کی طرف بڑھا دیا چابی پر ماسٹر کا "لیبل" لگا ہوا تھا۔

"اس کے کمرے میں داخل ہونے کا راز کھل گیا۔" ارل نے کہا "ہر کمرے کی چابی کی ایک ڈپلی کیٹ استقبالیہ کلرک کے پاس ہوتی ہے۔ میرے خدا! یقیناً اس نے استقبالیہ کلرک کا حشر خراب کر دیا ہوگا۔ کسی نے کلرک کو مردہ یا بے ہوش دیکھ لیا تو فوراً پولیس عمارت کا گھیراؤ کر لے گی۔ چابی اس کی جیب میں ڈال کر چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جلدی کرو! کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔ میں اتنی دیر میں انگلیوں کے نشانات اور دوسرے ثبوت صاف کر رہا ہوں۔"

دس منٹ میں انہوں نے دونوں کمروں سے اپنی موجودگی کے تمام نشانات مٹا دیئے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ارل نے لابی کی ڈیوٹی تک کو دیکھ لیا تھا۔ لابی میں انہوں نے کلرک کو کاؤنٹر کے پیچھے گرے ہوئے پایا۔ اس کی دائیں کنپٹی پر سوجن نمایاں تھی لیکن اس کا سانس معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں کار تک پہنچتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

"گاڑی کے لائسنس نمبر کا کیا ہوگا؟" ان کی کار شاہراہ پر پہنچی تو ماٹرا نے کہا "تم نے ہوٹل کے کارڈ پر اس کا نمبر تو نہیں لکھ دیا تھا؟"

"کارڈ پر لائسنس نمبر کے لیے جگہ دی گئی تھی مگر میں نے اسے خالی چھوڑ دیا تھا۔ کلرک نے بھی اس کے لیے اصرار نہیں کیا تھا۔"

وہ سانتا مونیکا میں کافی پینے کے لیے ٹھہرے پھر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ وہ ایئرپورٹ پہنچے تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ہوائی جانے والا جہاز آٹھ بجے روانہ ہونے والا تھا۔ ماٹرا نے اپنا ٹکٹ خریدا اور کلرک نے اس کا سوٹ کیس طیارے میں رکھنے کے لیے لے لیا۔

ارل نے کار ایئرپورٹ کی عمارت کے سامنے مخصوص پارکنگ کی جگہ پر کھڑی کی تھی۔ وہ دونوں کینٹین میں جہاز کی روانگی کے وقت تک بیٹھے راز و نیاز میں لگے رہے، مستقبل کے منصوبے بناتے رہے۔ انہوں نے ہوٹل میں پڑی ہوئی لاش کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔ وہ اسے یکسر فراموش کر چکے تھے۔

گیٹ پر ماٹرا نے ارل کا ہاتھ پکڑ کر کہا "مجھے پھر تمہیں ان حالات میں تنہا چھوڑتے ہوئے ندامت ہو رہی ہے۔ مجھے اس طرح نہیں جانا چاہیئے۔"

ارل نے اس کی کمر تھپتھپا کر کہا "میں اس موضوع پر تم سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"اگر حالات بگڑ جائیں اور تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو —" ماٹرا نے کہا "میں کونا ہوٹل میں ملوں گی۔ تم وہاں مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ میں تمہارا فون ملتے ہی پہنچ جاؤں گی۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی ماٹرا۔ ہوائی میں تم کتنے دن ٹھہرو گی؟"

"اس کا انحصار حالات پر ہے۔ اگر انہوں نے ہوائی میں میرا سراغ لگا لیا تو مجھے وہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

"ظاہر ہے تم اگلی منزل کا تعین نہیں کر سکتیں۔"

ماٹرا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی "دنیا بہت بڑی ہے۔ جہاں جگہ ملے گی پہنچ جاؤں گی۔"

لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں کو جہاز پر سوار ہونے کی آخری ہدایت دی گئی۔ ارل نے جلدی سے ماٹرا کو بانہوں میں بھر لیا اور گرمجوشی سے اسے پیار کرنے لگا۔ ماٹرا اس سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ پھر وہ تیزی سے طیارے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ بار بار اس کی طرف پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ معاً کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی "تم ماٹرا سے کبھی نہیں مل سکو گے۔"

اس شام سات بج کر دس منٹ پر کیرین اپنے گھر کے دروازے پر ٹیکسی سے اتری۔ ارل ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز ایک جاسوسی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ کیرین نے سوٹ کیس فرش پر رکھا اور خاموشی سے کوٹ اتارنے لگی۔ وہ سنجیدگی سے ارل کو دیکھنے لگی۔

"کہو ڈارلنگ، دو دن کیسے گزرے؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"بس ٹھیک ہی گزرے۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تم خاصے بور ہوتے ہو گے۔" کیرین اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے۔ مگر میں بوریت کا عادی ہو چکا ہوں۔" ارل نے رسالہ تپائی پر رکھ کر سگریٹ سلگا لیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں، کار کا بیڑا غرق کس طرح ہوا؟" کیرین نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"کار؟"

"ہاں کار۔ کیا بہرے ہو گئے ہو؟ میں اس کھٹارا کار کی بات کر رہی ہوں جس کا حلیہ تبدیل ہو چکا ہے۔ مجھے تو وہ اب کسی طرف سے بھی کار نظر نہیں آتی اور جو......"

"اچھا اچھا سمجھ گیا۔" ارل نے اس کی بات کاٹ کر کہا "گویا تم نے کار کو دیکھ ہی لیا۔"

"بے شک، میں بھلا اسے کیسے نظرانداز کر سکتی تھی۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا تم اسے کسی کباڑی کے ہاتھوں بیچ دو —"

"میری بات سنو گی یا اپنی ہی کہے جاؤ گی؟ خدا کے لیے دوسرے کو بھی بولنے کا موقع دیا کرو۔ دراصل ایک شرابی نے کار کو زبردست ٹکر ماری تھی۔ غلطی سراسر اسی کی تھی۔ تم گاڑی کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتی ہو کہ حادثہ میری وجہ سے پیش نہیں آیا تھا۔"

"ارل تم واقعی چغد ہو! کار کی مرمت پر کم از کم پانچ سو ڈالر خرچ ہوں گے؟"

"ہمیں صرف سو ڈالر دینا پڑیں گے۔ باقی اخراجات انشورنس کمپنی ادا کرے گی۔ تمہیں میرا خیال نہیں آیا؟ میں اس حادثے میں ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔ کیا تمہیں میری بالکل پرواہ نہیں ہے؟"

"ہاں —" کیرین سپاٹ لہجے میں بولی "مجھے پرواہ ہے۔ کیا تم میرا سوٹ کیس بیڈ روم میں لے جانا پسند کرو گے؟"

"یقیناً" ارل نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہاری آنٹی کیسی ہیں؟"

ارل کو آنکھیں کھلی رکھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ نیند کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ سر ایک طرف کو جھکا پڑ رہا تھا۔ کیرین نے ٹیلیویژن دیکھتے ہوئے اس امر کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا اس نے چھٹانک بھر افیم کھالی ہو۔ نو بجے تک وہ بستر پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

کیرین دبے پاؤں ٹیلیویژن کے قریب پہنچی۔ اس کی آواز مدھم کی اور اسی انداز سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے دروازے کو بند کر کے مقفل کر دیا۔ سہمے ہوئے انداز سے اس نے کلورسٹی ہوٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ کیرین نے چار مرتبہ وہ نمبر ملانے کی کوشش کی مگر ہوٹل سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ پانچویں کوشش میں ہوٹل سے رابطہ ہو گیا اور اس نے آپریٹر کو کمرے کا نمبر بتا کر فون ملانے کی استدعا کی۔ آپریٹر نے کمرے کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

"پلیز میں ایک ضروری معاملے پر مسٹر اوین کراس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" کیرین نے التجا آمیز لہجے میں کہا "اب تک تو انہیں ہوٹل پہنچ جانا چاہیئے تھا۔"

"میں نے کئی مرتبہ ان کے کمرے کا نمبر ملانے کی کوشش کی ہے مادام۔" آپریٹر نے شیریں لہجے میں کہا "مسٹر اوین کراس صبح سے غائب ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

کیرین دھڑکتے دل سے اوین کے کمرے میں فون کی گھنٹی سنتی رہی۔ خدا خیر کرے۔ اب تک تو اوین کو پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ کیا یہی اس کی محبت ہے؟ اس نے تو کہا تھا کہ میں اتوار کی شام تک بیوہ ہو چکی ہوں گی۔ ارل کے ستائیس ہزار ڈالر ملیں گے تو ہم شادی کر لیں گے۔ کیا وہ مجھے دھوکا دے گیا ہے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ میرے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کرے گا! ممکن ہے اس نے ارل کو قتل کرنے کی کوشش کی ہو۔ اور اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔ کوئی بات نہیں اوین۔ اس مرتبہ تم ناکام رہے۔ اگلی مرتبہ کوشش کر لینا مگر جانِ من، مجھ سے بات تو کرو۔ پلیز اوین، میں تمہاری سحرانگیز آواز سننا چاہتی ہوں۔

"مجھے افسوس ہے مادام۔" آپریٹر نے شیریں لہجے میں کہا۔ "مسٹر اوین کراس کمرے میں — موجود نہیں ہیں۔"

صادق کی ایک [illegible]

ایک عجیب انسان کی سرگزشت جو سوچ کی انگلیوں سے انسانی دماغوں کی نبض ٹٹولتا ہے

فرہاد علی تیمور

سوچ نگر کے شہزادے فرہاد علی تیمور کی ناقابل فراموش داستان حیات

میرا نام فرہاد علی تیمور ہے۔ میرے والدین میری کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ چچا نے میری جائیداد ہتھیا کر میری پرورش کی۔ مجھے بچپن ہی سے پُراسرار علوم سے دلچسپی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ میں نے ٹیلی پیتھی اور شمع بینی سیکھ لی۔ چچا کے گھر سے نکل کر میں پھوپھی کے گھر منتقل ہو گیا پھر میں نے ان علوم پر دسترس حاصل کی اور چچا سے اپنی جائیداد چھین لی۔ پھوپھی نے زہر کھا لیا۔ میری چچا زاد غزالہ میرے پاس دولت آ جانے کے بعد مجھ پر ریجھ گئی مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا۔ تب اس کے چند غنڈے دوست میرے پیچھے لگ گئے ایک جنگل میں انہوں نے مجھے گھیر لیا اور زخمی کر کے فرار ہو گئے اسی دوران مجھے وہاں موجود ایک ہندو سادھو کیدار اٹھا لایا۔ اس کی جھونپڑی میں چھپا نامی ایک عورت نے بتایا کہ جاند کی چودھویں کو میری قربانی دی جائے گی تاکہ وہ اینگلو انڈین لڑکی سامی کو جو ایک بلی کے روپ میں تھی، شکست دے سکے۔ میں نے قربانی والے دن ان کے منتر میں گڑبڑ پیدا کر دی۔ سامی، چھپا کے روپ میں میرے ساتھ آ گئی۔ کیدار مارا گیا اور چھپا فرار ہو گئی۔

ایک شام میں اسے لیکر کلب گیا تو ایف بی آئی والوں نے چھپا کے روپ میں سامی کو پہچان لیا۔ کیونکہ چھپا پاکستان میں بھارت کی جاسوسی کر رہی تھی۔ پھر اسی دوران ایک بھارتی ایجنٹ بھوانی شنکر کے ساتھیوں نے سامی کو اغوا کر لیا۔ مجھے ایف بی آئی والوں نے گھیر لیا تھا۔ اور جب تک میں انہیں اپنی سچائی کا یقین دلاتا وہ لوگ سامی کو لے کر سرحد پار کر گئے۔ ہمارا تعاقب ناکام رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حسن محمود نامی ایف بی آئی کا ایک ملازم ہی بھوانی شنکر ہے میری اطلاع پر بھوانی شنکر کو گرفتار کر لیا گیا اور اس سے خفیہ رازوں والی فلم برآمد کر لی گئی۔ بھوانی شنکر کی سوچ سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کا سرغنہ بلیک گائیڈ نامی آدمی ہے اسی رات میری خوابگاہ پر کسی نے حملہ کر دیا جو بلیک گائیڈ کا ایک کونگا بہرہ ملازم شتیل تھا وہ مجھے زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ مجھے پولیس ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ بلیک گائیڈ میرے تعاقب میں تھا میری اطلاع پر آئی بی کے ڈائریکٹر شبیر حسن نے بلیک گائیڈ کے ہوٹل کے کمرے میں چھاپہ مارا تو بلیک گائیڈ نے انہیں ہپناٹزم کے ذریعے ٹرانس میں لے لیا میں ہسپتال سے فرار ہو گیا کیونکہ شبیر حسن اس کے اشاروں پر چل کر مجھے گولی مارنے کے لئے آ رہے تھے بلیک گائیڈ کے گونگے شتیل کو قتل کرنے کے لئے میری ایک دست زرس نے چند غنڈوں کو اس کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے اسے شدید زخمی کر دیا عین موقع پر ہی وہاں پہنچ کر شتیل کو بچا لایا۔ یوں شتیل میرا احسان مند ہو کر میرا دم بھرنے لگا اس کے بعد میں نے بلیک گائیڈ پر قابو پا لیا جس نے بتایا کہ وہ کراچی میں مقیم کرسٹوفر اور انجلا نامی جاسوسوں کو راز فروخت کرتا تھا۔ شبیر حسن کو آئی بی سے معطل کر کے سید احمد صاحب کو ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ میں کراچی پہنچا کرسٹوفر اپنی بھتیجی انجلا کے ساتھ آگ کے ساتھ کچھ شعبدے دکھا کر اعلیٰ افسروں کو دام میں لاتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کرسٹوفر دراصل ٹیلی پیتھی کے ایک ماہر ماسٹر لوشے کا نمائندہ ہے اور ہر روز ماسٹر لوشے اس سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے رابطہ قائم کر کے اہم راز معلوم کر لیتا ہے اس کے علاوہ وہ بیل منڈو نامی ایک ایجنٹ سے ایک ملک کی اہم فلمیں حاصل کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا میں نے ان دونوں کو ہلاک کر دیا۔ یوں ماسٹر لوشے نے بیل منڈو کو میرے پیچھے لگا دیا۔ میں فرار ہو کر پنڈی اور پھر مری پہنچا۔ بیل منڈو کا ایک گرگا چیتل میرے پیچھے لگ گیا۔ میں نے شتیل کو مقابلے پر بھیج دیا اور یوں معلوم ہوا کہ چیتل، شتیل کا بھائی ہے۔ پھر چیتل بھی میری تحویل میں آ گیا کیونکہ میں نے بیل منڈو کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے بیل منڈو سے حاصل کردہ فلمیں سید احمد کے حوالے کیں تاکہ وہ اسے آئی بی کے اعلیٰ افسران کی تحویل میں دے دیں مگر ماسٹر لوشے خود مجھ سے ٹکرانے کے لئے چل پڑا۔ طیارے میں سفر کے دوران ہی وہ ذہنی طور پر حملہ کرنے لگا کہ سید احمد کے دماغ تک پہنچ گیا۔ سید احمد اس کے آگے بے بس ہو کر فلمیں آئی بی کے ہیڈ کوارٹر تک نہ پہنچا سکے اور ماسٹر لوشے پنڈی پہنچ گیا۔ اس کے ہمراہ نوبر سوکھنے کی ماہر سونیا بھی تھی۔ میں جان بچانے کے لئے دوسرے طیارے سے کراچی پہنچ گیا۔ ماسٹر لوشے بھی میرے پیچھے ہی آ گیا۔ میں نے اسے غافل پا کر اس کی شراب میں پاگل کر دینے والی دوا الفرازیل ملا دی مگر شراب پینے سے پہلے ہی اس نے عقب سے وار کر کے مجھے بے ہوش کر دیا اور پھر مجھ پر حاوی ہو گیا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جزائر ہوائی روانہ ہو گیا وہ جس گروہ کا نمائندہ تھا اس کے کئی ماسٹر تھے۔ جو ٹیلی پیتھی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی جرائم پیشہ تنظیم کے مالک تھے جزائر ہوائی میں ماسٹر لوشے زہریلی شراب پی کر مر گیا اور مجھے اس تنظیم کے دوسرے لوگوں نے سونیا کے ہمراہ جزائر کرائی پہنچا دیا۔ سونیا اس دوران مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ جزائر کرائی ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا وہاں انہوں نے بجلی کے آلات سے میرا ذہن صاف کر دیا اور اب میں ایک نوزائیدہ بچے کی طرح بے خبر ہو گیا تھا۔ مجھے از سر نو بولنے اور رہن سہن کا طریقہ سکھایا گیا۔ یہاں سونیا کا باپ اور کچھ اور لوگ جو اس تنظیم کے محکوم تھے، ماسٹروں کے خلاف منصوبہ تیار کر رہے تھے مجھے بھی اس منصوبے میں شریک کر لیا گیا پھر ایک دن میری سربراہی میں وہاں بغاوت کر دی گئی ماسٹروں کی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر تباہ کر دیا گیا اور کئی ماسٹروں کو ہلاک کر دیا گیا مگر سپر ماسٹر بچ کر فرار ہو گیا پھر ہم سب لوگ ایک بحری جہاز پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے راستے میں سپر ماسٹر کے وفاداروں کی سازشوں سے اکتا کر میں اور سونیا جزیرے سے حاصل ہونے والے مختلف ملکوں کے رازلے کر ایک لانچ میں بیٹھ کر فرار ہو گئے ہم ایک جزیرے میں جا تھہرے جو اسمگلروں کا اڈہ تھا تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہم اسمگلروں پر حاوی ہو گئے مگر بعد میں قریبی جزیرے سے ان کے باس کی معیت میں کمک پہنچ گئی۔ ان کے باس نے جو خود کو ماسٹر شیطان کہتا تھا دھوکے سے مجھ پر قابو پا لیا پھر سونیا کو اور مجھے اپنے ہمراہ لے جا کر زنجیروں میں بند کر کے چھت سے لٹکا دیا۔ وہ ہم سے ہماری اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ سونیا نے میرے اشارے پر پیچ کھینچنے کی اسی شرط کے ساتھ بھرپور کہ وہ لوگ میرے لئے ایک موم بتی جلا دیں۔ ماسٹر شیطان مان گیا۔ موم بتی کے جلتے ہی میری ٹیلی پیتھی کی صلاحیتیں لوٹ آئیں اور میں نے بازی الٹ دی۔ ماسٹر شیطان کے ساتھیوں نے بموں کے دھماکے کر کے اپنے ہی ساتھیوں کو ختم کر دیا۔ اور اسی لمحے جاپان کی بحری پولیس جزیرے کی طرف متوجہ ہو گئی بحری پولیس نے جزیرے پر ریڈ کیا اور بہت سے لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی گرفتار کر لیا گیا میری نشاندہی پر نزدیکی جزیرے کی تلاشی لی گئی اور وہ کاغذات برآمد کر لئے جو ہم جزیرہ کرائی سے لائے تھے جاپان لے جا کر وہاں کی آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا گیا جس کا سربراہ کرنل جوشو ہو تھا جو شو ہو

"نہیں۔ میں جاؤں گی۔" سونیا نے رومانہ کو گھور کر کہا۔
رومانہ اس کی طرف پلٹ کر بولی "تم میرے ہاتھوں سے مرنے کے لیے یہاں آئی ہو۔"

سونیا نے اسے ایسے دیکھا جیسے کوئی ضدی بچی سامنے کھڑی ہو۔ پھر اس نے شنکر سے کہا "کیا اس دنتی شیل پیتی کو... یہ یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ فرہاد پر میرا حق ہے۔ یہ رومانہ جیسی لڑکیاں اس کے لیے محض تفریح کا سامان ہوتی ہیں۔"

شنکر نے جواب دیا "دیوی تمہاری سوچ کو پڑھ سکتی ہے۔ لیکن یہ رومانہ ہندی اور اردو نہیں جانتی ہے۔ بس اس کی دیوانگی کا علم ہے۔ یہ فرہاد کے لیے ہانگ کانگ سے یہاں آئی ہے۔"

"میں اس کی دیوانگی کو اسی کھنڈر میں دفن کر دوں گی۔"

شنکر نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسا ہو جائے تو بہتر ہے کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک پجارن کی سی پوتر (پاک) زندگی گزارنے والی دیوی کا حکم ہے کہ فرہاد کے ساتھ ایک ہی جیون ساتھی ہوگی۔ تم دونوں فیصلہ کر لو کہ تم میں سے کون اس کے ساتھ زندگی گزارے گی۔ فیصلے کے بعد جو زندہ رہے گی میں اسے فرہاد کے پاس پہنچا دوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی "ہا۔ ہٹپ۔ ہٹپ" کی آواز سنائی دی۔ رومانہ دونوں ہاتھوں سے قلابازیاں کھاتی، جمناسٹک کے کرتب دکھاتی ہوئی سونیا کے اطراف دائرے کی صورت میں گھوم رہی تھی۔ سونیا اس کے لڑنے کے انداز سے واقف نہیں تھی کہ وہ کس زاویے سے حملہ کرے گی۔ لہٰذا جب حملہ ہوا تو وہ مار کھا گئی۔ اس کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی۔ وہ پھر لڑکھڑاتی ہوئی ایک پتھر کے پاس جا کر ٹک گئی۔

اس کی باچھوں سے ذرا سا خون نکل آیا تھا۔ وہ الٹی ہتھیلی سے اپنے لہو کو پونچھتی ہوئی اور غراتی ہوئی بولی "بے بی! موت ہمیشہ سونیا سے دامن چھڑا کر بھاگتی ہے۔ میں آخری وارننگ دیتی ہوں بھاگ جا۔ یہاں سے بھاگ جا۔ مجھے تیری چڑھتی جوانی پر ترس آ رہا ہے۔۔۔"

"ہا۔ ہٹپ۔ ہٹپ۔۔۔" جمناسٹک کی چک پھیری شروع ہوگئی۔ اب وہ سونیا اور پتھر کے اطراف دائرے کی صورت میں گھوم رہی تھی۔ اس بار سونیا نے گہری نظروں سے جائزہ لیا کہ وہ کتنی دیر میں ایک دائرے کی تکمیل کرتی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ پھر اچانک ہی چھلانگ لگائی۔ فضا میں اچھلتی ہوئی، تیرتی ہوئی اپنے ٹارگٹ کی طرف گئی۔ لیکن کراہ کے ساتھ کنکروں اور پتھروں کے فرش پر گر پڑی۔

ایسی سخت چوٹیں آئی تھیں کہ وہ فوراً ہی نہ اٹھ سکی۔ رومانہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ایک پتھر کی بلندی پر کھڑی ہوئی تھی۔ کون جانتا ہے کہ سمندر کی کون سی لہر کتنی بلندی تک اٹھے گی اور کتنی پستی میں آ کر ساحل کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔

وہ بڑی رعونت سے بولی "مجھے سمندر کی لہروں نے اچھالا ہے اور فرہاد کے بازوؤں نے سنبھالا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ فرہاد مجھے تمہارا قاتل کہے۔ میں اب بھی تمہیں زندگی کی خیرات دیتی ہوں، واپس چلی جاؤ۔"

سونیا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر اپنے گلے سے بندھے ہوئے اسکارف کو کھولتی ہوئی بولی "فرہاد ایک نشہ ہے جو مرنے کے بعد ہی ذہن سے اترتا ہے۔ اب میرے قریب آ کر دیکھ کہ میں یہ نشہ کیسے تیرے ذہن سے اتارتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اسکارف کو اپنی آنکھوں پر باندھ لیا۔ رومانہ اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اندھی کیوں بن رہی ہے۔ اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بند آنکھوں کی تاریکی میں اپنی ساری توجہ صرف رومانہ کی بُو پر مرکوز کرے گی۔ وہ جو جمناسٹک کے کرتب دکھاتی ہے تو ان کرتبوں کے فریب میں نہیں آئے گی۔

پھر ایکبار جنگ کا آغاز ہوا۔ تاریکی میں "ہا۔ ہٹپ۔ ہٹپ" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سونیا کراٹے کا پوز بنائے چپ چاپ ایک جگہ کھڑی ہوئی بُو سونگھ رہی تھی۔ وہ بُو کبھی دائیں کبھی بائیں، کبھی آگے اور کبھی پیچھے پہنچ رہی تھی۔ پھر وہ بُو بڑی برق رفتاری سے سونیا کے پیچھے آئی۔ اس کے ساتھ ہی کراٹے کا ہاتھ چل گیا۔ رومانہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دوہری ہو رہی تھی۔ اسی وقت سونیا نے اس کی کلائی تھام کر اپنے شانہ پر سے اسے اچھالا پھر ایک طرف پھینک دیا۔

رومانہ کنکروں اور پتھروں پر لڑھکتی ہوئی جا رہی تھی۔ شنکر نے بے اختیار چیخ کر کہا "ارے وہ اندھے کنوئیں میں گرنے جا رہی ہے۔"

——— باقی آئندہ

یونان کا مشہور ترین حکیم افلاطیموس بسترِ مرگ پر تھا اس کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور اس نے اپنی عمر کے ایک ایک لمحے کو علم کی تحصیل میں صرف کیا تھا۔ طب اس کا خاص میدان تھا اور اپنے استادوں کے عطا کئے ہوئے علم کو اس نے اپنے ذاتی تجربات سے اتنا آگے بڑھا دیا تھا کہ وہ دنیا کے ہر مرض کا علاج کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے علم اور مشاہدے کی دولت کو صرف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کی طبی اکادمی میں ہزاروں لائق شاگرد تھے جنہوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق افلاطیموس سے علم حاصل کیا تھا مگر ان میں جو مرتبہ فیلقوس کو حاصل تھا وہ اور کسی کو نہیں تھا۔

مرزا احید عباس

اور اس وقت یہی فیلقوس اپنے عظیم استاد حکیم افلاطیموس کو بے بسی کے ساتھ موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی تمام دنیا کے امراض کا علاج کر سکتا تھا لیکن موت کی دوا اسے بھی معلوم نہ تھی۔

افلاطیموس نے غش سے آنکھیں کھولیں۔ اپنے قریب فیلقوس کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر آئی۔ فیلقوس نے لجاجت سے عرض کی کہ وہ ایک اور خوراک معجون کی کھا کر دیکھ لے۔ شاید وہ کام کر جائے لیکن افلاطیموس نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا "نہیں اب کوئی دوا کام نہیں کرے گی۔ اب میں مرنے ہی والا ہوں۔"

فیلقوس نے سر جھکا لیا اور افسوس کے لہجے میں کہا "کاش موت کی بھی کوئی دوا ہوتی۔"

افلاطیموس کو اچانک کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا "فیلقوس! یہاں کوئی اور ہے تو نہیں؟" فیلقوس نے کہا "نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔" افلاطیموس نے ذرا گردن اونچی کی اور خود اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "دروازہ بند کر دو اور دھیان سے میری بات سنو۔"

فیلقوس نے دروازہ بند کر دیا اور کہا "فرمایئے۔ میرے عظیم استاد۔"

افلاطیموس نے کہنا شروع کیا "فیلقوس! پہلے قسم کھاؤ کہ تم اس راز کو کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں۔ کسی شاگرد کو بھی نہیں کیونکہ یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ میں بھی تمہیں اس وقت بتا رہا ہوں، جب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ میں تمہیں موت کی دوا کا راز بتا رہا ہوں۔

میرا تکیہ سر کے نیچے سے نکال لو۔ اسے پھاڑو۔ اس میں ایک موم جامے کی تھیلی ہے اور اس میں ہرن کی کھال پر ایک تحریر ہے۔ مجھے تو موت نے فرصت نہ دی لیکن یقین ہے کہ تم اس تحریر پر عمل کر کے موت کی دوا تیار کر لوگے۔"

فیلقوس نے پہلے قسم کھائی پھر تکیہ پھاڑ کر تحریر نکالی اسے پڑھا اور ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیا۔

اسی اثنا میں بوڑھا حکیم افلاطیموس موت و حیات کی کشمکش سے آزاد ہو چکا تھا۔

فیلقوس نے دروازہ کھول دیا اور روتا ہوا باہر نکل گیا۔

... کی رسوم سے فراغت پاتے ہی فیلقوس نے وہ تحریر نکالی۔

اس میں جڑی بوٹیوں اور دیگر مفردات کی ایک طویل فہرست تھی جب وہ تمام چیزیں حاصل ہو جائیں تو پھر انہیں کوٹنا پیسنا چھاننا کشید کرنا تھا اور اس کے بعد ایک بڑے مرتبان میں بند کر کے زمین میں دفن کرنا تھا۔ باقی ایک دوا دیات کے عرق اس زمین پر چالیس دن تک مخصوص وقفوں سے چھڑکتے رہنا تھا۔ چالیسویں دن سورج کے نکلتے ہی زمین کو پھٹنا تھا اور اس میں سے ایک عجیب سے پرندے کو نکلنا تھا۔ اس پرندے کو کہنا تھا "کس مرض کی دوا چاہیئے؟" حکیم کو اس سے پوچھنا تھا "موت کی دوا۔" پرندے کو موت کی دوا بتانی تھی اور اڑ جانا تھا۔

یہ کتنی عجیب بات تھی۔ بالکل ناقابلِ یقین۔ اگر اس کے استاد کے علاوہ جو پوری دنیا میں سب سے بڑا طبیب مانا جاتا تھا کسی اور نے وہ ترکیب بتائی ہوتی تو فیلقوس نے اسے ایک احمقانہ خیال سمجھ کر ٹھکرا دیا ہوتا۔ لیکن یہ ترکیب تو اس شخص نے بتائی تھی جو علم کا سمندر تھا اور وہ بھی ایسی احتیاط کے بعد بتائی تھی۔ فیلقوس کو عمل کرتے ہی بن پڑی۔

اس ترکیب میں جو مفردات لکھی تھیں۔ ان کا حصول بھی آسان نہ تھا کئی جڑی بوٹیاں ایسی تھیں جو اس ملک میں ہوتی ہی نہیں تھیں۔ ایک پودا ایسا تھا جو ہزاروں میل شمال میں پھیلے ہوئے برف کے میدانوں میں ہوتا تھا۔ اس میں بھی پھول سال میں صرف ایک بار کھلتا تھا۔ دوسرے پودے کی جڑ درکار تھی جو خشک ہو چکی ہو اور یہ پودا ایشیا کے گرم علاقوں میں ملتا تھا غرضیکہ بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کا حصول بے انتہا مشکل تھا لیکن فیلقوس کے پاس پیسے کی بھی کمی نہ تھی۔ اور وہ ابھی صرف پچاس سال کا تھا یعنی انتظار بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بہت سے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجے۔ ان کے سپرد یہی کام تھا کہ وہ ان جڑی بوٹیوں کو حاصل کریں۔ اس کام میں لاکھوں خرچ ہو گئے۔ لیکن بہرحال سب چیزیں فراہم ہو گئیں۔ سب سے قیمتی شے جو اس میں خرچ ہوئی وہ وقت تھا۔ فیلقوس کے دس سال اس مہم کے پہلے حصے پر عمل کرنے میں ختم ہو چکے تھے لیکن وہ خوش تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔ چند دن میں ہی ساری چیزوں کو مرتبان میں ڈال کر دفن کر دیا جائے گا اور پھر چالیسویں دن یہ پرندہ اسے موت کی دوا بتا دے گا۔

"میں اپنی سانس کا مکمل علاج کراؤں ۔"
ایک نوجوان نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کم وبیش مجھے کتنی رقم خرچ کرنا پڑے گی؟"
"ڈیڑھ ہزار روپے۔"
نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "گورکن کا کمیشن ڈیڑھ سو روپے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے بجائے اس کی خدمات کہیں زیادہ سستی اور پُر اثر اور کہیں زیادہ دیرپا ہیں۔"

مرتبان کو زمین میں دفن کرنے سے ایک دن پہلے فیلقوس نے سب کو جمع کرکے بتایا کہ وہ اپنے استاد کی وصیت کے مطابق ایک اہم ترین دوا کی تحقیق شروع کرنے والا ہے اور اس سلسلے میں وہ چالیس دن تک اپنی تجربہ گاہ سے نہیں نکلے گا۔ دوسرے دن اس نے مرتبان کو اپنی تجربہ گاہ کے ایک کونے میں دفن کردیا۔ اب وہ سارا دن وہیں رہتا تھا کیونکہ اسے مخصوص وقفوں سے مختلف عرق اس زمین پر چھڑکنے تھے۔ اس نے باقی ادویات کو بھی بذاتِ خود کوٹا پیسا اور چھانا تھا۔ اس لئے کہ وہ اتنی اہم چیز کی تیاری کے لئے دوسروں پر اعتماد نہیں کرسکتا تھا۔

دس پندرہ دن بعد یونان کا بادشاہ گلومارک شدید بیمار ہوگیا۔ فیلقوس کی عدم موجودگی میں پہلے تو دوسرے حکیموں نے بادشاہ کا علاج کیا۔ لیکن چند دنوں میں ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ بادشاہ کا مرض ان کے بس کا نہیں۔ چنانچہ شاہی قاصد دوڑایا گیا۔ فیلقوس نے تجربہ گاہ کی واحد کھڑکی سے بادشاہ کا فرمان سنا۔ اس نے قاصد سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے میں تمہیں نسخہ اور ہدایات لکھے دیتا ہوں۔ محل کے بڑے حکیم ارماطیس کو دے دینا۔ چند دن میں بادشاہ ٹھیک ہوجائے گا۔ میں ضرور چلتا لیکن میں ایک ایسے تجربے کے اختتامی مراحل میں ہوں جس کے لئے دس سال سے محنت کر رہا تھا۔ میں گیا تو سالوں کی وہ محنت ضائع ہوجائے گی اگر میں کامیاب ہوگیا تو یہ دوا بھی ظاہر ہے بادشاہ کے کام آئے گی۔

قاصد چلا گیا۔ فیلقوس کی تجویز کی ہوئی دوائیں بادشاہ کو استعمال کرائی گئیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اگلے بائیس تیئیس دنوں میں شاہی قاصد بار بار فیلقوس کے پاس آتا اور نیا نسخہ لے کے واپس جاتا لیکن کوئی دوا فائدہ مند ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بادشاہ کا اکلوتا لڑکا انطونی اپنے باپ کی روز بروز بڑھتی ہوئی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ اسے اپنے باپ کی زندگی فیلقوس کے تجربوں سے ہزار گنا قیمتی لگتی تھی چنانچہ آخر اس نے شاہی باڈی گارڈ کے سربراہ کو حکم دیا کہ وہ فیلقوس کو زبردستی لے آئے۔ اور فیلقوس آنے پر رضامند نہ ہو تو اس کا سر اڑا دیا جائے۔

تین پہر رات جا چکی تھی جب گھوڑوں کی ٹاپوں سے وہ میدان گونج اٹھا جس کے سرے پر فیلقوس کی تجربہ گاہ تھی۔ فیلقوس جاگ رہا تھا۔ آج اس کے تجربے کی آخری رات تھی۔ انتظار کی طویل ساعتیں گزر چکی تھیں۔ پو پھٹتے ہی اس کی زندگی بدلنے والی تھی۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس پرندے کو نکلنا تھا جو اسے موت کی دوا بتا سکتا تھا۔

شاہی باڈی گارڈ کے سپاہیوں نے فیلقوس کی تجربہ گاہ کا دروازہ توڑ دیا اور اس میں گھس کر فیلقوس کو گھیر لیا۔ ان سب نے تلواریں سونت رکھی تھیں لیکن فیلقوس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ باڈی گارڈ کے سربراہ نے کہا کہ آپ کو اسی وقت چلنا ہے اور اسی حالت میں۔ جہنم میں گیا تمہارا تجربہ۔ وہاں بادشاہ مر رہا ہے اور تم یہاں اطمینان سے بیٹھے ہو۔

فیلقوس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور اسے پوری بات سمجھا کر کہا کہ "تمہیں اب صرف یہ کرنا ہے کہ صبح ہونے تک جاگتے رہو۔ جیسے ہی وہ پرندہ نکلے اور کہے 'کس مرض کی دوا چاہیئے' تو تم کہنا 'موت کی دوا'۔ دیکھو یہ قلم رکھا ہے۔ یہ دوات ہے۔ یہ کاغذ ہے۔ جو وہ بتائے اسے لکھ لینا۔ باقی کام میں آکے خود قبول کرلوں گا۔" یہ کہہ کر فیلقوس ان سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔

فیلقوس بادشاہ کے کمرے میں پہنچا تو ہر شخص خاموش تھا اور خوف زدہ سا۔ گلومارک کا جسم اچھی طرح چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

شہزادے نے جیسے ہی فیلقوس کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ چلایا "بدمعاش! کتے! ذلیل! احمق بڈھے! تو نے آنے میں اتنی دیر کی۔ اس کا سر قلم کردیا جائے۔"

حکم کی دیر تھی۔ سپاہیوں نے فوراً ہی اس کا سر قلم کردیا۔

محل سے میلوں دور فیلقوس کی تجربہ گاہ میں اس کا بیٹا ژانتھیاس شدید بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہا تھا۔ شدید بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دانت میں سخت درد ہو رہا تھا۔ اس درد نے ساری رات اسے پریشان رکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ پکڑے تھا اور ہلکی ہلکی چیخیں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی تجربہ گاہ میں ایک کونے کی زمین پھٹی۔ ایک عجیب سا پرندہ نکلا اور کھڑکی میں جا بیٹھا۔ پرندے نے انسانی آواز میں کہا۔

"کس مرض کی دوا چاہیئے؟" ژانتھیاس دانت کے درد سے مرا جا رہا تھا۔ اسے اس وقت اور کس چیز کی دوا درکار ہوسکتی تھی۔ اس نے کہا "دانت کے درد کی دوا بتادے اس وقت تو۔ باقی پھر دیکھا جائے گا۔"

پرندے نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور کھڑکی سے باہر اڑ گیا۔ اڑنے سے پہلے اس نے ایک لفظ کہا۔ اور وہ تھا۔

"زنبور" دانت نکالنے کا پلاس۔

غریب الوطن مرشد

ضیا تسنیم بلگرامی

آپ کی روح کی تازگی کے لیے ہمارے عظیم اور مقدس بزرگوں کی پاکیزہ باتیں

ڈیرہ غازی خان کے ایک بزرگ اپنے دو بیٹے حافظ محمود اور حامد اور ایک بیٹی کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دورانِ سفر چند ایسے مواقع پیش آئے کہ دونوں بیٹے اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گئے۔ باپ اپنی بیٹی کے ساتھ جہاز پر سفر کرتا رہا اور دونوں بیٹے غلطی سے مسقط ہی میں اتر گئے۔ ان دونوں کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ راستے کی صعوبتوں اور دشواریوں پر مال و زر سے قابو پا لیتے۔ دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ حج کی سعادت پیادہ پا سفر ہی سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان میں حافظ محمود چھوٹا اور حامد بڑا تھا۔ دونوں کو خوش قسمتی سے حجاج کا ایک قافلہ مل گیا۔ یہ اس میں شامل ہوگئے۔ زادِ راہ نہ ہونے کے سبب یہ دونوں مسجدوں میں قیام کرتے تھے۔ ان دنوں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا بڑا زور تھا اور ان کے پیروکار اپنے عقائد اور ان کی اشاعت میں تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کی شدت کا یہ حال تھا کہ وہ نجدی عقائد کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ نجدیوں کو درود و سلام سے گریز اور یہ دونوں اس کے عاشق اور دلدادہ۔ آخر نجدیوں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو وہ سختی کرکے روک دیں گے۔

حافظ محمود نے نجدیوں کو جواب دیا۔ "بھائیو! ہمیں نہیں معلوم کہ تم درود و سلام سے ہمیں کیوں روکتے ہو، مگر یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ عشق و محبت میں ضبط و احتیاط کا کیا کام۔ رسولؐ کی محبت ہماری رگ و پے میں جاری ہے اور ہم جب حالت بے قراری میں درود و سلام پڑھتے ہیں تو گویا یہ اضطراری فعل ہوتا ہے۔ ہوش و حواس میں رسمِ دنیا تو نبھ سکتی ہے مگر عالمِ جوشِ جنون میں اس کا کیا ذکر؟"

نجدیوں نے ان دونوں پر تلواریں کھینچ لیں اور غصے میں کہا۔ "اے ہندی! ہم دیوانگی اور جنون کا علاج جانتے ہیں، اگر تم دونوں اس بدعت سے باز نہ آئے تو ہماری تلواریں تمہیں جبراً باز رکھیں گی۔"

دونوں بھائی بھی سینہ تان کر کھڑے ہوگئے۔ بولے۔ "اگر ہوش مند تلواریں کھینچ کر دیوانوں کو اپنی مرضی پر چلانے کی ضد کرسکتے ہیں تو دیوانے اپنے مسلک سے کب باز رہ سکتے ہیں۔ عشق میں جان کیا چیز ہے، ہم اس کو قربان کردیں گے۔ لیکن اپنے دلوں سے عشقِ رسولؐ کو نہیں نکال سکتے۔"

اسی عالم میں ایک طرف سے گھوڑوں کے سرپٹ بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نجدیوں کی توجہ اس طرف ہوگئی۔ ان کے سامنے گرد و غبار کا بگولا بڑھا چلا آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد بگولا پھٹ گیا اور اس میں سے علاقے کا شیخ اپنے شمشیر بکف ساتھیوں کو لئے ہوئے نمودار ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن کر رک گئے۔

شیخ نے نجدیوں سے پوچھا۔ "بھائیو کیا بات ہے؟"

ایک نجدی نے جواب دیا۔ "یہ دونوں ہندی بدعتی ہیں اور بلند آواز میں درود و سلام پڑھتے پھرتے ہیں۔"

شیخ نے ان دونوں سے پوچھا۔ "تم کیا کہتے ہو؟"

حافظ محمود نے جواب دیا۔ "شیخ میں نہیں جانتا کہ بدعت کسے کہتے ہیں۔ لیکن یہ درست ہے کہ ہم درود و سلام پڑھتے ہیں۔ ہم نے عشقِ رسول میں بڑی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے اپنے پاؤں کے چھالے دکھائے اور کہا۔ "جس عشق میں ہم نے اپنا یہ حال کرلیا ہے وہ ان نجدیوں کی تلواروں سے کیا ڈرے گا۔ ان سے کہو کہ یہ ہمیں ہلاک کردیں۔"

شیخ نے نجدیوں کو سمجھایا۔ "بھائیو! یہ ہندی ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں پر تلواریں کھینچ لینا کہاں کی مہربانی ہے۔ تم لوگ اپنی اپنی تلوار نیام میں ڈال لو کیونکہ اب میں ان کا ضامن بن چکا ہوں اب انہیں کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔"

نجدیوں میں سے ایک نے حیرت سے پوچھا۔ "شیخ! ان بدعتیوں کی تو کیوں ضمانت لیتا ہے؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ مجھ کو خواب میں رسول اللہؐ نے ان کی ضمانت لینے کا حکم دیا ہے۔"

نجدیوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے جبر اور زیادتی سے کام لیا تو شیخ اور اس کے ساتھی بھی اپنی اپنی تلواریں حرکت میں لے آئیں گے۔ انہوں نے دونوں بھائیوں کو نفرت سے دیکھا اور کہا۔ "افسوس کہ شیخ کی بروقت اور بے جا مداخلت تمہارے کام آگئی ورنہ ہم دیکھتے کہ تم کس طرح اپنے بدعتی مسلک پر قائم رہتے ہو۔"

حافظ محمود نے جواب دیا۔ "بھائیو! تم سب برادرِ دینی ہو مگر افسوس کہ تم نے ہماری محبت اور عشق کا خواہ مخواہ مذاق اڑایا۔ ہم دونوں نہتے تھے

تم لوگوں نے بزورِ شمشیر ہمیں عشق سے باز رکھنا چاہا، لیکن ہم بے خوف تمہارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ہم دونوں جان دے کر بھی اپنے جادۂ عشق سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن تم ظاہری دنیادار لوگ شیخ اور اس کے آدمیوں کی تلواروں سے خوف زدہ ہو گئے۔ اگر تم خود کو دینی عقائد اور مسلک میں حق پر سمجھتے ہو تو تمہیں شیخ کی تلواروں سے خوف نہیں کھانا چاہیئے۔"

ایک نجدی نے جواب دیا۔ "ہندی! اب زیادہ بڑبڑ نہ کر۔ خدا کا شکر ادا کر کہ تیری جان بچ گئی، اپنی راہ لے۔ زیادہ اترانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

شیخ نے بھی انہیں منع کیا۔ "ہندی نوجوان! اب زیادہ بات نہ بڑھا۔ جب تک جی چاہے یہاں رہ۔ تجھے یہ لوگ ہماری موجودگی میں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ تم دونوں بھائی میرے مہمان ہو۔"

دونوں بھائیوں نے شیخ کا شکریہ ادا کیا اور چند دن قیام کر کے وہ آگے روانہ ہو گئے۔

یہ دونوں منزل بہ منزل قیام کرتے ہوئے بالآخر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں حجاج کرام نے ایک شہر آباد کر رکھا تھا۔ اس شہر میں دو کا اضافہ ہو گیا۔ ان کے پاس کوئی ساز و سامان بھی نہ تھا۔ کسی نے انہیں اپنا خیمہ پیش کر دیا۔ یہ اس میں ٹھہر گئے۔ رات کو چاندنی میں مکہ معظمہ عظمت و جلال کا گہوارہ نظر آ رہا تھا۔ حافظ محمود کے دل پر اس کا کچھ زیادہ ہی اثر ہو رہا تھا۔ ان کا دل بھر آیا اور بلک بلک کر رونے لگے۔ اسی عالم میں ان کو اپنے باپ اور بہن کی یاد آئی اور دل کے سوتے پھر رسنے لگے۔ یہ حرم پاک میں جا کر نمازیں پڑھنے لگے۔ دورانِ نماز ان پر جذب کا عالم طاری ہو گیا، وہ یہ سب کچھ بھول گئے۔ اس نماز کی لذت اور کیف میں انہیں اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ عشا کے وضو سے فجر کی نماز بھی ادا کی۔ طلوع آفتاب پر اپنے خیمے میں پہنچے۔ وہاں جس شخص نے انہیں مہمان بنایا تھا، ان کا منتظر بیٹھا تھا۔ یہ شخص بھی ہندی تھا، پوچھا۔ "بھائی! کیا تم دونوں بھائی برصغیر کے ڈیرہ غازی خان سے آئے ہو؟"

حافظ محمود نے جواب دیا۔ "ہاں، ہم وہیں سے آئے ہیں۔"

اس نے مزید سوال کیا۔ "اور تم دونوں اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گئے تھے؟"

جواب دیا۔ "ہاں یہ بھی درست ہے۔"

میزبان نے کہا۔ "تمہیں ان دونوں کی تلاش بھی ہے؟"

جواب دیا۔ "ہاں یہ بھی درست ہے۔"

میزبان نے ملحقہ خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو اب تم دونوں خوش ہو جاؤ۔ وہ دونوں اس خیمے میں موجود ہیں اور بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

دونوں بھائی دیوانہ وار اس خیمے میں داخل ہوئے اور اپنے باپ سے لپٹ گئے۔ باپ کی آنکھیں بھی ساون بھادوں بن گئیں۔ بہن بھی... زار و قطار رو رہی تھی۔ باپ نے کہا۔ "تم دونوں کی جدائی نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ زندگی کا مزہ ہی جاتا رہا۔ کھانا پینا سونا جاگنا ہر شے بے مزہ اور بے لطف ہو گئی تھی۔"

بہن نے کہا۔ "بھائی میں تو اتنی مایوس ہو گئی تھی کہ شاید اب اس دنیا میں ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں نے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہی غلافِ کعبہ پکڑ لیا اور رو رو کر اپنے رب سے تمہاری ملاقات کی دعا کرتی رہی۔"

دونوں بھائی اپنے باپ اور بہن کے ساتھ آنسو بہاتے رہے۔

ان سب نے ایک ساتھ حج کیا۔ حافظ محمود کا دل ان سب سے زیادہ گداز تھا۔ وہ اپنے رب سے دنیا کے بجائے دین مانگ رہے تھے۔ خدا کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ رسول اللہ کے مزارِ پر حاضری دی۔ یہاں حافظ محمود کا حال قابو سے باہر تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئے لیکن اس بے ہوشی میں بھی وہ دنیا سے متنفر اور دین کے متمنی تھے۔ عشقِ رسولؐ میں سب کچھ بھلا دیا تھا۔ انہیں اکثر یوں لگا گویا جذبوں کی شورش سے ان کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ جتنے دن بھی مدینہ منورہ میں رہے۔ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ وہ مدینے کے چپے چپے میں بوئے رسولؐ محسوس کرتے رہے۔ ان کا چلنے پھرنے کے دوران فرطِ احترام میں برا حال رہتا۔ جو قدم بھی اٹھتا اس احتیاط اور خوف کے ساتھ کہ کہیں وہ ایسی جگہ نہ ہو جہاں رسول اللہ کے قدمِ مبارک پڑ چکے ہوں اور ان کے ناپاک قدم سے اس کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا کہ باپ نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ باپ کو اپنا وطن یاد آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور دونوں بیٹوں کے ساتھ جدہ سے سفرِ واپسی شروع کیا اور بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ حافظ محمود کا دل دیارِ یار سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں تھا لیکن باپ کی خواہش نے انہیں مجبور کر دیا۔

یہ لوگ بمبئی میں اتر گئے۔ سمندری ہواؤں نے بہن اور باپ پر برا اثر کیا اور یہ دونوں جب بمبئی کے ساحل پر اترے تو ان کے جسم متورم تھے اور بخار کی حدت میں دونوں پھنک رہے تھے۔ یہاں ان دونوں کا علاج ہوتا رہا مگر ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے اور یکے بعد دیگرے دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب ان دونوں بھائیوں کا مارے صدمے کے برا حال ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ دونوں اتنے سادہ لوح اور بھولے تھے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بمبئی سے اپنے وطن کس طرح پہنچیں۔ باپ نے مال و زر اتنا چھوڑا تھا کہ سال دو سال بے فکری میں گزار سکتے تھے۔ سرزمینِ عرب سے جو حجاج بمبئی تک ان کے ہم سفر رہے تھے، ان میں ایک شخص... بہت تیز و طرار تھا اور اس کی نظریں حافظ محمود کے ورثے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس عیار نے دونوں بھائیوں کی سادہ لوحی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "بھائیو! مجھے بڑا دکھ ہے کہ غریب الوطنی میں تمہیں اپنی بہن اور باپ کا غم سہنا پڑا۔"

حافظ محمود نے جواب دیا۔ "خدا کی مرضی میں ہمارا کیا دخل۔ مشیتِ ایزدی یہی تھی، ہم اس پر شاکر ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "میں تم دونوں کو کچھ زیادہ ہی پریشان محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تم دونوں مجھے اپنا ہمراز بنانا پسند کرو گے؟"

حافظ محمود نے کہا۔ "اگر میں تمہیں اپنا ہمراز بنا بھی لوں تو اس سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "مجھے اپنا ہمراز بنا کے تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکو گے۔"

حافظ محمود نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "اے شخص! میں تجھ پر اعتبار کرنے کو تیار ہوں لیکن اس شرط پر کہ میں تجھ سے بھی یہ وعدہ لوں گا کہ تو ہم سے دغا نہیں کرے گا۔"

اس شخص نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور جواب میں کہا۔ "میں ہر وعدے کے لئے تیار ہوں۔ جب اور جہاں کہو گے۔ میں عہد و پیماں کے لیے تیار ہوں۔ میں تیری صاف گوئی سے بہت خوش ہوا۔"

حافظ محمود اور ان کے بھائی حامد نے اس شخص پر اعتبار کر لیا۔ اب وہ ان دونوں کے آس پاس منڈلانے لگا۔ یہ لوگ اس قافلے میں شامل ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ وہ شخص ہانپتا کانپتا حافظ محمود کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ "حضرت! غضب ہو گیا۔"

حافظ محمود نے پوچھا "کیا غضب ہو گیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "آگے قزاق ہماری راہ روکے کھڑے ہیں آپ کے پاس کچھ ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں ہے۔ کیوں نہیں؟ قزاقوں سے بچنے کی کوئی ترکیب؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، بس ایک ہی ترکیب ہے۔ کچھ مال و زر میرے پاس بھی ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک، دونوں کے مال و زر کو لے کر قافلے کے پیچھے رہ جائے اور جب قزاق اپنا کام کر کے فرار ہو جائیں تو پیچھے رکا ہوا شخص تباہ حال قافلے میں شامل ہو جائے۔ اس طرح یہ مال و زر قزاقوں کی دسترس سے دور اور محفوظ رہے گا۔"

حافظ محمود کو یہ ترکیب پسند آئی۔ فرمایا۔ "میں تیری تجویز سے متفق ہوں۔ لیکن میں دونوں کے مال و زر لے کر قافلے کے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ یہ کام کوئی ہوشیار اور دلیر شخص ہی اچھی طرح انجام دے سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ شخص تو خود ہی ہے۔ کوئی اور تجھ سے بہتر یہ کام نہیں کر سکتا۔"

اس شخص نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "حضرت! ذمہ داری تو بہت بڑی ہے، مگر آپ فرماتے ہیں تو میں انکار بھی نہیں کر سکتا... آپ کی بات میں ٹال بھی نہیں سکتا۔"

حافظ محمود نے اپنا مال و زر اس شخص کے حوالے کر دیا اور خود ہاتھ جھاڑ کر قافلے کے ساتھ ہو لیے۔ اس شخص کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ نکلی۔ راستے میں قزاقوں نے قافلے کو لوٹ لیا۔ سب کچھ چھین چھان کر اپنی راہ لی۔ لٹا پٹا قافلہ اپنی منزل پر پہنچا تو یہیں پر وہ شخص بھی آن ملا۔ اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ "ابھی ایک اور خطرہ باقی ہے۔ میں آگے جا رہا ہوں، وہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

یہ قافلہ اور آگے بڑھ گیا۔ اس شخص نے ایک بار پھر کہا۔ "حضرت! آپ کا مال و زر میرے پاس امانت ہے۔ آپ اس کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ میرے پاس آپ کا جو کچھ ہے، وہ ہر حال میں آپ ہی کا رہے گا اور میں اس کا امین کہلواؤں گا۔"

آپ نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ وہ شخص آپ کو ورغلاتا بہلاتا جالندھر تک پہنچ گیا۔ لیکن اب اس میں غیر معمولی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ حافظ محمود سے ہیر پھیر کی باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی بے رخی سے پوچھا۔ "جناب والا! اب آپ فرمائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

حافظ محمود نے جواب دیا ——— "میرا مال و زر جو آپ کے پاس ہے، میرے حوالے کر دیں۔"

وہ شخص ہنسنے لگا۔ بولا۔ "کیا آپ نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے، جناب آپ ابھی اس شخص یعنی مجھ سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہیں ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "میں نے ایسی کون سی بات کی ہے جس سے تجھ کو ایسی باتیں کرنا پڑ رہی ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے اپنا مال و زر طلب کر رہے ہو۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر کیا مطلب ہے، نہ مانگوں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "پھر مطلب یہ کہ میرے پاس آپ کا کچھ بھی نہیں۔ آپ کس مال و زر کا مطالبہ کر رہے ہیں؟"

حافظ محمود نے کہا۔ "اس مال و زر کا جو میرا ہے اور میں نے بطورِ امانت تیرے حوالے کیا تھا۔"

اس نے نظریں پھیر کر بے مروتی سے جواب دیا۔ "آپ کا مال و زر بھی قزاق چھین لے گئے۔ جب پورا قافلہ لٹ گیا تو آپ کا مال کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا۔"

حافظ محمود نے حیرت سے اس بد دیانت کو دیکھا۔ "کیا تو ازروئے ایمان کہہ رہا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بالکل ازروئے ایمان، میرے پاس آپ کا کچھ بھی نہیں۔"

حافظ محمود نے بے بسی سے کہا۔ "اگر تو یہ سب ایمان کے حوالے سے کہہ رہا ہے، ایمان کے واسطے سے یقین دلا رہا ہے تو میں بھی صبر کئے لے رہا ہوں اور آئندہ اس سلسلے میں تجھ سے کوئی بات نہ ہو گی۔"

اس شخص نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اگر آپ مطالبہ بھی کریں، تو دے گا کون۔ جب میرے پاس آپ کا ہے ہی کچھ نہیں تو کیسا مطالبہ اور کہاں کا لینا دینا۔"

حافظ محمود نے صبر کر لیا اور اس شخص نے ان سے کنارہ کشی

اختیار کرلی۔ یہ جس جگہ رہتے تھے وہاں ہوشیار پور کے ایک بزرگ مولوی محمد شریف آئے ہوئے تھے۔ ان کا جالندھر میں بڑا اثر تھا اور یہ شہریوں میں بہت مقبول تھے۔ انہوں نے حافظ محمود کو بڑی محبت کی نظروں سے دیکھا اور انہیں اپنی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے اور رہنے کی اجازت دے دی۔

ایک دن مولوی محمد شریف نے پوچھا۔ "صاحبزادے تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

حافظ محمود نے اپنی پوری بپتا سنائی۔ مولوی محمد شریف نے کہا۔ "صاحبزادے! تم کسی کے مُرید بھی ہو یا نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ابھی تک تو نہیں، ہاں میں اپنے والد کے پیرو مرشد کی تلاش میں ہوں تاکہ ان کی مریدی اختیار کروں۔"

مولوی شریف نے فرمایا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں اللہ کا نام سکھاؤں گا۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ میری مریدی اختیار کرلو۔ اللہ نے یہاں میرے ہی پاس تمہیں بھیجا ہے۔ اس لئے اب کسی اور در کا خیال لانا بھی درست نہیں۔"

حافظ محمود نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور مولوی شریف کی مریدی اختیار کرلی۔

لیکن کچھ ہی عرصہ میں انہیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ جالندھر کے پیرزادے مولوی شریف سے خوش نہیں ہیں۔ وہ ان کی تلقین اور تعلیم سے ناخوش رہنے لگے۔ ایک دن ان پیرزادوں نے آپ کا محاصرہ کرلیا۔ مولوی محمد شریف نے پوچھا۔ "تم لوگ ہمارا محاصرہ کیوں کر رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟"

ایک نے جواب دیا۔ "جناب والا! ہم آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ جالندھر میں کیا لینے آئے ہیں؟"

مولوی شریف نے فرمایا۔ "میں تم لوگوں کو اللہ کا نام سکھاؤں گا۔"

ایک پیرزادے نے مذاق میں کہا۔ "واہ جناب! آپ نے تو کمال کر دیا ہم سب سیّدزادے ہیں اور پیری اور مرشدی ہمیں اپنے خاندان سے ملی ہے کسی اور کا اس سے کیا تعلق؟"

مولوی محمد شریف نے انکساری سے فرمایا۔ "بھائیو! میں نے یہ کب کہا کہ میں تمہیں مرید کرنے آیا ہوں میں تو تمہیں اللہ کا نام بتاؤں گا اس لئے میری باتوں کا بُرا ماننا بے کار ہے۔"

سیّدزادوں نے انہیں دھمکی دی۔ "مولوی صاحب! آپ اپنا پیری مریدی کا چکر یہاں جالندھر میں نہ چلائیں کیونکہ یہاں ہم سب کی موجودگی میں آپ کا یہ کاروبار نہیں چلے گا۔"

مولوی شریف نے برا سا منہ بنایا۔۔۔ "سیّدزادگان! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں یہاں پر ہرگز اس لئے نہیں آیا کہ یہاں کے لوگوں کو اپنا مرید کروں۔ بلکہ میں یہاں والوں کو اللہ کا نام سکھا کر واپس چلا جاؤں گا۔"

سیّدزادوں نے غصے میں کہا۔ "اللہ کا نام ہمیں اچھی طرح آتا ہے اور اس بارے میں ہم کسی کے محتاج نہیں۔ اس لئے آئندہ آپ یہ بات بھی نہیں کہیں گے۔"

مولوی شریف نے بے نیازی سے کہا۔ "بھائیو! تمہارا یہ زعم اچھا نہیں۔ اگر تمہیں اللہ کا نام آتا ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔۔۔ یہاں حافظ محمود نامی ایک حاجی بھی تو ہے میں اسی کو اللہ کا نام سکھاؤں گا۔ جو جس کی قسمت میں ہوتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ آج سے حافظ محمود ہمارا جانشین ہوا۔ وہ مجھ سے اللہ کا نام سیکھے گا اور اس سے دوسرے ہزاروں۔۔۔ سیکھیں گے۔"

مولوی شریف ایک باکمال بزرگ تھے۔ انہوں نے حافظ محمود کی بابت جو کچھ فرمایا تھا اس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہونے لگا۔ حافظ محمود میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ اس کے بعد مولوی شریف نے کنارہ کشی اختیار کرلی اور حافظ محمود کو جالندھر میں چھوڑ دیا۔ جن سیّدزادوں نے مولوی شریف سے حافظ محمود کے بارے میں کلماتِ خیر سنے تھے، اب وہ حافظ محمود کے قریب رہنے لگے کہ وہ بھی مولوی شریف کے جھوٹ سچ کا مشاہدہ کرسکیں۔ جب یہ سیّدزادے حافظ محمود کے رُوبرو بیٹھتے تو انہیں اپنے اندر ہیجانی اور اضطراری کیفیت محسوس ہوتی رہتی۔ حافظ محمود بظاہر ان پر کوئی توجہ نہ دیتے مگر معلوم نہیں کیوں، پیرزادے اپنی نظر میں خود ہی ذلیل و خوار ہو رہے تھے۔

جالندھر والوں کو معلوم نہیں کیوں حافظ محمود سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مگر جالندھر کے گرد و نواح اور دور دور سے طالبانِ حق ان کی صحبت میں کھنچے چلے جاتے تھے۔ جالندھر کے مولوی اور پیرزادے حافظ محمود سے جلتے تھے اور حسد سے ان کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے تھے۔

دوسرے شہروں کے لوگ حیرت سے کہتے۔ "پیرو مرشد! یہ جالندھر والوں کو کیا ہوگیا ہے جو آپ کی صحبت سے نفور اور گریزاں رہتے ہیں؟"

آپ جواب دیتے۔ "افسوس کہ شہر جالندھر میں جو شمع روشن ہے اس سے مشعلیں جل جل کر باہر چلی جاتی ہیں اور بیرونِ جالندھر روشنیاں پھیلتی جا رہی ہیں لیکن جالندھر کے اندر تاریکی کا غلبہ ہے۔"

آپ کی یہ بات چیت جب جالندھر والوں کے کانوں میں پہنچتی تو بہت جز بز ہوتے۔

ایک دن جالندھر کے مشہور بزرگ مولوی شمس الدین نے حافظ محمود کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے شکایتاً عرض کیا۔ "قبلہ حاجی صاحب! میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اگر دورانِ گفتگو میری باتیں ناگوار گزریں تو انہیں درگزر کر دیں گے۔"

حافظ محمود نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی فقیرانہ شان سے جواب دیا۔ "مولوی شمس الدین! میں یہاں اللہ کے حکم سے بیٹھا ہوا ہوں۔ اس لیے تم مجھ سے جو باتیں بھی کرنا اس میں رعونت اور شان نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ کو عجز و انکسار پسند ہے، تو بھی اللہ کی پسند کا خیال رکھے گا۔"

مولوی شمس الدین کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بڑے تحمل سے کام لیا، کہا۔ "حافظ محمود: آپ نے جو بات کہی ہے قابلِ غور ہے۔ لیکن آپ کو یہ حق کس نے دے

دیا کہ باہر والوں کے سامنے ہماری بے عزتی کرتے رہیں۔ کم از کم میں اس صورتحال کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔"

حافظ محمود نے جواب دیا۔ "مولوی شمس الدین! آپ سے باہر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جالندھر والوں کی کبھی بھی بے عزتی نہیں کی۔ یقیناً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

مولوی شمس الدین نے کہا۔ "کیا تم نے یہ بات نہیں کہی کہ جالندھر کے باہر والوں کی قسمت میں روشنیاں ہیں مگر اہلِ جالندھر اس سے محروم ہیں اور ان کی قسمت میں تاریکیاں لکھ دی گئی ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "کیا میری بات جھوٹ پر مبنی ہے؟ شاید نہیں۔"

مولوی شمس الدین نے کہا۔ "حضرت پیرو مرشد! آپ احتیاط سے کام لیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے جالندھر کے لوگ اپنی اہانت محسوس کریں۔"

چند دنوں بعد مولوی شمس الدین نے ایک بار پھر حافظ محمود کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے سامنے وہ ساری داستان رکھ دی جس سے ان کو بھی تکلیف پہنچ گئی تھی۔ کہا۔ "پیرو مرشد! لوگ ایک بار پھر آپ کے خلاف باتیں بناتے پھر رہے ہیں۔ خدا کے لیے احتیاط اور خاموشی کو کام میں لایئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تو وہ باتیں میرے علم میں لا جن سے تجھے یہ شکایت پیدا ہوگئی۔"

مولوی شمس الدین نے کہا۔ "بستی میں سیّدزادے اور مولوی زادے سبھی موجود ہیں مگر میں نے آج تک ان کی دل آزاری نہیں کی۔ میں بذاتِ خود ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں۔ آپ اس سے باز نہیں آتے آج میں اس کا کوئی نہ کوئی علاج کر کے رہوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تیرے دعوے پر لبیک کہتا ہوں اور تجھ کو قسم دلاتا ہوں کہ تو میرے خلاف جو بھی کرنا چاہے کر ڈال ورنہ یہ موقع نکل جائے گا اور تو پچھتائے گا۔"

مولوی شمس الدین نے کہا۔ "تو گویا آپ مجھے اجازت دے رہے ہیں کہ میں آپ کو آپ کے کیے کی سزا دوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں تجھے اجازت دے رہا ہوں کہ تو مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دے۔"

مولوی شمس الدین نے کہا۔ "تب پھر میرا فیصلہ سن لیجئے۔ میں نے آپ کا معاشرتی مقاطعہ کردیا۔ آج سے آپ کا حقہ پانی بند، جالندھر کے لوگ آپ کے ساتھ نہ کھائیں پئیں گے نہ آپ سے معاشرتی واسطہ رکھیں گے۔ آج میں اس فیصلے کا اعلان کرائے دیتا ہوں، جالندھر کے پیرزادے، مولویوں کے خاندان والے، جولاہے اور دوسرے لوگ آپ سے کسی بھی قسم کا واسطہ یا رابطہ نہیں رکھیں گے۔"

آپ نے مولوی شمس الدین کے اس اعلان کو صبر و تحمل سے سن کر فرمایا۔ "تو گویا تو نے میرا حقہ پانی بند کرا دیا۔ حقہ تو میں خود ہی نہیں پیتا، رہا پانی تو پانی انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لیے تو میرا پانی

کس طرح بند کرسکتا ہے ؟"

مولوی شمس الدین نے کہا "بہرحال میں نے اپنی طرف سے تو آپ کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا ۔"

آپ نے سکوت اختیار کیا ۔ بستی میں مولوی شمس الدین کے فیصلے کا شہرہ ہوگیا اور آپ کے مخالفین اور حاسدین نے مولوی شمس الدین کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

ان دنوں خاص جالندھر میں سکھوں کی ایک پلٹن مقیم تھی ۔ اس کا کماندار سید امیر شاہ نامی ایک شخص تھا اور اس پلٹن میں قادر بخش جہاں خیلی نامی ایک دلیر شخص بھی شامل تھا ۔ کماندار سید امیر شاہ اور قادر بخش جہاں خیلی آپ کے مرید اور جاں نثار تھے ۔ انہیں جو شمس الدین کے فیصلے کا علم ہوا تو بھاگے بھاگے آپ کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے دریافت کیا "حضرت جالندھر والوں میں مولوی شمس الدین کے کسی تکلیف دہ فیصلے کا بڑا شہرہ ہے ۔ کیا آپ اس کی تصدیق فرمائیں گے ؟"

آپ نے جواب دیا "جیسا کہ میں مولوی شمس الدین سے بھی کہہ چکا ہوں کہ حقہ میں خود ہی نہیں پیتا ۔ رہی پانی کی بات تو میں پھر کہوں گا کہ پانی خدا کی طرف سے ہے ۔ کسی انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس کو بند کر دے ۔ کیا شمس الدین کے معاشرتی مقاطعے کے بعد میں پانی سے محروم ہوگیا ہوں! نہیں ، ہرگز نہیں ۔"

کماندار نے عرض کیا "پھر میں بھی آپ سے اجازت لینے آیا ہوں ۔ میں مولوی شمس الدین اور اس کے ہم نواؤں کو سزا دینا چاہتا ہوں ۔ میں اپنی پلٹن سے ان کا تہ و بالا کرسکتا ہوں ، انہیں تباہ و برباد کرسکتا ہوں ۔ میرے سپاہی میرے ذرا سے اشارے پر آپ کے دشمنوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں ۔"

اس وقت باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں ۔ لوگوں کا ہجوم چیخ رہا تھا "ہمیں شیخ کا دیدار چاہیئے ، خدا کے لیے ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے آئیں ۔"

آپ نے اپنے مریدوں سے کہا "ذرا باہر جا کر دیکھنا تو ، یہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں ؟"

پلٹن کا کماندار باہر گیا اور کچھ دیر بعد مسکراتا ہوا داخل ہوا ۔ بولا "حضرت یہ وہ لوگ ہیں جو جالندھر کے اندر ہی آباد ہیں اور نسلاً پٹھان ہیں ۔ یہ سارے ہی آپ کے معتقد اور پرستار ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بارہ ہزار ہیں اور جالندھر کی تباہی اور بربادی کی اجازت چاہتے ہیں ۔"

آپ نے جواب دیا "کیا میں اس کی اجازت دے سکتا ہوں ؟"

کماندار نے کہا "میں نہیں جانتا کہ آپ اس کی اجازت دے سکتے ہیں یا نہیں ، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ اس کی اجازت ضرور دے دیجیئے ۔"

آپ نے فرمایا "کماندار سید امیر شاہ ! تم باہر جاؤ اور پٹھانوں کے کسی بڑے آدمی کو میرے پاس لے آؤ ۔"

سید امیر شاہ نے حکم کی تعمیل کی اور ذرا سی دیر میں پٹھانوں کے تین آدمیوں کے ساتھ دوبارہ اندر داخل ہوا ۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی نہایت ادب سے سلام کیا اور گزارش کی "حضور والا ! سننے میں آیا ہے کہ بستی کے لوگ آپ کے خلاف ظلم اور زیادتی پر کمربستہ ہوگئے ہیں ۔ آپ ہمیں حکم دیجیئے ، ہم اس بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے ۔"

آپ نے جواب دیا "میں ایسا کوئی حکم نہیں دے سکتا ، جس سے خدا کی مخلوق پریشان ہو ، آج وہ گمراہ ہیں کل وہ راہِ راست پر آسکتے ہیں ۔ پھر میں انہیں کیوں کسی مصیبت میں ڈالوں ۔"

پٹھانوں نے کہا "یا حضرت ! آپ بلا وجہ نرمی سے کام لے رہے ہیں ۔ جب کہ دوسری طرف لوگ تشدد اور شرارتوں پر آمادہ نظر آتے ہیں ۔"

انہوں نے جواب دیا "یہ اپنے اپنے ظرف اور حوصلے کی بات ہے ۔"

پٹھانوں نے کہا "اگر آپ لڑنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں تو یہ اجازت ضرور دیجیئے کہ ہم اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ آپ کے قریب ہی رہ جائیں تاکہ اگر بستی کے لوگ کوئی بڑی شرارت کریں تو اس کا اسی وقت جواب دے دیا جائے ۔"

سید امیر شاہ نے عرض کیا "میں آپ کے پاس اپنے چند سپاہی تعینات کیے دیتا ہوں ۔ وہ آپ کی حفاظت کریں گے اور آپ کے حاسدوں اور دشمنوں کو آپ کے پاس نہیں آنے دیں گے ۔"

آپ نے جواب دیا "ہاں ، ایسا تم لوگ کر سکتے ہو ۔"

یہ ساری باتیں جالندھر کے صوبے دار کریم بخش تک پہنچ گئیں ۔ وہ بھی آپ کا بڑا پرستار و مداح تھا ۔ بھاگا بھاگا آپ کے پاس پہنچا اور ادب سے عرض کیا "حضرت کیا یہ درست ہے کہ آپ کے پرستار اور عقیدت مند جالندھر والوں پر لشکر کشی کرنے والے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ۔ کیا تو اس بات پر یقین کرسکتا ہے کہ میں امن و آشتی کے بجائے خون خرابے کا حکم دوں گا ۔ میں انسانوں کا خون بہا سکتا ہوں ؟"

کریم بخش صوبے دار نے عرض کیا "میں نے اس پر یقین تو نہیں کیا ، پھر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا ہوں کہ میرے لیے کوئی حکم فرمائیں میں آپ کا تابعدار بلکہ جاں نثار ہوں ۔"

آپ نے جواب دیا "میری تابعداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ اس طرح کرو کہ میری طرف سے بستی والوں کو یہ یقین دلا دو کہ میں ان کے خلاف کسی قسم کی بھی کارروائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۔ وہ مطمئن رہیں ۔"

کریم بخش نے آپ کے اس حکم کی فوراً ہی تعمیل کردی ۔ مولوی شمس الدین کے آدمیوں نے آپ کے آس پاس جمع ہو کر شور و غل کرنا شروع کردیا ۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "او پٹھانوں کے پیر ! تو یہاں سے چلا جا ورنہ ہم تیرے خلاف معاشرتی مقاطعہ کے علاوہ بھی بہت کچھ کر گزریں گے ۔"

سید امیر شاہ اور آپ کی صحبت میں موجود چند پٹھانوں نے باہر نکل کر مولوی شمس الدین کے آدمیوں سے پوچھا "آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو ؟"

ان لوگوں نے جواب دیا "ہم چاہتے ہیں کہ یہ پیر یہاں سے چلا جائے ۔"

سید امیر شاہ نے پوچھا "لیکن یہ یہاں سے کیوں چلے جائیں ؟"

مخالفین نے جواب دیا "اس لیے چلے جائیں کہ ایسا ہم سب چاہتے ہیں ..."

سید امیر شاہ نے پوچھا "اگر تمہاری یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو تم کیا کرو گے ؟"

مخالفین نے جواب دیا "پھر ہم اس نام نہاد پیر پر زندگی وبال کر دیں گے ، جینا حرام کر دیں گے ۔"

سید امیر شاہ کو غصہ آگیا ۔ پوچھا "کیا تم لوگ مجھ سے واقف ہو ؟"

ایک نے جواب دیا "ہاں خوب واقف ہیں ۔ تو بھی اس نام نہاد پیر کا کوئی خوشامدی ہوگا ۔"

سید امیر شاہ نے کہا "میں پیر و مرشد حافظ محمود کا خوشامدی نہیں پرستار ہوں اور یہاں کی سکھ رجمنٹ کا کماندار ہوں ، میں تمہاری بستی کو تہ و بالا کر سکتا ہوں ۔"

اب تو بستی والوں کے کان کھڑے ہوگئے اور ان کی بولتی بند ہوگئی ۔ انہوں نے صلاح و مشورہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الحال کھل کر اس پیر سے الجھنا خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ وہ لوگ واپس چلے گئے ۔ اور مولوی شمس الدین کے ایذا پرستانے کے دوسرے طریقے سوچنے لگے ۔ جالندھر کے حاکم کریم بخش نے آپ کی حفاظت کے لئے دس سپاہی بھیج دیے ۔

رات کو عشاء کے بعد حافظ محمود درود و وظائف میں مشغول ہو جاتے ۔ رات کے سناٹے میں آپ کو بڑا سکون اور اطمینان رہتا ۔ جالندھر کے چند فسادیوں نے آپ کے حجرے کے پاس لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا ۔ پہلے تو وہ آپس میں بحث و مباحثہ کرتے پھر تکرار اور تو تو میں میں تک نوبت پہنچی ۔ اس کے بعد گالی گلوچ اور ہاتھا پائی شروع ہوگئی ۔ اس ہنگامے نے آپ کے سکون کو برباد کر دیا ۔ آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا "ارے بھائی ! یہ کیا کر رہے ہیں ، ان سے کہہ دو کہ فقیر کی کٹیا کا سکون برباد ہو رہا ہے ۔ کیا یہ معاملات گھروں میں طے نہیں کر سکتے ۔"

مرید نے باہر نکل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مرید پر گرم ہوگئے ۔ ایک نے کہا "جا اپنے پیر سے کہہ دے کہ یہ اس کے باپ کی جگہ نہیں ہے ۔ ہم تو اسی طرح لڑیں گے ، جھگڑیں گے ۔ اگر اس میں ہمت ہو تو ہمیں اس سے روک دے ۔"

مرید نے ایک بار پھر سمجھایا "بابا درویش سے مت الجھو کیوں کہ یہ الجھنا سخت نقصان کا باعث بن جائے گا ۔"

جواب ملا "ہم درویش سے کب الجھ رہے ہیں بلکہ تو ہم سے بلاوجہ الجھ رہا ہے ۔"

اتنے میں جالندھر کے حاکم کریم بخش کے متعینہ سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور پوچھا "کیا بات ہے ؟ یہ تم لوگ کس بات پر لڑ جھگڑ رہے ہو ؟"

لڑنے والوں میں سے ایک نے جواب دیا "ابے تم لوگ بھی آگئے بات بڑھانے ؟"

ایک سپاہی نے کہا "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ درویش کے دروازے پر تم کیوں لڑ جھگڑ رہے ہو ؟"

جواب دیا "یہ کسی کی خریدی ہوئی زمین نہیں ہے ۔ ہم لڑ رہے ہیں تو تمہیں کیا ۔ اپنا راستہ لو اور ہمارا دماغ خراب نہ کرو ورنہ بات بڑھ جائے گی ۔"

سپاہی نے آگے بڑھ کر اس شخص کا گریبان پکڑ لیا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلا لیا ۔ بولا "کھڑے دیکھتے کیا ہو ۔ لگاؤ ان کے جوتے ۔"

سپاہیوں نے لڑنے جھگڑنے والوں کو پکڑ لیا اور ان کی مرمت شروع کر دی ۔ ان کے لباس تار تار ہوگئے اور چہرے لہو لہان ہوگئے ۔ سپاہیوں نے انہیں بالوں سے پکڑ لیا اور گرا گرا کر مار لگائی ۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے ۔ ان کی چیخ پکار سن کر حافظ محمود باہر نکلے اور پوچھا "بھائی یہ کیا ہو رہا ہے ؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا "پیر و مرشد ! ان لوگوں نے آپ کے سکون کو تباہ و برباد کرنے کے لئے آپس میں دنگا فساد شروع کر دیا تھا ۔ اب ہم ان کے شر کو شر سے مارنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔"

آپ نے انہیں روک دیا "انہیں نہ ماریں میں ان کے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں ۔"

سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے ۔ ایک سپاہی نے کہا "بابا ، آپ ان کی سفارش نہ کریں ۔ یہ شرّی لوگ ہیں آپ کی نرمی اور خلوص کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا ۔"

آپ نے فرمایا "پھر بھی انہیں معاف کر دو ۔ میں انہیں پٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ۔"

سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے اور ایک نے ان سے کہا "پیر و مرشد کے طفیل تم چھوڑے جا رہے ہو ، بھاگ جاؤ ، خبردار جو کبھی ادھر کا رخ کیا ۔"

وہ لوگ فوراً ہی بھاگ گئے ۔ آپ نے سپاہیوں کو نصیحت کی "اللہ کے بندوں کو حلم و مروت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا ، سختی

ان میں ضد پیدا کر دے گی۔"

ایک سپاہی نے کہا: "بابا! آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ آپ نے انہی کو معاف کر دیا جو آپ کو ستانے کے نت ۔ ۔ ۔ ۔ نئے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"

اس تشدد آمیز واقعے نے جالندھر والوں کو خوف زدہ کر دیا اور ان کی ضد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں پہنچا اور درخواست کی کہ ہم آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے پوچھا: "کس قسم کی باتیں، کس موضوع پر؟"

وفد کے سربراہ نے کہا: "بابا! بات یہ ہے کہ بستی کے لوگ آپ سے خوش نہیں ہیں۔ اس لیے شر کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اب جو آپ کے آدمیوں نے انہیں مارا پیٹا تو ان کی نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ پہلے تو یہاں کے لوگ چھیڑ چھاڑ ہی پر اکتفا کر لیتے تھے لیکن تشدد آمیز حرکت نے انہیں جدال و قتال تک پر آمادہ کر دیا ہے۔ ہم معزز لوگ اپنے طور پر یہ چاہتے ہیں کہ یہ تنازعہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔"

آپ نے فرمایا: "کیسا تنازعہ؟ ہمارا تو کسی سے کوئی تنازعہ نہیں۔"

وفد کے بڑے نے کہا: "آپ کے ذہن میں کوئی تنازعہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن شہریوں کے ذہن میں اس قسم کی باتیں ضرور ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ یک طرفہ تنازعہ بھی عجیب سی بات ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

وفد کے نمائندے نے کہا: "بستی کے لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تم لوگ اسی میں خوش ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو میں تمہاری یہ بات بھی مان لوں گا لیکن اس بات کی کیا ضمانت کہ اس کے بعد تمہارے دلوں کی کدورت دور ہو جائے گی اور تم لوگ مجھے نہیں ستاؤ گے۔"

وفد کے نمائندے نے کہا: "یہ ہمارا وعدہ ہے کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہیں ہو گی جس سے آپ کو دکھ پہنچے۔"

متعینہ سپاہیوں میں سے ایک نے مداخلت کی۔ بولا "حضرت، یہ آپ کن کی باتوں پر اعتبار کر رہے ہیں؟ یہ دھوکے باز منافق لوگ اپنی فطرت کس طرح بدل دیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں کسی ایسے مسئلہ پر خدا سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا، جو شر اور فساد سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا ایک فریق میں بھی ہوں۔"

ایک سپاہی نے فرطِ جذبات میں وفد سے کہا: "بے شرمو! ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔ اگر تم نے نادانی اور جہالت میں اس بزرگ ہستی کو کھو دیا تو گویا تم سب کچھ کھو دو گے۔"

آپ نے فرمایا: "لوگو! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری اس جگہ کو چھوڑ دوں۔ اب میں شہر کا دوسرا کنارہ آباد کروں گا۔"

وفد کے بڑے نے کہا: "اگر آپ نے ایسا کر دیا تو گویا ہمارا آپ کا کوئی جھگڑا ہی نہ رہے گا۔"

سپاہیوں نے پوچھا: "اگر آپ نے ان فسادیوں کے کہنے سے یہ جگہ چھوڑ دی تو کہاں جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "شہر کے باہر اس جگہ جو آبادی سے دور ہے اور جہاں ان شہریوں سے تعلق منقطع ہو جائے گا۔"

آپ نے جو کہا تھا۔ اس پر عمل کیا اور وہ جگہ چھوڑ دی اور شہر کے باہر ویرانے میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں آپ کے مریدوں نے ایک حجرہ تعمیر کر دیا۔ آپ اس میں رہنے لگے۔ قریب ہی پانی کے لیے ایک کنواں کھود دیا گیا۔ آپ نے اس جگہ بڑے سکون اور اطمینان سے ریاضت اور عبادت شروع کر دی۔

لیکن چند ہی دنوں بعد آپ کے مریدوں نے دیکھا کہ شہر والے یہاں بھی آ جا رہے ہیں۔ انہیں تعجب ہوا اور ان سے پوچھا: "بھائیو! خیریت تو ہے۔ یہاں آنے جانے کا کوئی خاص مقصد؟"

ان میں سے ایک نے بگڑ کر جواب دیا: "کیوں؟ کیا یہاں آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے یا ہمارے یہاں آنے سے آپ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے؟"

مرید نے کہا: "ہمیں کیا تکلیف ہو گی؟ آپ لوگ شوق سے آئیں جائیں لیکن خدا کے لیے اب کوئی شرارت نہ کرنا ورنہ بڑی بدمزگی ہو گی۔"

جواب ملا: "شرارت کون کرے گا۔ ہمیں کیا پڑی ہے جو شرارت کریں۔"

یہ بات تو تھی لوگوں کو خوب آتی ہے کہ آ بیل مجھ کو مار۔

لیکن مریدوں کو ان شہریوں پر شبہ ہو گیا تھا کہ یہ شرارتیں ضرور کریں گے۔

کئی دنوں بعد صبح، فجر کی نماز سے بھی پہلے چند مریدوں نے کسی شخص کو کنوئیں میں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں نے اس کو پکڑ لیا اور گدی سے کھینچ کر سبزے پر گرا دیا۔ ایک شخص نے اس کا گریبان پکڑ کر کئی زوردار جھٹکے دیے اور پوچھا: "تو یہاں کنوئیں میں کیا دیکھ رہا تھا؟"

وہ بہت گھبرایا ہوا تھا، بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا: "کچھ نہیں میں کنوئیں کا پانی دیکھ رہا تھا۔"

ایک سپاہی نے کہا: "تو جھوٹ بول رہا ہے۔ سچ سچ بتا دے ورنہ میں اس کنوئیں میں تجھ کو اُلٹا لٹکا دوں گا۔"

اس نے ایک بار پھر وہی بات کہی: "میں کنوئیں میں پانی دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر سختی نہ کرو۔ میں بے گناہ ہوں میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔"

ایک سپاہی نے اس کو زمین پر گرا دیا اور دوسرے کو آواز دی: "رسی ۔ ۔ ۔ لے آ، یہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ میں اس کو ابھی لٹکائے دیتا ہوں کنوئیں میں۔"

وہ شخص رونے لگا: "میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ مجھ کو زبردستی مجبور کر دیا گیا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا زبردستی اور ظلم سے مجبور ہو کر کیا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہو گی۔"

ایک سپاہی نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ بولا: "کچھ بتاتا ہے یا نہیں۔ بلاوجہ باتیں کیے چلا جا رہا ہے۔ یہ تو بتا کہ تو نے کون سا غلط کام کیا ہے جس پر شرمندہ ہو کر معافیاں مانگ رہا ہے۔"

اس شخص نے کہا: "میری گدی اور گریبان تو چھوڑ، ابھی بتاتا ہوں۔"

سپاہیوں نے اس کی گدی بھی چھوڑ دی اور گریبان بھی۔ کہا: "اچھا اب بتا۔ بات کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے یہ کام اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں کیا۔ آپ کے پیر و مرشد سے بستی کے لوگ جلتے ہیں۔ جب یہ ادھر چلے آئے اور بستی والوں کو انہیں ستانے کا موقع نہیں ملا۔ تو انہوں نے اس کام کے لیے میرے جیسے کئی آدمیوں کو تمہارے پیر کو ستانے پر مامور کر دیا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ پیر کے کنوئیں میں بستی والوں کے پھٹے پرانے جوتوں کو ڈال دو تاکہ جب وہ اس کا پانی پئیں تو ان کا ایمان خراب ہو۔"

سپاہیوں اور مریدوں نے اس کی تصدیق کے لیے کنوئیں میں ایک آدمی اتار دیا۔ اس نے اندر سے پرانے جوتوں کو نکالا تو وہ پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے نرم ہو رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس آدمی کی بڑی مرمت کی اور اس کو دھمکی دی کہ جا، اپنی بستی کے لوگوں کو بتا دے کہ اگر آئندہ ایسی حرکت ہوئی اور کوئی پکڑا گیا تو اس کو ذبح کر کے ڈال دیا جائے گا۔

لوگوں نے کنوئیں کا پانی نکال کر صاف کیا۔ پیر حافظ محمود کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کی کہ انہیں راہِ راست پر لے آ اور ان کے دلوں سے حسد اور کدورت دور کر دے۔"

اسی رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بھائی حامد کے ساتھ مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہیں۔ مزار کا پردہ ان کے سامنے ہے۔ انہوں نے اس پردے کو اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیا تو رسول مقبولؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ان کا دل بھر آیا اور رو رو کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! میں جالندھر والوں کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں۔ یہ مجھے بہت ستاتے ہیں۔ میں ایک غریب الوطن شخص اشاعتِ دین کی خاطر جالندھر میں رہتا ہوں مگر یہاں کے لوگ ہر وقت درپے آزار رہتے ہیں۔"

رسولؐ اللہ نے فرمایا: "محمود! خوف نہ کر تو اپنا کام کر، خدا بہتری کرے گا۔"

ان کی آنکھ کھل گئی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھے اور ان کے دل سے افسوس، ملال اور شکوہ و شکایت دور ہو چکے تھے۔

جالندھر کا ایک ہندو اہل کار کسی وجہ سے اپنی ملازمت سے نکال باہر کیا گیا۔ اس نے اپنی بحالی کے لیے بڑی کوششیں کیں اور سفارشوں سے کام نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر اس کے جی میں آئی کہ چلو پیر حاجی محمود سے دعا کرائی جائے۔ ممکن ہے کہ خدا ان کے طفیل ہی میرا کام بنا دے۔

وہ آپ کی خدمت میں پہنچا اور رو رو کر اپنا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: "تیری بستی کے لوگ میری جان کے درپے ہیں۔ اب انہوں نے تیری ملازمت بھی چھین لی۔"

ہندو اہل کار نے عرض کیا: "حضرت بس آپ دعا فرما دیں۔"

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہندو سے کہا: "لکھ، جو میں بولتا ہوں، اس کو لکھ لے اور اس کو ایک سو ایک بار دہرا۔ اللہ نے چاہا تو تیرا کام ہو جائے گا۔"

اس نے کاغذ اور قلم دوات سنبھالے اور کہا: "ارشاد، میں لکھتا ہوں۔"

آپ نے اردو میں فرمایا: "اے اللہ! تیرے سوا میرا کوئی مقصود نہیں ہے۔ میرا مقصود تو ہے، مجھ کو تیری ہی رضا مطلوب ہے۔"

ہندو اہل کار خوش خوش گھر گیا اور اسی رات حاجی محمود کی دعا کو ایک سو ایک بار پڑھا اور سو گیا۔ صبح وہ سو کر اٹھا بھی نہ تھا کہ جالندھر کے حاکم کا ایک آدمی اس ہندو کو بلانے آ گیا۔ بولا: "صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ فوراً ہی مل لیجیے چل کر۔"

یہ ہندو خوش خوش حاکم کے پاس پہنچا تو اس نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ پوچھا: "ارے بھائی! تو کہاں چلا گیا تھا۔ میں کل سے تیری تلاش میں ہوں!"

اہل کار نے جواب دیا: "جناب میں کہیں بھی نہیں گیا، یہیں موجود تھا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

حاکم نے کہا: "خدمت و دمت تو کیا۔ میں نے تجھے تیری جگہ بحال کر دیا کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی اور انشاء اللہ اب میں کوشش کروں گا کہ اس کی تلافی ہو جائے۔"

اہل کار خوش ہوا اور اپنی جگہ کام کرنے لگا۔ دوسرے دن حاجی محمود کی خدمت میں پہنچا اور بصد ادب عرض کیا: "حضرت پیر جی! آپ کی توجہ اور عنایت کا شکریہ۔ میرا کام بن گیا۔"

آپ نے فرمایا: "کام بن تو گیا ہے لیکن ذرا کچا بنا ہے۔ بگڑ بھی سکتا ہے۔"

اہل کار نے پوچھا: "بگڑ کس طرح سکتا ہے بھلا!"

آپ نے جواب دیا: "ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی رہتا ہے۔ اگر تو اس شیطان سے محفوظ رہا تو تُو اپنے مقصد میں تادیر قائم رہے گا۔"

اہل کار کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، پوچھا: "پیر و مرشد! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ لوگ شرارتیں کر کے تیرا کام بگاڑ بھی سکتے ہیں۔"

اہل کار نے عرض کیا: "حضرت! اگر آپ کی دعا شامل حال رہی تو میرا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

آپ نے فرمایا: "خدا ایسا ہی کرے۔"

اہل کار اپنے گھر واپس چلا گیا اور حاجی محمود نے گویا اپنے آپ سے کہا: "انسان اپنا دشمن آپ ہی ہوتا ہے اور اس کو جو نقصان بھی پہنچتا ہے، اپنی ہی ذات سے پہنچتا ہے۔"

جالندھر کے مولوی شمس الدین جو آپ کے بدترین مخالف تھے

ہندو اہل کار کا قصہ سن کر اس کے پاس پہنچے اور پوچھا "کیوں رے! کیا تو اس نقلی پیر کے پاس گیا تھا؟"

ہندو اہل کار نے جواب دیا "ہاں گیا تو تھا۔ اس سوال سے آپ کا مطلب؟"

مولوی شمس الدین نے پوچھا "کیوں گیا تھا کوئی خاص کام تھا؟"

اہل کار نے پوری بات بتادی اور کام بن جانے پر حاجی محمود کا شکریہ ادا کیا۔

مولوی شمس الدین نے سب کچھ سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ کہا "تو بھی کتنا سادہ لوح اور بھولا ہے۔ ارے اس کام کے لئے ان کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تو میرے پاس چلا آتا تو یہ کام میں خود کرا دیتا۔"

اہل کار نے جواب دیا "جناب! یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔"

مولوی شمس الدین نے کہا "اچھا اٹھ اور میرے ساتھ چل۔"

ہندو اہل کار نے پوچھا "کہاں؟ میں آپ کے ساتھ کہاں چلوں؟"

مولوی نے جواب دیا "اپنے حاکم کے پاس، دیکھ میں تیرے منصب میں کس طرح اضافہ کرتا ہوں۔"

ہندو اہل کار کو لالچ نے ستایا۔ پوچھا "کیا میں ترقی پا سکتا ہوں؟"

مولوی نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو۔"

ہندو اہل کار مولوی شمس الدین کے ساتھ حاکم کے پاس چلا گیا۔

مولوی نے حاکم سے کہا "جناب والا! یہ ہندو اس شہر کا لائق اور سمجھ دار شخص ہے۔"

حاکم نے حیرت سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا "پھر میں کیا کروں؟"

"یہ آپ کا ملازم بھی ہے؟" مولوی نے کہا۔

حاکم نے کہا "ہاں پھر؟ آپ کا مطلب؟"

مولوی نے اس کی برطرفی، حاجی محمود کی دعا اور اہل کار کی دوبارہ بحالی کا مختصراً ذکر کیا اور کہا "جناب! اب جو یہ آپ کی نوازش اور مہربانی سے بحال ہو گیا ہے تو وہ نقلی پیر مریدوں پر رعب گانٹھ رہا ہے کہ آپ نے اسے اس کی دعاؤں سے دوبارہ رکھ لیا ہے۔"

حاکم نے پوچھا "آگے چلو، پھر؟"

مولوی نے کہا "جناب والا! میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ ایسا کر دیجئے کہ اس جھوٹے پیر کو اپنی ذات پر ناز کرنے کا موقع نہ رہے۔"

حاکم نے پوچھا "مثلاً مجھ کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے؟"

مولوی نے جواب دیا "مثلاً یہ کہ آپ اس کو ترقی دے دیجئے تاکہ میں، یہ اہل کار اور دوسرے لوگ یہ کہہ سکیں کہ اگر بحالی اس پیر کی دعا سے ہوئی تھی تو یہ ترقی حاکم کی خوشنودی اور مہربانی سے ہوئی۔"

حاکم نے کچھ دیر سوچ کر ہندو اہل کار سے پوچھا "تیری کیا رائے ہے تو کیا چاہتا ہے؟"

ہندو اہل کار کو صاف نظر آرہا تھا کہ مولوی کام کر گیا اور اس کی ترقی ہونے ہی والی ہے۔ بولا "جناب! میں کیا کہوں گا۔ مولوی صاحب درست کہہ رہے ہیں اگر کچھ ایسا ہی ہو جائے کہ پیر کو فخر کا مزید موقع نہ ملے تو کیا ہی اچھا ہے۔"

حاکم ناراض ہو گیا۔ بولا "پھر اگر تم دونوں یہی چاہتے ہو کہ اس پیر کو مزید فخر کا موقع نہ ملے تو میں تجھ کو ترقی دینے کے بجائے برطرف کرتا ہوں۔ تم دونوں اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے۔"

ہندو اہل کار کا چہرہ اتر گیا۔ مولوی نے کہا "جناب! یہ کیا بات ہوئی؟"

حاکم نے کہا "مولوی صاحب، آپ اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔"

ہندو اہل کار نے خوشامد سے کہا "صاحب! مجھ پر رحم کیجئے۔"

حاکم نے جواب دیا "کوئی رحم وحم نہیں۔ اب تو یہاں سے چلا جا۔"

مولوی نے ایک بار پھر زور دیا۔ "صاحب! یہ تو بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے۔ یہ کس جرم میں اس کو سزا دی جا رہی ہے۔"

حاکم نے جواب دیا "میں نے جو فیصلہ کر دیا، کر دیا۔ آپ دونوں اسی وقت یہاں سے چلے جائیں ورنہ میں زبردستی نکلوا دوں گا۔"

دونوں وہاں سے باہر نکلے۔ دونوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

ہندو اہل کار نے کہا "مولوی صاحب! آپ نے مجھ کو برباد کر دیا ہے۔"

مولوی نے غصے میں کہا "اس مردود کا دماغ خراب ہے۔ میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

ہندو اہل کار نے عرض کیا "مولوی صاحب! وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اب میرا کیا بنے گا؟"

مولوی نے جواب دیا "تو ذرا صبر کر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اہل کار رونے لگا۔ "صاحب! میں تو برباد ہو گیا آپ کی بات مان کر۔"

مولوی نے پھر تسلی دی۔ "میں کہہ جو رہا ہوں کہ تو فکر نہ کر میں اس حاکم کو ٹھیک کرا دوں گا۔"

لیکن اہل کار کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ مولوی کو چھوڑ کر حاجی محمود کے پاس پہنچا اور رو رو کر پوری روداد سنا دی اور ان سے مدد چاہی۔ آپ نے افسوس کیا اور فرمایا "بھائی میرے! سارا کرشمہ یقین اور محبت کا ہے۔ لیکن تو ان سے محروم ہے، اب میں مجبور ہوں کہ اس سلسلے میں میں تیری مدد نہیں کر سکتا۔"

ہندو اہل کار نے خوشامد کی "پیر جی! میری مدد کیجئے۔ اب میں آپ کے علاوہ کسی کی بھی بات نہیں مانوں گا۔"

انہوں نے جواب دیا "تو شک اور طمع کا مریض ہے۔ پہلے اس مرض سے نجات حاصل کر۔ اس کے بعد میرے پاس آ۔"

جالندھر کے ایک شخص نے آپ سے درخواست کی کہ "آپ میری میزبانی قبول فرمائیں، میں آپ کو چند دنوں کے لیے مہمان رکھنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "میں تیری میزبانی قبول کرتا ہوں لیکن میرا نفس

ہچکچا رہا ہے، معلوم نہیں کیوں۔ میرا دل کراہت سی محسوس کر رہا ہے۔"

اس شخص نے خوشامد کی "حضرت! میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ خدا کے لئے انکار نہ کیجئے۔"

آپ نے اس کی دعوت منظور کر لی۔ وہ آپ کو محبت اور شوق سے لے گیا۔ آپ نے کھانا اپنے گھر ہی میں کھا لیا تھا اور صاحبِ خانہ سے فرمایا کہ "میں رات کا کھانا یہاں نہیں کھاؤں گا۔ صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔"

اس شخص نے کہا "بہتر ہے میں کھانے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن صبح کا کھانا تو آپ کو کھانا ہی پڑے گا۔"

آپ نے جواب دیا "کہہ تو دیا کہ صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔"

میزبان نے آپ کے لئے پلنگ بچھا دیا اور اس پر خوشنما اور ستھرا بستر لگا دیا گیا۔ آپ عبادت سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹ گئے۔ ایک دم انہیں احساس ہوا گویا وہ کسی گندے نالے میں گر گئے ہیں۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور تیز تیز سانسیں لے کر کچھ سونگھنے لگے۔

میزبان پاس ہی کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، پوچھا "کیا ہوا حضرت! خیریت تو ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں اس بستر میں غلاظت کی بو محسوس کر رہا ہوں۔"

میزبان نے مسکرا کر عرض کیا۔ "اتنا صاف ستھرا بستر، اس میں غلاظت کہاں سے آئی؟"

آپ نے جواب دیا "مجھے اس بستر میں آرام کے بجائے دکھ سا محسوس ہو رہا ہے۔ آخر یہ کیسا بستر ہے؟"

میزبان نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو وہم ہے پیر و مرشد۔ یہاں دکھ یا بدبو کا کیا گزر؟"

آپ اسی وقت بستر سے اتر کر نیچے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا "میں اس بستر پر نہیں سو سکتا۔ سونا تو بعد کی بات ہے۔ اس بستر نے میرا چین اور سکون ہی لوٹ لیا۔"

میزبان نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن آپ کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور مراقبے میں چلے گئے۔ آخر ذرا دیر بعد مراقبے سے نکل کر فرمایا "میں تجھ سے ایک سوال کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تو میرے سوالات کا صحیح صحیح جواب دے گا۔"

میزبان نے عرض کیا "میرا وعدہ، میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ سوال کیجئے۔"

آپ نے پوچھا "تو یہ پلنگ کہاں سے اٹھا لایا ہے؟ اس کے ساتھ ہی جو بستر ہے وہ کہاں سے آیا؟"

میزبان کا چہرہ اس سوال سے فق ہو گیا۔ بولا "آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "صرف اس لئے کہ مجھے اس میں بدبو محسوس ہو رہی ہے۔ یہ چیزیں تو کسی سے جبراً لے آیا ہے۔ اس لیے ان میں بدبو ہے۔"

میزبان آپ کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

آپ نے فرمایا "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

میزبان نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا "حضرت آج میں بے حد شرمندہ ہوں، کیونکہ جیسا کہ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا، بالکل درست ہے۔ یہ پلنگ میں نے اپنی پرجا سے زبردستی چھین لیا تھا اور یہ بستر وغیرہ، یہ بھی اس طرح حاصل کئے گئے ہیں۔"

"آپ نے فرمایا "افسوس کہ اب میں اس بستر اور پلنگ پر نہیں سو سکتا۔"

میزبان نے ایک بار پھر خوشامد کی۔ "حضرت! میں آپ کے لیے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہوں۔ آپ فرمائیں تو میں آپ کے قدموں میں بھی گر سکتا ہوں؟"

آپ نے فرمایا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تیرا مطلب پا لیا۔ تمہی میں سے کئی نے اس سے پہلے بھی میرا ایمان چھیننے کی ناکام کوشش کی تھی۔ میں اس واقعے کو بھی انہی میں شامل کئے دے رہا ہوں۔"

اس کے بعد میزبان نے بڑی کوشش کی کہ آپ رک جائیں لیکن نہیں رکے اور اسی رات اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔

فیروز پور کے مولوی کمال الدین کو کسی پیر کامل کی تلاش تھی۔ وہ مرید ہونے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے کئی پیروں سے ملاقات کی لیکن کسی کی طرف اپنی طبیعت کو راغب نہیں پایا۔ اسی جستجو میں اس عہد کے مشہور زمانہ صوفی سائیں توکل شاہ انبالوی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا "حضرت! میں پیر کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ لوگوں نے آپ کا پتہ دیا۔ اب آپ دیر نہ کیجئے اور مجھے مریدی میں داخل فرما لیجئے۔"

توکل شاہ انبالوی نے مولوی کمال الدین کی طرف سرسری نظر سے دیکھا اور فرمایا "تم ٹھہرے مولوی، پڑھے لکھے آدمی ہو اور میں ظاہری علوم سے نابلد ناآشنا۔ اس لئے میں تم کو مریدی میں نہیں لے سکتا۔"

مولوی کمال الدین نے عرض کیا۔ "لیکن میں یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔"

سائیں توکل شاہ نے جواب دیا۔ "بابا مولوی! تو جالندھر چلا جا، وہاں حاجی محمود رہتا ہے۔ تو اس کا حلقۂ مریدی اپنے گلے میں ڈال لے۔ اس سے زیادہ لائق اور باکمال صوفی تجھے نہیں ملے گا۔"

مولوی کمال الدین وقت ضائع کئے بغیر اسی وقت جالندھر روانہ ہو گئے۔ یہاں مولوی کمال الدین کے ایک ہم درس مولوی ولی محمد جالندھری بھی رہتے تھے۔ مولوی کمال الدین نے سوچا کہ حاجی محمود کے پاس جانے سے پہلے اپنے دوست سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیئے۔

یہ سوچ کر مولوی کمال اپنے دوست مولوی ولی محمد سے ملے اور سائیں توکل شاہ انبالوی کے حوالے سے پوری بات ان کے گوش گزار کر دی اور پوچھا "ولی محمد! تم... تو جالندھر ہی میں رہتے ہو۔ یہ حاجی محمود کیسے آدمی ہیں؟ کیا میں ان کا مرید ہو جاؤں؟"

مولوی ولی محمد جالندھری نے ناک بھوں چڑھائی اور پوچھا "مولوی کمال! کیا کوئی اس سے بڑا پیر اور نہیں ہے اس ملک میں جو تیرے جیسے باکمال عالم کا پیر بنے؟"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "مولوی ولی محمد: سائیں توکل شاہ نے ان کا نام لیا ہے ورنہ میں کسی اور پیر کی تلاش میں نکلتا۔"

مولوی ولی محمد نے کہا۔ "بھائی کمال: تم عالم ہو اور حاجی محمود علوم ظاہری نہیں رکھتے۔ اس لئے میرے خیال میں ایک عالم کو عالم پیر ہی کا مرید ہونا چاہیئے۔ میں حاجی محمود کے حق میں نہیں ہوں۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "ولی محمد: ان کا نام سائیں توکل شاہ نے دیا ہے۔ میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔"

مولوی ولی محمد نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ تم ان کی علمیت کا امتحان لے لینا تمہیں پتہ چل جائے گا کہ وہ کیا ہیں اور ان میں کتنی گہرائی ہے؟ یہ تماشا میں بھی دیکھ لوں گا۔"

مولوی کمال نے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

یہ دونوں حاجی محمود کے پاس روانہ ہو گئے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک مرید نے اندر جاکر اطلاع دی کہ "دو مولوی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا کہ "ظہر کی نماز میں ملاقات ہوگی۔"

دونوں نے وضو کیا اور ظہر کی نماز کے لئے تیار ہو گئے۔ مولوی ولی محمد نے طنزاً کہا۔ "بھائی کمال: تم دیکھتے جاؤ ابھی تو ابتدا ہے۔ کیا اخلاق ہے کہ دو عالم ان سے ملنے آئے ہیں اور اندر سے زحمتِ انتظار کا جواب دے رہے ہیں۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "ولی محمد! میں اس معمولی سی تاخیر کو زحمتِ انتظار نہیں سمجھتا۔ جب تک حاجی صاحب سے ملاقات نہ ہو جائے میں ان کی بابت کوئی رائے زنی نہیں کروں گا۔"

ظہر کا وقت ہوا تو آپ حجرے سے نمودار ہوئے اور ان دونوں پر کوئی توجہ دیئے بغیر ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں نے بھی ان کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ مولوی کمال نے نماز کے دوران ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ ان کی نماز میں کوئی خاص بات نہیں۔ بالکل عام لوگوں کی طرح نماز پڑھائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بابت ولی محمد نے جو رائے دی تھی وہ درست تھی۔

نماز کے بعد حاجی محمود نے ان دونوں کو طلب کر لیا۔ انہوں نے دونوں کا تعارف حاصل کرنے کے بعد مولوی کمال سے کہا۔ "مولوی: لوگ مجھے عام آدمیوں کی طرح نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو میری بابت شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں مجھ میں کوئی خاص بات تو نظر آتی نہیں پھر میں کسی کو اللہ کا نام کیا سکھاؤں گا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے نماز اسی طرح پڑھائی ہے۔ جس طرح یہ پڑھائی جاتی ہے۔" پھر مولوی ولی محمد سے کہا۔ "مولوی! آپ اسی جالندھر شہر کے رہنے والے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "جی! میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔"

حاجی محمود نے کہا۔ "آپ لوگوں کو میری بابت معلوم نہیں کیوں شبہات رہتے ہیں۔ کچھ کا یہ خیال ہے کہ میں علوم ظاہری سے نابلد ہوں اس لئے کسی عالم کو میری مریدی میں نہیں آنا چاہیئے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں۔ مگر آپ لوگ عالم کسے کہتے ہیں؟ یہ بھی تو معلوم ہو؟"

مولوی ولی محمد اور مولوی کمال حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

حاجی محمود نے دونوں سے سوال کیا۔ "تم لوگوں نے کیا کیا علم پڑھا ہے؟"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "میں نے فقہ، منطق، فلسفہ، الٰہیات تفسیر، حدیث اور بھی بہت کچھ پڑھا ہے۔"

حاجی محمود نے مولوی ولی محمد سے پوچھا۔ "اور جناب آپ نے؟"

مولوی ولی محمد نے جواب دیا۔ "میں مولوی کمال کا ہم درس رہ چکا ہوں اور جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے، وہی میں نے بھی پڑھا ہے۔"

حاجی محمود نے مولوی ولی محمد سے کہا۔ "مولوی صاحب! آپ سے تو میں بات نہیں کروں گا، مگر آپ کے دوست اور ہم درس مولوی کمال سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں نماز آتی ہے؟"

مولوی کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے نماز دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آتی ہے۔ کیا آپ کو شبہ ہے؟"

حاجی محمود نے کہا۔ "تمہیں نماز نہیں آتی۔ مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہے۔ ذرا بتلانا تو سہی کہ نماز کی نیت کس طرح باندھی جاتی ہے اور اس میں کیا کیا پڑھا جاتا ہے؟"

مولوی کمال نے جواب کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ ساری معلومات حرفِ غلط کی طرح حافظہ سے محو ہو چکی تھیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ "تم تو کہتے تھے کہ میں نے فلاں فلاں علوم پڑھے ہیں اور تمہیں نماز تک نہیں آتی۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "حضرت: اس وقت میرے حافظے کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ میرا ساتھ ہی نہیں دے رہا۔"

حاجی محمود نے مزید فرمایا۔ "اچھا اگر نماز نہیں آتی تو الحمد شریف ہی سنا دو۔"

مولوی کمال نے سورت فاتحہ پڑھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا تو پتہ چلا کہ یہ سورت بھی یاد نہیں رہی۔ انہیں سخت غصہ آرہا تھا۔

حاجی محمود نے کہا۔ "واہ بھئی واہ۔ تم نے تو کئی علوم کا ذکر کیا تھا۔ مگر عالم یہ ہے کہ نہ تو تمہیں نماز آتی ہے اور نہ ہی کوئی سورت یاد ہے۔ پھر تمہیں آتا کیا ہے؟"

مولوی ولی محمد کو اپنے دوست پر غصہ آرہا تھا۔ بولے۔ "مولوی کمال یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "بھائی ولی محمد! اس وقت میں کورے کاغذ کی طرح ہوں۔ کچھ تم ہی پڑھ کر سنا دو۔"

مولوی ولی محمد نے کوشش کی کہ سورت فاتحہ پڑھ کر سنا دیں لیکن وہ بھی زچ ہو گئے۔ ان کے حافظے نے بھی جواب دے دیا تھا۔

آپ نے فرمایا۔ "تم نے اپنے ان علوم سے فقیر کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ افسوس کہ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ دنیا کا کاروبار اللہ والوں سے چل رہا ہے۔" پھر فرمایا۔ "اچھا دوستو! میرے وظیفے کا وقت ہو چکا ہے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔"

لیکن مولوی کمال نے ان کے پاؤں پکڑ لئے اور عاجزی سے عرض کیا۔ "بابا! میں شرفِ مریدی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "میرے پیر چھوڑ دے۔"

مولوی کمال نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس وقت تک آپ کے پاؤں پکڑے رہوں گا کہ جب تک کہ آپ مجھ کو اپنا مرید نہیں کریں گے۔"

آپ کو مولوی کمال پر رحم آگیا اور انہیں اپنے مریدوں میں داخل کر لیا۔ مولوی ولی محمد نے ناک بھوں چڑھائی اور آہستہ سے کان میں کہا۔ "بھائی کمال! یہ کیا غلطی کر بیٹھے۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل اس درویش کی طرف نہیں مائل ہوتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں کب یہ چاہتا ہوں کہ تیرا دل میری طرف مائل ہو جائے۔ میں خود بھی تیری مریدی سے پناہ مانگتا ہوں۔ افسوس کہ جالندھر کے باہر والوں کے لئے تو روشنی ہی روشنی ہے مگر خاص... جالندھر والوں کے لئے تو اس سے زیادہ ہی نفرتیں اور کدورتیں مقدر کی جا چکی ہیں۔"

مولوی ولی محمد نے اپنے دوست سے کہا۔ "بھائی کمال! میرا اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہ نام نہاد درویش ہے۔ اس کو کچھ بھی نہیں آتا۔ مگر تم خواہ مخواہ چلے آئے۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "جنابِ والا! میں نے تو اس ذات کی تلاش میں کئی سال گزار دیے لیکن کوئی درویش نہ مل سکا اور اب جو خوش قسمتی سے میں نے ولی کامل کو پا لیا ہے تو تم وسوسوں والی بات کرنے لگے ہو۔"

ولی محمد وہاں نہیں ٹھہرے اور اپنے گھر کی راہ لی۔ دونوں دوستوں کے دلوں میں بگاڑ پیدا ہو چکی تھی۔ ان کے دل صاف نہیں تھے۔

جب مولوی کمال ان سے رخصت ہونے لگے تو حاجی محمود نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "مولوی! میری اس ڈاڑھی کا خیال رکھنا۔ کیونکہ تیرے پیچھے ورغلانے والے موجود ہیں۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! آپ فکر نہ کریں مجھ پر کسی کا بھی اثر نہ ہوگا۔"

حاجی محمود نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور انہوں نے اپنی زندگی میں لوگوں کو بڑا فیض پہنچایا۔ انہوں نے جالندھر والوں کی کبھی کوئی پروا نہ کی۔

آخری دنوں میں آپ کی ایک ڈاڑھ بہت دکھا کرتی تھی۔ علاج سے کوئی فائدہ نہ پہنچا تو کسی معالج نے مشورہ دیا کہ اس کو نکلوا دیجیئے۔ اس سے شاید افاقہ ہو جائے۔

آپ نے کچھ دیر کی سکوت کے بعد اپنے معالج سے کہا۔ "جب مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ میں اپنی اس ڈاڑھ کے بہانے سفرِ آخرت کروں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پھر اپنے ایک مرید سے کہا۔ "تو آج ہی انبالے چلا جا اور حضرت قبلہ توکل شاہ کو مطلع کر دے کہ حاجی محمود اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے، ملاقات کر لیں۔"

مرید نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسی وقت انبالے چلا گیا۔ توکل شاہ فوراً ہی چلے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی آپ نے اپنے معالج سے کہا۔ "اچھا اب تو اپنا کام کر اور میری ڈاڑھ نکال دے۔"

معالج نے جیسے ہی آپ کی ڈاڑھ نکالی، آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوشی کئی دن طاری رہی اور بالآخر اسی عالم میں آٹھ ربیع الاوّل ۱۳۰۶ھ کو آپ کا وصال ہو گیا۔ اس خبر سے دور دور تک ایک کہرام برپا ہو گیا۔ جنازے میں شرکت کی خاطر دور دور سے لوگ آنے لگے۔ قبلہ توکل شاہ تو وہاں موجود ہی تھے۔ دن چڑھے آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو ایک بار پھر کہرام برپا ہو گیا۔ بستی شیخ کے راستے پر جو قبرستان ہے۔ آپ کو اس میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اے لوگو! جن کی طرف رب ہے انہیں کیا غم۔ آنگن میں چندن کا درخت لگ گیا ہے۔ جس کے نیچے مسافر آکر بیٹھ جاتا ہے۔"

کسی نے پوچھا۔ "حضرت! اس کا مفہوم بھی بتا دیجیئے۔"

آپ نے فرمایا۔ "آنگن سے مراد قلب سالک ہے اور چندن کے درخت سے مراد اللہ کا نام ہے جو خوشی اور مسرت سے لبریز ہے اور مسافر سے مراد وارداتِ غیبی ہیں۔"

ایک غریب اللّٰہ یار شخص جس کا خمیر ڈیرہ غازی خان سے اُٹھا وہ آج بستی شیخ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہے۔

شیر یا عورت

اقبال پاریکھ (ترجمہ)

یادش بخیر! ابسے دس بارہ سال پہلے کا ذکر ہے ایک مقامی ماہنامہ میں "شیر یا عورت" کے عنوان سے ایک عجیب و غریب کہانی شائع ہوئی تھی فرینک اسٹاکٹن کی یہ شہرۂ آفاق تحریر کئی مہینے موضوعِ بحث بنی رہی اس کا خوب چرچا ہوا۔ جوان سال شاعر اور منفرد قلمکار احمد صغیر صدیقی نے اس کہانی کو اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔ عالمگیر شہرت کی حامل یہ کہانی ہم دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ آپ میں سے بہتوں نے یہ کہانی پڑھی ہوگی لیکن کیا آپ نے اس کہانی سے متعلق دوسری کہانی پڑھی ہے؟ میں نے انگریزی ادب کی ہزاروں کہانیاں پڑھی ہیں مگر شیر یا عورت کے معمّے سے متعلق اسٹاکٹن کی دوسری تحریر پہلی مرتبہ میری نظر سے گزری ہے۔ دنیا بھر کے لاکھوں افراد کی طرح، آپ میں سے بہت سے لوگ آج تک یہ معمّہ سلجھا نہ سکے ہوں گے کہ دروازہ کھلنے پر کیا برآمد ہوا، شیر یا عورت؟ انہی لوگوں کیلئے اسٹاکٹن نے دوسری کہانی "حسنِ انتخاب" لکھی تھی جو آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے لیکن اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے پہلے شیر یا عورت کو پڑھ لیجیے۔ آپ دونوں کہانیاں پڑھ چکیں گے تو میں آپ کو اسٹاکٹن کا ایک دلچسپ واقعہ بتاؤں گا

اقبال پاریکھ
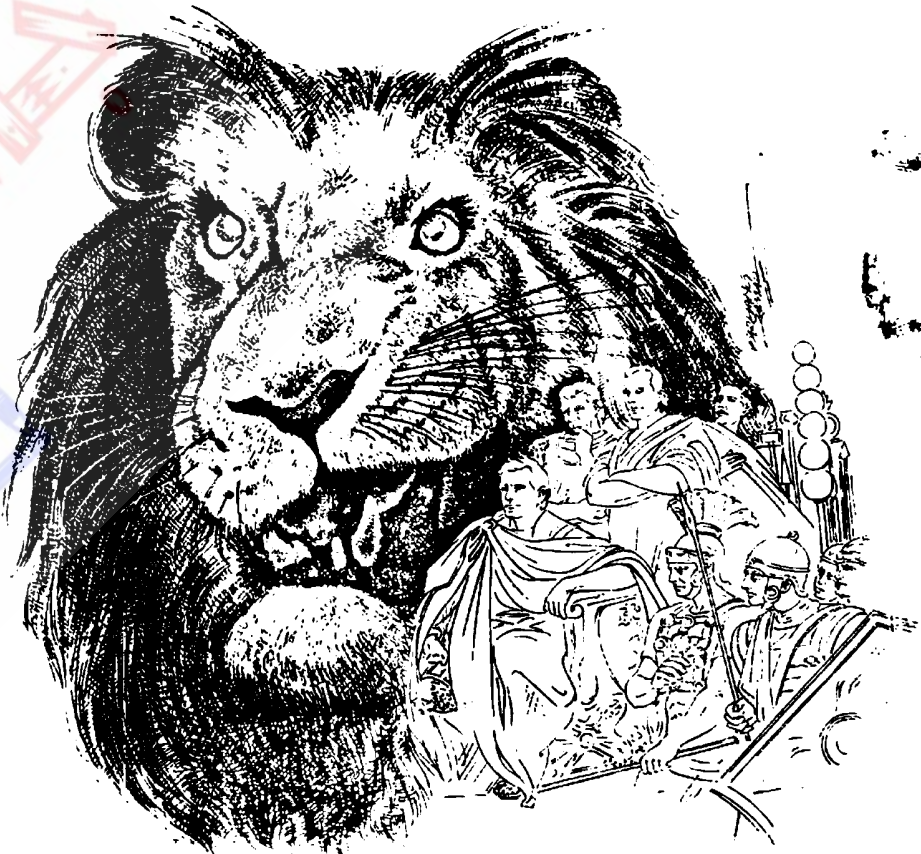
زمانۂ قدیم میں، حضرت عیسیٰؑ کی آمد سے قبل تاریک براعظم افریقہ کے کسی ملک میں ایک نیم وحشی بادشاہ حکومت کرتا تھا جس کے خیالات و افکار دور دراز کے عربی، یونانی اور لاطینی پڑوسیوں کے غیر معمولی ارتقاء کے باعث بڑی حد تک نکھر گئے تھے۔ اس کے تخیل کی پرواز اونچی اور شاعرانہ تھی۔ ایسی دور دور کی باتیں سوچتا تھا کہ عام ذہنوں میں آ ہی نہیں سکتیں۔ حکومت و طاقت کے بل بوتے پر اس نے متعدد تخیلات کو حقیقت کا جامہ پہنایا تھا۔ خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جس کام کو کر گزرنے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر لیتا، ناممکن تھا کہ وہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچے۔ اچھے اور عقلمند بادشاہوں کی طرح وہ اس وقت تک ماتحت وزراء، امراء اور حکام

کے کاموں میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتا تھا، جب تک ان کے بارے میں بے ایمانی اور بد دیانتی کی شکایات موصول نہ ہوتی ہوں۔ انصاف پسند اتنا تھا کہ اس کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے تھے۔ دربار میں امیر غریب، اعلیٰ ادنیٰ اور گورے کالے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جو شخص چاہے، جب چاہے، حصولِ انصاف کے لئے اس کے دربار میں پہنچ سکتا تھا اور بے تکلفی سے بڑے سے بڑے شخص کی، خواہ وہ شہزادہ ہی کیوں نہ ہو، شکایت کر سکتا تھا۔ شاہ کی منصف مزاجی کے باعث کئی اعلیٰ افراد یا تو قتل کئے جا چکے تھے یا انہیں عہدے سے معزول کر کے ان کی ساری مراعات سلب کر لی گئی تھیں۔

بادشاہ سخی بھی تھا اور اس کے دورِ حکومت میں یہ بات ضرب المثل بن۔۔۔ چکی تھی کہ لوگ بھوکے بیدار ہوتے تھے لیکن بھرے پیٹ سونے کے لئے لیٹتے تھے۔ شاہی اعلان تھا کہ جو شخص بے روزگار ہو یا بیمار و ضعیف ہو، وہ عاملینِ حکومت سے اپنا حق طلب کر سکتا ہے۔ اگر کبھی کوئی بد قسمت عامل، کسی کا حق ادا کرنے میں آنا کانی سے کام لیتا تھا تو اسے فوری طور پر قتل کی سزا دی جاتی تھی کہ دیگر عاملین کو عبرت ہو۔ یہی وجہ تھی اکثر عاملین رات و دن لوگوں سے پوچھتے پھرتے تھے کہ مملکت میں کوئی ننگا بھوکا تو نہیں یا کوئی ایسا شخص تو نہیں، جس کی کوئی حاجت ہو اور ابھی تک پوری نہ ہو سکی ہو۔ بادشاہ کا دلچسپ مشغلہ ٹیڑھے لوگوں کو سیدھا کرنا اور معاشرے کے ناہموار راستوں کو درست کرنا تھا۔

ترقی یافتہ ممالک سے مستعار لئے ہوئے ان طریقوں میں، جنہوں نے وحشی بادشاہ کو نیم وحشی بنا دیا تھا ایک طریقہ رعیت کے اجتماعات کا بھی تھا۔ عادل اور عاقل بادشاہ کے آباؤ اجداد کے دور میں بھی اس قسم کے اجتماعات ہوتے تھے لیکن چونکہ وہ وحشی سلاطین تھے، اس لئے ان کا مقصد وحشیانہ تفریحِ طبع تک محدود تھا۔ نہ کسی کی اصلاح مقصود تھی، نہ کسی کو عبرت دلانا مقصود تھا۔ بس بربریت کا ایک کھیل تھا جو وقتاً فوقتاً انسان کو مزید وحشی اور مزید درندہ بنانے کے لئے کھیلا جاتا تھا۔ موجودہ بادشاہ نے اجداد کے اجتماعات کو تو ختم نہیں کیا، تاہم ان کی شکل و صورت بدل کر ترقی یافتہ بنا دیا۔

لیکن نئی شکل و صورت میں بھی، ترقی یافتہ ہونے کے باوجود، ان اجتماعات کا وحشیانہ پن باقی رہا۔ بادشاہ نے بڑے سے میدان میں اسٹیڈیم جیسی جو عالیشان عمارت بنوائی، اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ رعیت، کافروں اور بد عقیدہ لوگوں کو ذبح ہوتے یا بھوکے شیروں کا نوالہ بنتے ہوئے دیکھے بلکہ بادشاہ چاہتا تھا کہ عوام کے ذہنوں کی نشو و نما ہو اور ان سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔

اس کا تعمیر کردہ اسٹیڈیم چاروں اطراف میں بڑی بڑی گیلریوں سے گھرا ہوا تھا اس میں بیک وقت ایک لاکھ سے زیادہ تماشائی بیٹھ سکتے تھے۔ بادشاہ اس اسٹیڈیم کو ایسی عدلیہ سے تعبیر کرتا تھا جس میں بڑے شاعرانہ طور پر جرائم کی سزا یا کارناموں کی جزا دی جاتی تھی۔ اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی قسم کی جانبداری کا اظہار نہ ہونے پائے۔

طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کسی شخص کو کسی جرم کا ملزم گردانا جاتا اور وہ جرم بادشاہ کے نزدیک واقعی جرم ہوتا تو منادی کرا دی جاتی کہ فلاں مقررہ دن اور مقررہ وقت پر شاہی اسٹیڈیم میں ملزم کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ بادشاہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ثقافتی ورثے کو نقصان پہنچے اور اسے یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ ترقی یافتہ ممالک میں اسے ظالم اور وحشی کے لقب سے یاد کیا جائے۔

مقررہ دن اور وقت پر جب شاہی اسٹیڈیم میں عوام اکٹھا ہو جاتے اور گیلریوں میں تل دھرنے تک کی گنجائش نہ رہتی تو بادشاہ اپنے وزراء و امراء، اعزہ و اقرباء کے جلوس میں اس مخصوص جگہ پر پہنچتا۔ جہاں اس کا ہیرے جواہرات سے مزین تخت رکھا ہوا تھا۔ تخت پر بیٹھ کر وہ اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتا۔ یہ گویا اس کا اشارہ تھا کہ ملزم کو میدان میں لایا جائے۔

شاہ کے اشارے پر پریشاں حال ملزم میدان میں داخل ہوتا۔ اس کے پیچھے دو دروازوں والی ایک گاڑی ہوتی جسے سیاہ فام غلام کھینچتے ہوئے وہاں لاتے۔ میدان میں گاڑی کھڑی کر کے غلام واپس چلے جاتے۔ پورے اسٹیڈیم میں بھیانک سناٹا چھا جاتا۔ رعیت کی نظریں بادشاہ کے ہاتھ پر جم جاتیں کہ وہ اسے اوپر اٹھاتے۔

بادشاہ کا ہاتھ بلند ہوتے ہی ملزم کے لئے لازمی تھا کہ گاڑی کے دو دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کو کھول دے۔ وہ جس دروازے کو چاہے، کھول سکتا تھا۔ اسے کسی کی ہدایت یا رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فیصلہ قطعی طور پر غیر جانبدارانہ ہوگا کبھی ایسا ہوتا کہ ملزم کی مرضی کا دروازہ کھلتے ہی ہفتوں کا بھوکا پیاسا شیر ببر نکلتا۔ اپنے سامنے ملزم کی صورت میں خوراک دیکھتا اور

ننھی منی سی مچھلی

اپنی ماں کے ساتھ پہلی بار سمندر کی سیر کو نکلی تھی
اور خوشی خوشی ہر طرف تیرتی پھر رہی تھی۔
معاً اس نے ایک آب دوز کشتی دیکھی۔ ڈر کر وہ فوراً
اپنی ماں کی بغل میں دبک گئی۔
"ڈرو نہیں بیٹی"۔ ماں نے سمجھایا۔ "یہ کوئی خوفناک چیز
نہیں، آدمیوں سے بھرا ہوا سربند ڈبہ ہے۔"

عین اس وقت جب بادشاہ کا ہاتھ دروازہ کھولنے کے حکم کے لیے بلند ہونے والا تھا، نوجوان کی بے چین و مضطرب آنکھوں نے شہزادی کی آنکھوں سے بڑی عجلت و تیزی سے سوال کیا، کون سا دروازہ ؟ "

نوجوان کی پریشان آنکھوں کا خاموش سوال شہزادی کے لئے ایسا ہی تھا جیسے اس نے بآواز بلند چیخ کر شہزادی سے سوال کیا ہو۔ وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ سوال کا جواب دینے میں ایک لمحہ بھی ضائع کیا جائے۔ برق جیسی سرعت سے سوال کیا گیا تھا۔ جواب بھی اسی سرعت کا متقاضی تھا۔

شہزادی کا دایاں بازو اس کی ران پر بڑے پُروقار انداز میں رکھا ہوا تھا۔ نوجوان کی آنکھوں ... ن سمجھتے ہی اس نے ران پر رکھا ہوا ہاتھ اٹھایا اور تیزی سے دائیں جانب کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ شہزادی کا اشارہ کوئی نہیں دیکھ سکا۔ لوگوں کی نظریں بادشاہ کے ہاتھ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ جو بلند ہو چکا تھا۔ اشارے کو اگر کسی نے دیکھا تو صرف شہزادی کے محبوب نے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ شہزادی کا شکریہ ادا کر کے پلٹا اور بڑے عزم کے ساتھ دو دروازوں والی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

لوگوں کے دل نے چند لمحوں کے لئے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ آنکھیں آگے بڑھتے ... تے نوجوان پر جم گئیں۔ ایسا عجیب و غریب سناٹا چاروں طرف طاری ہو گیا جیسے وہاں۔ اُس اسٹیڈیم میں ایک بھی ذی روح ہستی نہ ہو۔

بغیر کسی جھجک۔ کسی ہچکچاہٹ اور کسی خوف کے نوجوان دائیں دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول دیا۔

✻

کہانی کا اصل حصہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نوجوان نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے کیا برآمد ہوا ہوگا؟ شیر یا دوشیزہ ؟

اس سوال پر ہم جتنا غور کرتے ہیں، جواب اتنا ہی مشکل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ اس کا تعلق ایک لڑکی کے دل سے ہے جو مختلف قسم کے جذبات سے معمور ہے اور ہر جذبہ اتنا شدید ہے کہ ہمیں کسی نتیجے پر نہیں پہنچنے دیتا۔ ہمیں اس سوال کا جواب یہ سمجھ کر نہیں دینا چاہیئے کہ اس کا انحصار ہماری سوچ اور فکر پر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے گرم خون والی۔ نیم وحشی لڑکی ہے اور وہ بیک وقت محبت اور نفرت کے دہکتے ہوئے الاؤ میں جل رہی ہے۔ اس کا محبوب اس سے چھن چکا ہے لیکن اب اسے کس کے پاس جانا چاہیئے؟

کتنی ہی راتیں اُس نے جاگ کر اس بھیانک تصور میں اور کتنی ہی راتیں اس نے سوتے میں اس خوفناک خواب کو دیکھ کر گزار دی ہیں کہ اس کا محبوب اُس دروازے کو کھول رہا ہے۔ جس کے پیچھے کئی روز کا بھوکا ببر شیر موجود ہے۔

نہیں۔ اس کے تصورات اور اس کے خواب بھوکے ببر شیر والے بھیانک اور خوفناک منظر تک محدود نہیں ہیں۔ اس نے متعدد بار اپنے محبوب کو، اُس محبوب کو جو اُس کا اور صرف اس کا اپنا تھا، دوسرا دروازہ کھولتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور وہ اس وقت دانت کٹکٹا کر اور اپنے بال نوچ کر رہ گئی ہے۔ جب دوسرے دروازے سے رقیب لڑکی برآمد ہوتی ہے اور نوجوان خوش ہو کر اس سے بغلگیر ہو گیا ہے اس منظر کے تصور ہی سے اس پر نزع جیسی کیفیت طاری ہوتی رہی ہے۔ ببر شیر والے منظر سے زیادہ بھیانک اور خوفناک منظر یہ تھا جب وہ اس نوجوان کو جس پر صرف اس کا حق تھا، رقیب لڑکی کا شوہر بنتے اور گیلریوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو قہقہے لگاتے ہوئے دیکھتی تھی۔

کیا اس کے محبوب کے لئے یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ لقمۂ اجل بن جائے اور دوسری دنیا میں پہنچ کر، ان لوگوں کے اعتقادات کے مطابق، شہزادی کی آمد کا انتظار کرے ؟ کیا وہ گوارا کر سکتی تھی کہ جس لڑکی سے ہمیشہ نفرت کرتی آئی ہے، جس کے حسن و جمال سے جلتی رہی ہے، وہی لڑکی اس کے محبوب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لے ؟ نہیں، یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ دنیا کی کوئی لڑکی اتنی سخی کبھی نہیں ہو سکتی، کبھی نہیں !

مگر دوسری طرف خونخوار، بھوکا ببر شیر تھا۔ تصور میں محبوب کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ شیر اسے پھاڑ رہا تھا، کاٹ رہا تھا، جھنجھوڑ رہا تھا، خون بہہ رہا تھا، خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

شہزادی نے پلک جھپکتے میں اپنے محبوب کو جو اشارہ کیا تھا، اس کے بارے میں اس نے کئی دنوں اور کتنی راتوں تک غور کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں دروازے کے بارے میں پوچھا جائے گا اور وہ طے کر چکی تھی کہ وہ کیا جواب دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان کی سوالیہ نظریں اٹھتے ہی، ایک ہی ثانیے میں اس نے دائیں دروازے کی جانب ہاتھ کا اشارہ کر دیا تھا۔

اس کے اشارے کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے یا یہ سمجھا جا سکے کہ اس نے ایک عام انسانی ذہن کی طرح سوچا ہوگا۔ ہمیں شہزادی کی محبت اور رقابت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کرنا ہوگا کہ اس کے جسم میں کس قسم کے ماں باپ کا خون گردش کر رہا تھا اور ہم یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ بہر حال ایک لڑکی تھی۔ اب میں اس مسئلے کو اپنے قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ خوب اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد وہ بتائیں کہ نوجوان نے جو دروازہ کھولا تھا۔ اس سے کیا برآمد ہوا ـــــ حسین لڑکی یا بھوکا شیر ؟

(ختم)

نیم وحشی بادشاہ کے اسٹیڈیم میں حسین لڑکی یا بھوکے شیر کے واقعے کو گزرے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا ہوگا کہ اس بادشاہ کے دربار میں پانچ اجنبیوں پر مشتمل ایک وفد آیا۔ وہ لوگ ایک دُور کے ملک سے وہاں آئے تھے اور چونکہ چہرے مُہرے اور تراش خراش سے اعلیٰ عہدوں پر فائز معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم پر دربار کے سب سے بڑے عہدیدار نے ان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور انہیں بڑی آؤ بھگت سے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ جملہ رسومات سے نمٹنے کے بعد غیر ملکی وفد نے اس بڑے عہدیدار کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

"معزز ترین افسرِ اعلیٰ" وفد کے سربراہ نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کا ایک شخص آپ کے ملک میں آیا ہوا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عشق منظرِ عام پر آئی جس نے آپ کے شہنشاہ کی ایک بیٹی پر نظرِ بد ڈالی تھی۔ یہاں کے قانون کے مطابق اسے اسٹیڈیم میں بھیجا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ دونوں دروازوں میں سے کوئی ایک دروازہ کھولے اسے علم نہیں تھا کہ کس دروازے سے بھوکا شیر برآمد ہوگا اور نوجوان کو پھاڑ کھائے گا یا ملک کی سب سے خوبصورت لڑکی کس دروازے کے پیچھے موجود ہے اور اس کی بیوی بننے کے لئے خوب اچھی طرح بن سنور کر آئی ہے۔ ہمارے ملک کا باشندہ اس وقت اسٹیڈیم میں ہی موجود تھا لیکن غیر معمولی طور پر اتنا حساس واقع ہوا ہے کہ عین اس وقت جبکہ نوجوان دروازہ کھولنے ہی والا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ اس پر اس خیال ہی سے غشی طاری ہونے لگی کہ کہیں اسے کوئی دہشت ناک واقعہ نہ دیکھنا پڑے۔ چنانچہ وہ اسٹیڈیم سے گرتا پڑتا ہوا باہر بھاگا۔ اپنے اونٹ پر بیٹھا اور جتنی تیز رفتاری سے اسے دوڑا سکتا تھا۔ دوڑاتا ہوا دارالخلافے سے باہر نکل گیا۔ اس نے اس پر بس نہیں کی۔ سنسان اور ویران مقامات پر چند گھنٹوں تک ستانے، کھانے پینے اور آرام کرنے کے لئے ٹکڑوں میں دوبارہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

وطن پہنچ کر جب اس شخص نے یہ داستان سنائی تو ہم میں سے جس شخص نے بھی اسے سنا، یہ جاننے کے لئے بیتاب ہو گیا کہ نوجوان پر کیا بیتی ہوگی۔ ہم سب کو اس بات کا انتہائی قلق تھا کہ وہ شخص انجام کا انتظار کئے بغیر آپ کے ملک سے چوروں کی طرح کیوں فرار ہوا۔ اس میں تابِ نظارہ نہیں تھی تو کم از کم باہر آ کر یہ تو معلوم کر ہی لینا چاہیئے تھا کہ جس دروازے کو اس نوجوان نے کھولا۔ اس سے لڑکی باہر آئی یا شیر ببر۔ ہمیں توقع تھی کہ کچھ ہی دنوں میں آپ کے ملک کا کوئی نہ کوئی مسافر سوداگر یا سیاح ہمارے ملک میں آئے گا اور اس سے ہمیں اصل صورتِ حال معلوم ہو سکے گی مگر حیرت کی بات ہے کہ ہماری روانگی کے وقت تک یہاں کا ایک شخص بھی ہمارے ہاں نہیں پہنچا تھا بالآخر ہمیں فیصلہ کرنا پڑا کہ ایک وفد تشکیل دیا جائے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ یہاں آ کر پوچھے کہ کھلے ہوئے دروازے سے کون باہر نکلا تھا ؟ لڑکی یا شیر ؟ "

جب دربار کے اعلیٰ عہدیدار کو وفد کے آنے کا مقصد معلوم ہوا تو

اقبال فرحت

وہ اراکین وفد کو اندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں خوبصورت اور آرام دہ گدیوں پر بٹھاتے ہوئے اس نے قابل عزت و تکریم مہمانوں کے لئے قہوے، تمباکو، شربت اور دوسری نیم وحشیانہ میٹھی، نمکین اور کھٹی چیزیں منگوائیں۔ ساری چیزیں آگئیں تو وفد کے سامنے ایک گدیلے پر بیٹھ کر اس نے انہیں مخاطب کیا۔

"معزز و مکرم اجنبیو! اس سوال کا جواب دینے سے قبل جس کی خاطر تم نے اتنا طویل سفر کیا ہے، میں تمہیں ایک ایسا واقعہ بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے مذکورہ واقعہ کے فوراً بعد پیش آیا۔ ہمارے قرب و جوار کے سبھی ممالک کے افراد جانتے ہیں کہ ہمارا اعظیم بادشاہ خوبصورت لڑکیوں کا بڑا شائق ہے۔ ملکۂ معظمہ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی خدمت میں رہنے والی کنیزیں بہت پیاری لڑکیاں ہیں جنہیں ملک کے ہر حصے سے اکٹھا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ شہنشاہ کے اس شوق کی شہرت، جس میں دنیا کا کوئی دوسرا شخص ان برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا دور اور نزدیک کے تمام ممالک میں پھیل گئی اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہمارے بادشاہ نے عدل و انصاف کا عجیب و غریب غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

چند ماہ قبل ہمارے ملک میں کسی دور کے ملک کا ایک شہزادہ آیا۔ اس کی شان اور مرتبے کا خیال کرتے ہوئے، ہمارے شہنشاہ نے بہ نفس نفیس اسے ملاقات کا شرف بخشا اور درخواست کی کہ وہ اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کرے۔ شہزادے نے شہنشاہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے جواب دیا کہ شاہی محل کی لڑکیوں کے غیر معمولی حسن کے بارے میں سن کر وہ اس مقصد سے ہمارے ملک میں وارد ہوا ہے کہ ان میں سے کسی ایک لڑکی کو اپنی بیوی بنالے۔

عظیم شاہ نے جب یہ گستاخانہ جواب سنا تو ان کا مقدس چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور بڑی بے چینی سے انہوں نے اپنے تخت پر پہلو بدلا۔ ہم سب دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ ان کی زبان سے شہزادے کو سخت سزا دینے کے احکامات جاری نہ ہو جائیں لیکن بمشکل تمام انہوں نے اپنے اوپر قابو پایا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہزادے کی طرف گھوم کر بولے: "تمہاری خواہش پوری کی جائے گی اور کل دوپہر کو محل کی سب سے حسین لڑکی کو تمہاری زوجیت میں دے دیا جائے گا۔"

پھر حکام سے مخاطب ہو کر انہوں نے فرمایا: "کل دوپہر کو ہمارے محل میں شادی کے مکمل انتظامات کئے جائیں۔ شہزادے کو اس کے رتبے کے مطابق شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے اور اس کی خدمت میں شاہی درزی، شاہی موچی، شاہی صراف اور شاہی اسلحہ ساز کو بھیجا جائے تاکہ وہ اس کی شادی کے لئے اس کی پسند کی اشیاء تیار کریں۔ اس کے علاوہ شہزادہ جس چیز کی تمنا کرے، فوراً مہیا کی جائے اور تم سب کل دوپہر میں ہونے والی شادی میں شرکت ... ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"لیکن حضور والا!" شہزادے نے کہا: "شادی کی تیاریوں سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کو...."

"مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہنشاہ نے گرج کر درمیان ہی سے اس کی بات کاٹ دی: "شاہی احکامات کا اجراء ہو چکا ہے۔ تم نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے اب اس موضوع پر کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔ کل دوپہر تک کے لئے خدا حافظ۔"

اور یہ کہہ کر بادشاہ سلامت کھڑے ہو گئے اور اندرون محل تشریف لے گئے۔ شہزادے کو ہاتھوں ہاتھ سب سے اچھے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ مہمان خانے میں اس کے حضور شاہی درزی، شاہی موچی، شاہی صراف اور شاہی اسلحہ ساز پیش کئے گئے جنہوں نے مہارت اور بڑی ہنرمندی سے شہزادے کی شادی کے لئے راتوں رات لباس، جوتے، زیورات اور اسلحہ تیار کئے۔ شہزادے کو ہر وہ چیز مہیا کی گئی جس کا اس نے اظہار کیا۔ تاہم شہزادے کے چہرے سے ایک بات صاف عیاں تھی۔ خوش ہونے کے بجائے وہ بڑی تکلیف دہ پریشانی میں مبتلا تھا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"میں ابھی تک شہنشاہ کے طرز عمل کو نہیں سمجھ سکا ہوں۔" اس نے اپنی خدمت میں حاضر خدمت گاروں سے کہا: "مجھے لڑکیوں کو دیکھنے اور کسی ایک کا انتخاب کرنے کا موقع کب دیا جائے گا؟ میں ان سے ملنا، گفتگو کرنا اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔ محض ان کے جسموں اور چہروں کو دیکھ کر اچھے جسم اور اچھے چہرے والی لڑکی کو منتخب کرنا نہیں چاہتا۔"

"نہ ہم کچھ جانتے ہیں نہ کچھ بتا سکتے ہیں۔" ایک خدمت گار نے بڑے ادب سے جواب دیا: "بادشاہ سلامت جو سوچتے ہیں، وہی درست ہے اور جیسا وہ چاہتے ہیں وہی ہو گا۔ اس مسئلہ پر آپ کا اور ہمارا سوچنا اور سمجھنا بالکل بے سود ہے۔"

"بادشاہ سلامت کا رویہ بہت ہی انوکھا ہے۔" شہزادے نے کہا: "اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ مجھ سے متفق نہیں ہیں۔"

شہزادے کے منہ سے ادھر یہ الفاظ ادا ہوئے اور ادھر ایک لمبا چوڑا، لحیم شحیم شخص جو مہمان خانے کے دروازے پر موجود تھا، ہاتھ میں شمشیر برہنہ لئے ہوئے اندر داخل ہوا اور بڑے ادب سے شہزادے کی خدمت میں آداب بجا لایا۔

"کون ہو تم؟" شہزادے نے چمکتے ہوئے مہلک ہتھیار پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

"میں!" شمشیر بردار نے اس طرح کہا جیسے وہ شہزادے کا مذاق اڑا رہا ہو: "میں موت کا فرشتہ ہوں، ہمارے شہنشاہ معظم دوسروں سے متفق ہونے کے بجائے انہیں اپنے آپ سے متفق ہوتے ہوئے

دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ جو افراد شہنشاہ بلند مرتبت سے متفق نہ ہوں، انہیں کسی قسم کی رو رعایت کئے بغیر موت کی نیند سلا دوں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے، شہزادہ عالی وقار کہ میں کون ہوں اور میرا منصب کیا ہے؟"

شہزادے نے خوفزدہ ہو کر اپنی نظریں شمشیر بردار موت کے فرشتے کے چہرے سے ہٹالیں اور خاموشی سے درزی کو ناپ دینے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

❁

صبح کے ناشتے سے قبل ہر چیز تیار ہو چکی تھی۔ ناشتے کے بعد شہزادے کو دوپہر سے کچھ پہلے دولہا بنایا جانے لگا۔ شہزادے نے ایک بار پھر خدمت گاروں سے پوچھا کہ اسے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے اور بات چیت کرنے کا کب موقع دیا جائے گا؟"

"اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ ہر بات بادشاہ سلامت کی مرضی کے مطابق ہو گی اور یقیناً بہترین طور پر ہو گی۔"

دروازے پر کھڑا ہوا چاق و چوبند شمشیر بردار فوراً ہی اندر پہنچ گیا اور چمکتی ہوئی تلوار کو خط مستقیم کی طرح سیدھا کر کے بولا: "شہزادہ عالی وقار ذرا اس تلوار کی کاٹ تو ملاحظہ فرمایئے۔"

پھر اس نے بڑے احترام سے جھک کر اپنے سر کا ایک بال توڑا اور سیدھی کی ہوئی تلوار پر آہستہ سے ڈالا۔ تلوار کی دھار کو چھوتے ہی بال کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

شہزادے نے یہ منظر دیکھا اور لرزتے ہوئے دل کے ساتھ دولہا بننے لگا۔

بڑے بڑے افسران، حکام اور خدام آئے اور دولہا کو شاہی محل کے اس عظیم الشان ہال میں لے گئے جہاں شادی کی رسومات انجام دی جانے والی تھیں۔ وہاں سب سے پہلے شہزادے کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ شہزادے نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

"حضور والا! اس سے پہلے کہ شادی کی رسومات انجام...."

اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہو سکا تھا کہ ایک خدمت گار ہاتھ میں لمبا سا ریشمی اسکارف لئے ہوئے آگے بڑھا اور بڑی تیزی اور بڑی ملائمت سے اس کے منہ پر لپیٹ دیا۔ شہزادے کے اگلے الفاظ اسی میں گھٹ گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر خدمت گار نے اسکارف کے باقی حصے کو اسی تیزی اور اسی ملائمت سے شہزادے کے چہرے پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شہزادے کا پورا چہرہ اس میں لپٹ گیا اور وہ کچھ بھی دیکھنے سننے اور بولنے کے قابل نہ رہا۔ مگر خدمت گار نے دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے اتنا اسکارف ہٹا لیا کہ وہ بول سکے، ناک سے ہٹا لیا کہ وہ سانس لے سکے۔ کانوں سے ہٹا لیا کہ وہ سن سکے۔

بہت

کم لوگ ہیں جنہیں یونانی جنرل میٹاکس کی موت کا اصل سبب معلوم ہو۔ یونان کی حکومت کہتی ہے کہ وہ ڈوب کر مرا لیکن یہ بات کوئی نہیں بتاتا کہ وہ ڈوبا کس طرح؟ دراصل جنرل میٹاکس بڑا غائب دماغ شخص تھا۔ بس میں سفر کرتے وقت اپنی منزل بھول جاتا اور اگر منزل پر پہنچ جاتا تو یہ سوچتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟

ایک مرتبہ بحریہ کے ایک افسر نے اسے فلائنگ بوٹ کا معائنہ کرنے کی دعوت دی۔ جنرل نے اس شرط پر دعوت قبول کر لی کہ پائلٹ کے فرائض وہ خود انجام دے گا۔

چنانچہ وہ بحریہ کے افسر کے ساتھ ساحل پر پہنچا۔ سمندر میں کھڑی ہوئی فلائنگ بوٹ پر سوار ہوا اور بڑی خوش اسلوبی سے فضاؤں میں اڑانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کی پرواز سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ فلائنگ بوٹ کو ایک ہوائی اڈہ پر اتارنے لگا، کہ بحریہ کے افسر نے اسے یاد دلایا کہ وہ ہوائی جہاز پر نہیں، فلائنگ بوٹ پر سوار ہے جسے سمندر ہی میں اتارا جا سکتا ہے۔

جنرل میٹاکس نے سمندر میں فلائنگ بوٹ اتاری۔ بحریہ کے افسر کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے بروقت اسے یاد دہانی کرائی اور ٹہلتا ہوا سمندر میں اتر گیا۔ بیچارہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ فلائنگ بوٹ سطح زمین پر نہیں بلکہ سطح سمندر پر ہے۔

آنکھوں اور چہرے کا ایک حصہ اسکارف میں لپٹا رہا۔ شہزادہ بول سکتا تھا، سن سکتا تھا، سانس لے سکتا تھا مگر دیکھنے سے قاصر تھا۔

شہزادے نے چاہا کہ وہ آنکھوں اور چہرے پر لپٹا ہوا اسکارف اتار پھینکے لیکن جونہی اس نے ہاتھ بلند کئے، اس کو اپنے قریب سے موت کے فرشتے کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے نرم و ملائم لہجے میں بڑے پیار اور شائستگی سے کہہ رہا تھا: "نہیں، شہزادہ عالی وقار۔ اسکارف اتارنے کی کوشش نہیں کیجئے۔ میں یہیں آپ کی بغل میں موجود ہوں اور جناب والا میری تلوار کی تیزی کو بچشم خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔"

اور یہ سنتے ہی شہزادے کے ہاتھ لرز کر نیچے ہو گئے۔

چند لمحوں بعد اس نے شاہی پجاری کی آواز سنی جس نے شادی کی رسم کا آغاز کرتے ہوئے کسی مشکل اور سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ میں زور زور سے کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔ اپنے دائیں بازو پر اس نے ریشمی لباس کی سرسراہٹ محسوس کی مست کر دینے والی خوشبوؤں کے بھبکے پھوٹنے لگے۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی لڑکی اس کے قریب آ کھڑی

گاہک کو پیسٹری کے بارے میں شکایت تھی۔
بیکری کے مالک نے کہا "تمہاری شکایت بے جا ہے۔ پیسٹری بنانے میں میرا وسیع ترین تجربہ ہے۔ میں اس وقت سے پیسٹری بنا رہا ہوں، جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔"
"ہو سکتا ہے۔" گاہک بولا "مگر اس وقت کی بنائی ہوئی پیسٹری اب کیوں بیچ رہے ہو؟"

ہوئی ہے۔

شاہی پجاری نے کہا "معزز و مکرم شہزادے۔ اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لیجئے۔"

شہزادے نے اسی حال میں ہاتھ بڑھایا۔ لڑکی نے جلدی سے اس کے بھٹکتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شہزادے نے محسوس کیا کہ اس نے جو ملائم سا ہاتھ پکڑا ہے۔ اس میں محبت کی گرمی بھی ہے اور چاند کی ٹھنڈک بھی۔ اس کے پورے جسم میں خوشی کی تیز سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

ملک کے رواج کے مطابق پجاری نے لڑکی سے پوچھا "معزز و مکرم خاتون! کیا آپ شہزادے کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کرتی ہیں؟"

"جی ہاں" جواب ملا "میں شہزادے کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرتی ہوں۔"

لڑکی کی آواز اتنی سریلی اور رسیلی تھی کہ شہزادہ خوش ہو گیا۔ کانوں میں رس گھولنے والی ایسی پیاری آواز اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ہاتھ کی ملائمت، خنکی اور گرمی کے لمس کے ساتھ ساتھ سازوں جیسی وہ آواز اس بات کی ضامن تھی کہ اس کے لئے جس لڑکی کو منتخب کیا گیا ہے وہ یقیناً حسن و جمال میں یکتا اور لاثانی ہے۔

پجاری نے کہا "معزز و مکرم شہزادے۔ کیا آپ اس لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں؟"

شہزادہ تڑپ کر بولا "ہاں، میں اس لڑکی کو بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں۔"

"تب میں تم دونوں کو شادی کے مقدس رشتے میں منسلک کرتا ہوں۔" پجاری کی آواز آئی "آج سے تم ایک دوسرے کے زن و شوہر ہوئے۔"

اس کے ساتھ ہی مبارک، سلامت کی آوازیں گونج اٹھیں عطریات اور خوشبویات کی بارش ہونے لگی۔ زن و شوہر پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ کسی نے آگے بڑھ کر دونوں کے ہاتھ علیحدہ کر دیئے اور بڑی نرمی، ملائمت اور شائستگی سے شہزادے کے چہرے پر لپٹا ہوا اسکارف ہٹانے لگا۔

اسکارف ہٹتے ہی شہزادہ تیزی سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھنے کے لئے پلٹا اور یہ دیکھ کر اسے انتہائی حیرت ہوئی کہ دور دور تک کسی لڑکی کا وجود نہیں تھا۔ وہ گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ بادشاہ سے پوچھے تو کیا پوچھے؟ احمقوں کی طرح اس کی نگاہیں ایک طرف جمی کی جمی رہ گئیں۔

بادشاہ پُر وقار اور پُر تمکنت انداز میں تخت سے اٹھا، نیچے اترا شہزادے کے پاس آیا اور اس کے شانے کو تھپک کر بولا "شادی مبارک ہو، نوجوان شہزادے!"

شہزادے نے تھوک نگل کر پوچھا "میری بیوی کہاں ہے؟"

"یہیں ہے۔" بادشاہ نے کہا اور غلاموں کی طرف گھوم کر اشارہ کیا۔ ہال کی ایک سمت میں پڑے ہوئے زربفت و کمخواب کے بھاری بھاری پردے ہٹا دیئے گئے۔ سامنے بڑے سے چبوترے پر چالیس حسین ترین پُر شباب لڑکیوں کی ایک قطار موجود تھی۔ سب کی سب زرق برق لباس سے آراستہ تھیں اور ان میں یہ امتیاز کرنا کہ کون سب سے زیادہ حسین و دلکش ہے۔ آسان نہیں تھا۔

بادشاہ نے قطار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شہزادے سے کہا "اس قطار میں تمہاری بیوی موجود ہے۔ آگے بڑھو اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قطار سے باہر نکال لاؤ۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے شاہی محل کی کسی غیر شادی شدہ لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی جسارت کی تو اسے تمہاری گستاخی پر محمول کیا جائے گا اور اس گستاخی کی سزا میں فوری طور پر تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ چلو، قدم اٹھاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور اسے اپنی طرف کھینچ لو۔ حجلۂ عروسی تم دونوں کا بے چینی سے منتظر ہے۔"

شہزادہ حسین و جمیل پُر شباب لڑکیوں کی قطار کی جانب اس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ لڑکیوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا لیکن ان میں سے کوئی لڑکی بھی ایسی نہیں تھی، جسے وہ یقینی طور پر اپنی بیوی کہہ سکتا۔ ہر لڑکی کے پاس وہ رکتا، اس کے حُسن و جوانی پر مبہوت ہو کر دل ہی دل میں آرزو کرتا کہ وہی لڑکی اس کی بیوی ہو۔ چالیس کی چالیس لڑکیوں کے بارے میں اس نے یہی آرزو کی۔ ان سب کے ایک جیسے لباس تھے۔ ان کے قریب آنے پر سبھی نے بڑی بڑی مسحور نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور فوراً ہی شرما کر نظریں نیچی کر لی تھیں۔ سبھی کے ایک ہی جیسے مخروطی ہاتھ تھے۔ کسی کو بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی نے انگلی اٹھا کر اسے ہلکا سا اشارہ تک نہیں کیا تھا۔

"اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے نوجوان شہزادے؟" بادشاہ نے کہا "تمہارے بجائے اگر آج میری اس حسینہ سے شادی ہوئی ہوتی، جسے تمہاری بیوی بنایا گیا ہے تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔"

بوکھلایا ہوا شہزادہ قطار کے آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔ اس مرتبہ قطار میں کھڑی ہوئی دو لڑکیوں کے رویّے میں بہت ہی معمولی سی تبدیلی ہوئی حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک لڑکی شہزادے کی طرف دیکھ کر مسکرائی جبکہ ایک اور حسین ترین لڑکی نے شہزادے کی طرف دیکھ کر حقارت کا اظہار کیا۔

'مجھے یقین ہے کہ انہی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے۔' شہزادے نے سوچا 'لیکن کس لڑکی کے ساتھ؟ ایک مسکرائی تھی اور ہر نئی نویلی بیوی شوہر کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر مسکراتی ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ میری بیوی نہ ہو اور صرف یہ سوچ کر مسکرائی ہو کہ وہ میری بے وقت موت کا باعث نہیں بنی۔ رہی دوسری لڑکی تو صاف ظاہر ہے کہ جب کوئی نئی نویلی دلہن یہ دیکھے کہ اس کا شوہر اسے نظر انداز کر رہا ہے تو اس کے چہرے پر حقارت کے آثار ابھر آنا لازمی ہیں۔ وہ یقیناً دل ہی دل میں کہے گی "ارے میں ہی تمہاری بیوی ہوں۔ تم مجھے سن چکے ہو۔ مجھے محسوس کر چکے ہو، پھر بھی تم مجھے نہیں پہچانتے کتنے افسوس کی بات ہے۔" مگر دوسری طرف اس کی حقارت انگیز نظروں کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی شریف اور نوجوان لڑکی کسی غیر مرد کو اپنی سمت بھوکی نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ یہی کہے گی "میرے قریب مت آؤ، میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ تمہاری بیوی تو ادھر، سات لڑکیوں کے بعد کھڑی ہے۔ اس کے پاس جاؤ۔"

شہزادے کے خیالات نے ایک بار پھر پلٹا کھایا 'میرا چہرہ اسکارف سے ڈھکا ہوا تھا۔ شادی کے وقت میری بیوی نے مجھے صحیح طور پر نہیں دیکھا اب جبکہ اس نے میرا خوبصورت چہرہ دیکھا ہو گا تو خوشی کے باعث اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی ہو گی۔ رہی دوسری لڑکی تو اس کی حقارت آمیز نظروں کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ کوئی بھی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کسی دوسری لڑکی کے شوہر کو پسند نہیں کر سکتی۔ مسکراہٹ سے دعوت کا اظہار ہوتا ہے اور حقارت سے عداوت کا۔ مسکراہٹ میں کشش ہے اور حقارت میں نفرت!'

"شہزادے!" بادشاہ نے چلا کر کہا "میں تمہیں دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس عرصے میں تم ہماری عطا کی ہوئی لڑکی کو پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوئے تو تھوڑی ہی دیر میں وہ بیوہ ہو جائے گی۔"

اور اسی وقت، وہ لحیم شحیم شخص جو اپنے آپ کو موت کا فرشتہ کہتا تھا، تلوار لہراتا ہوا شہزادے کے پاس پہنچ گیا اور ادب سے سر جھکا کر بولا "میں یہیں موجود ہوں، شہزادہ عالی وقار!"

شہزادے نے ایک لمحہ بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ وہ پھرتی سے آگے بڑھا اور ایک لڑکی کو قطار سے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

مسرت کے گھنٹے بجنے لگے۔ محل میں موجود سارے افراد کی زبانوں سے واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ بادشاہ نے بڑھ کر شہزادے کو مبارکباد دی کہ اس نے اپنی قانونی بیوی کو حاصل کر لیا تھا اور کسی دوسری دوشیزہ کی شان میں گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔

یہ کہانی سنا کر دربار کے اعلیٰ عہدیدار نے اراکینِ وفد سے کہا "معزز اور مکرم اجنبی مہمانو! اب تم آپس میں مشورہ کر کے یہ بتاؤ کہ شہزادے نے کس لڑکی کو اپنی طرف کھینچا تھا؟ اسے جو شہزادے کو دیکھ کر مسکرائی تھی یا اسے جس نے حقارت کا اظہار کیا تھا؟ اگر تم نے درست جواب دے دیا تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ کھلے ہوئے دروازے سے کون باہر نکلا تھا۔ لڑکی یا شیر؟"

جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ ان کے مطابق وفد کے پانچوں افراد ابھی تک کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔

قارئین کرام! آپ نے دونوں کہانیاں پڑھ لیں۔ یقیناً آپ چکرائے ہوئے ہوں گے۔ "شیر یا عورت" کی بے مثال کامیابی کے بعد فرینک اسٹاک ٹن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ کھانے کے بعد اسٹاک ٹن کے سامنے آئسکریم کے دو پیالے رکھے گئے۔ ایک پیالے میں آئسکریم سے شیر بنایا گیا تھا، دوسرے پیالے میں ایک حسین عورت کھڑی تھی۔ حاضرین سانس روکے، تمام تر توجہ سے اسٹاک ٹن کو دیکھ رہے تھے کہ وہ کس چیز کا انتخاب کرتے ہیں، شیر یا عورت؟ اسٹاک ٹن نے شیر والا پیالہ نزدیک کیا اور آئسکریم کھانے لگے۔ ان حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی جنہوں نے شیر پر شرط لگائی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان کے منہ لٹک گئے، جب اسٹاک ٹن نے پہلا پیالہ ایک طرف کر کے دوسرا پیالہ صاف کرنا شروع کر دیا۔

قارئین! میں فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ دروازہ کھلنے پر کیا برآمد ہوا تھا، شیر یا عورت؟ شہزادے نے کس عورت کا انتخاب کیا تھا؟ کہیے کیا خیال ہے آپ کا؟ ——— اقبال پاریکھ

ناہید سلطانہ اختر کے سحر طراز قلم سے ایک حرماں نصیب لڑکی کی دلگداز داستان پڑھیے۔ اس پُرآشوب دور میں صنفِ نازک کو جو صدمات نت نئے مصائب اور روحانی اذیتیں اٹھانا پڑتی ہیں اس کی عکاسی ناہید نے بھرپور انداز میں کی ہے۔ ان کی آتش بیانی میں بے پناہ سوز و گداز ہے جسے آپ ضرور محسوس کریں گے۔ اطراف گرد و پیش کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کہانی اسی مشاہدے پر مبنی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی جاں گداز سچی کہانی ہے جسے ناہید نے کمال خوبصورتی سے لکھا ہے۔ کہانی کے بارے میں ہم آپ کی آراء کے منتظر ہیں گے ———— اقبال پاریکھ

ناہید سلطانہ اختر

مُفلسی

میں ملفوف دُبلی پتلی سانولی سلونی تیکھے نقوش والی نسیمہ حالات کا کوڑا کھا کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکلی تو اس کا دل کانپ رہا تھا۔ ابا یوں تو کئی برسوں سے خون تھوک رہے تھے لیکن گزشتہ ڈیڑھ برس سے تو وہ پلنگ سے لگ کر رہ گئے تھے۔ یہ ڈیڑھ برس ان کے لئے ایسی ڈیڑھ صدیاں تھیں جن کا گزرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ تمام راہیں مسدود ہو گئیں تو مجبوراً نسیمہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا۔

میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ وہ دھکے کھاتی پھری۔ پاؤں دھوپ میں اٹ اٹ گئے۔ کئی چھالے پڑے اور پھوٹے۔ اکلوتی چپل کی ساری چولیں ہل گئیں مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ یہ بات نہیں کہ وہ فولاد کی بنی تھی۔ ہمت تو شاید وہ اوّل روز

ہی ہار رہی تھی جب وہ دوہری نقاب گرائے سڑک پار کر رہی تھی اور ایک شہدہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہنی مار کر منمناہٹ میں یہ کہتا گزر گیا تھا۔

"چل رہی ہو میری جان۔"

یہ رکیک جملہ میدانِ عمل میں نووارد نسیمہ کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا وہ اس امر سے ناآشنا تھی کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ آنسو نقاب کے اندر ہی اٹک کر رہ گئے۔ دبی دبی سی ایک آہ اس کے سینے میں مچل کر رہ گئی۔ نقاب کے اندر ہی اس نے دور آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے جس کی نیلاہٹ نقاب کی سیاہی میں گھل مل کر اس کے اپنے حالات کی طرح میلی ہو گئی تھی، سہم کر گھر واپس لوٹنے کا ارادہ کیا مگر اس کے تصور میں منو کا چہرہ ابھر آیا یوں چٹنی روٹی تو معمول بن ہی گئی تھی مگر گزری شام مکمل فاقہ رہا تھا۔

اماں منو کو تھپک تھپک کر عاجز آ گئیں۔ مگر پیٹ کی بجھتی تب ہی ہو تو نیند بھی آنکھوں میں آتے ہوئے اچھی لگتی ہے پہلے اس نے آنسو بہا کر اماں کو ڈرانے کی کوشش کی مگر آنسوؤں کے بدلے بھی چھ برس کی جان کو روٹی نہ ملی تو اس نے مچلنا شروع کر دیا۔ یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا تو اس نے منہ بسورتے ہوئے التجا کی۔

"اماں بس ایک روٹی دے دو، دو نہیں مانگوں گا۔"

اس کی اس التجا پر اماں کے ساتھ نسیمہ بھی ماہیِ بے آب کی مانند تڑپ کر رہ گئی۔ کیسا ستم تھا قسمت کا! تینوں بہنوں کا وہ اکلوتا بھائی جو نہ جانے کتنی منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا ایک روکھی روٹی کو ترس رہا تھا اور اس سے بڑی دونوں بہنیں گھٹنوں میں منہ دبائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ نسیمہ ان تینوں سے خاصی بڑی تھی اس میں اور اس سے چھوٹی شمیمہ میں ایک نہ دو پورے گیارہ برس کا فرق تھا اور اس وقت جبکہ اس کا دلارا بھائی ایک روٹی کے لئے بلک رہا تھا وہ کھلے آنگن میں پڑے جھلنگے پلنگ

میں دھنسی اپنے آسمان پر نگاہیں جمائے سوچتی رہی روٹی کہاں سے لائے؟ اس وقت اسے ان گداگروں پر رشک آرہا تھا جو شرافت و نجابت کی قید و بند سے یکسر بے پرواہ اور آزاد ہوتے ہیں۔ ابا اگرچہ معمولی کلرک تھے لیکن کتنی خواہش تھی انہیں کہ ان کی لاڈلی نسیمہ بی اے پاس کرلے مگر اس وقت ابا کی وہ چہیتی بیٹی جسے میٹرک کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کرکے گھر بیٹھنا پڑا تھا اپنے دلاسے بھائی کے ایک روٹی کے لئے بلکنے پر انتہائی دل گرفتہ ہوکر سوچ رہی تھی ایک روٹی کہاں سے آئے؟

روٹی تو خیر نہ آسکی البتہ منو کی آنکھوں میں نیند اتر آئی شمیمہ اور نعیمہ جو منو کا انجام دیکھ چکی تھیں، خود بھی کونوں کھدروں میں دبک کر پڑ رہیں۔ نسیمہ نے طے کرلیا خالہ کچھ کہیں ماما یاں کتنی ہی باتیں بنائیں اماں کتنا ہی منع کریں، کل وہ نوکری کی تلاش میں نکلے گی۔

اماں نے سنا تو انہیں یہ بات بڑی عجیب سی لگی انہیں پتہ تھا اپنے پرایوں کی زبانیں روکنی مشکل ہوجائیں گی۔ مگر نسیمہ پچھلی رات منو کی حالت یاد کرکے روئی تو اماں بھی بے بس ہوگئیں۔ نسیمہ گھر سے نکلی تو اس کے پاس میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے سوا اور کچھ بھی تو نہ تھا۔ پہلے ہی دن اسے باہر نکل کر اندازہ ہوا کہ عورت کا گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں پہلے ہی رکیک جملے نے اس کی ہمت اور حوصلے کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کرنا چاہا، لیکن اوّلین ارضی مسئلہ بھوک پوری شدّ و مد کے ساتھ اس کے سامنے آموجود ہوا اور پھر منو کی بھوک تو اس سے شاید بھیک بھی منگوالیتی۔ صبح سے شام تک وہ ماری ماری پھرتی رہی ٹانگیں شل ہوگئیں۔ گرد سے پھٹنے لگی ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں ناکام و نا شاد جب وہ گھر واپس آئی تو منو نے فاقے کا ڈیرہ ڈیرہ تھا۔ منو نڈھال پڑا تھا محلے میں آج تک کسی سے مانگے تانگے نہ ہوئی تھی بھرم کی ماری اماں کسی بیوہ کی طرح سوگوار بیٹھی ملیں۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو نسیمہ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا جس سے اماں بھی اختلاف نہ کرسکیں۔ وہ اسٹی برتن اور ہاتھ تک اماں کو سے لکھے کے بڑے بھیلے میں تانبے کی دو دیگچیاں اور ایک مراد آبادی لوٹا ڈال چکی تھیں۔ شمیمہ کو ساتھ لے کر نسیمہ بازار گئی اور اونے پونے برتن بیچ کر واپسی پر اسی تھیلے میں آٹا لیتی آئی۔ یوں اگلے چند روز کا آسرا ہوگیا مگر نسیمہ نے اس عارضی آسرے پر قناعت کرکے بیٹھ جانے کی بجائے تگ و دو جاری رکھی کئی ہفتے گھر کے برتن بیچ کر گزر بسر کرتے رہے اور نسیمہ نوکری کی تلاش میں چل چل کر تھک گئی۔

بالآخر اسے ایک فیکٹری میں جہاں بہت سی عورتیں یومیہ اُجرت پر ملازم تھیں نوکری مل گئی۔ نسیمہ کو یوں لگا جیسے دو جہان کا خزانہ مل گیا ہو اماں نے جو اس کے پاؤں لڑکھڑاتے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتی تھیں چین کا سانس لیا ابا نے سنا تو یوں کراہے جیسے اتنی شدید تکلیف انہیں اس سے پہلے کبھی نہ پہنچی ہو۔

روز و شب کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔ محنت کشی اور مشقت کا یہ دور نسیمہ کے لئے قدرے طمانیت کا دور تھا۔ ابا بدستور بیمار تھے لیکن روٹی کا مسئلہ کسی حد تک حل ہوگیا تھا۔ صبح سے شام تک پیشانی پر ایک شکن اور زبان پر ایک حرفِ شکایت لائے بغیر وہ کام میں مصروف رہتی۔

پانچ چھ ماہ گزر گئے۔

چھ ماہ بعد اس کی اطمینان بخش کارکردگی اور تعلیم کے پیشِ نظر اسے سپروائزر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ تنخواہ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی وہ پندرہ دن پہلی شفٹ اور پندرہ دن رات کی شفٹ میں کام کرنے کی بھی پابند ہوگئی۔ ابا کی طبیعت دن بدن خراب تر ہوتی گئی۔ نسیمہ فیکٹری سے واپس ہوتی تو اماں یوں اس کی منتظر ملتیں جیسے وہ کبھی ابا کی ہوا کرتی تھیں۔ منو آتے ہی آپا آپا کرکے چمٹ جاتا اور وہ اپنے تھیلے سے منو کو وہ چھوٹی سی کاغذی تھیلی نکال کر تھما دیتی جس میں اس کے لئے راستے سے خریدی ہوئی کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز موجود ہوتی تھی۔ اماں نسیمہ کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتیں۔ چھٹی والے دن جب بچے صبح ہی صبح اٹھ کر شور مچانے کی کوشش کرتے تو اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شی شی کرکے انہیں گھُرکی لگا کر یوں خاموش ہو جانے کی ہدایت کرتیں جیسے گھر کے مرد کی نیند میں خلل پڑ جانے کا خوف ہو بلاشبہ وہ اس چھوٹے سے گھر کا وہ ستون بن گئی تھی جس پر اس کی بقا کا انحصار تھا۔

حسبِ روایت اپنے پرایوں سبھی نے نسیمہ کے نوکری کرنے پر باتیں بنائیں ناکیں سکیڑیں لیکن نسیمہ کو اب کسی بات کی پرواہ نہ تھی بلکہ اماں کو وہ اکثر سمجھاتی کہ کسی عزیز رشتہ دار یا ملنے جلنے والوں کی باتوں پر کڑھنے اور دل جلانے کی ضرورت نہیں دھیرے دھیرے اماں بھی عیب جوئیوں کی باتیں سننے اور سن کر ٹالنے کی عادی ہوگئیں پھر وقت کے ساتھ ساتھ شعلوں کی مانند لپکنے والی زبانیں بھی سہم گئیں۔

موسمِ سرما گزرا اور گرمیاں آئیں تو فیکٹری میں کام بڑھ گیا عید قریب تھی بیشتر کام کرنے والی عورتوں نے بخوشی اوور ٹائم

کرنا شروع کردیا۔ خود نسیمہ کی سب سے بڑی ضرورت پیسہ تھا چنانچہ وہ بھی اکثر و بیشتر اوور ٹائم کرنے لگی۔

ایک رات جب چھ گھنٹے اوور ٹائم لگانے کے بعد وہ فیکٹری سے باہر نکلی تو اس نے محسوس کیا خاصی رات ہوچکی تھی۔ جن دنوں نائٹ شفٹ ہوتی وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ بجے تک فیکٹری پہنچ جایا کرتی تھی اور پھر پوری رات فیکٹری ہی میں گزارتی تھی لیکن اتنی رات گئے سنسان اور نیم تاریک راستوں پر نکلنے کا یہ پہلا اتفاق تھا کچے راستے سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچی تو اس نے محسوس کیا سڑک کے دونوں اطراف لیمپ پوسٹ روشن تھے مگر سڑک ہیبت ناک حد تک خاموش تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی بے تحاشہ دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرتی وہ بس اسٹاپ کی جانب رواں تھی کہ اچانک عقب سے آواز آئی۔

"سنیئے!"

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا نقاب اس نے پلٹ رکھی تھی مگر اتنی ہمت نہ ہوئی کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ سکتی۔ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے اور بھی لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیئے۔

"گھبرائیے نہیں، میں آپ کی برابر والی فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔" ایک آواز اسے اپنے بہت ہی قریب سنائی دی۔ وہ جہاں کی تہاں سہم گئی۔ قریبی لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں اس نے سر اٹھا کر دیکھا بڑی بڑی آنکھوں اور گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان اس کے روبرو تھا۔

"کافی دیر ہوچکی ہے۔ آپ مناسب سمجھیں تو اسٹاپ تک میرے ہمراہ چلیں میں بھی وہیں جارہا ہوں۔"

نسیمہ کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے کیا کرے اس کا دل اس ناگہانی افتاد سے بُری طرح کانپ رہا تھا بالآخر اس نے خود ہی نسیمہ کی مشکل آسان کردی اور بولا۔

"آئیے چلیں۔"

نسیمہ نے سہمی ہوئی آنکھوں سے مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"آپ اطمینان رکھیں، میں شریف آدمی ہوں دراصل آج کل زمانہ بڑا خراب ہے میں نہیں چاہتا رات کے وقت آپ کو تنہا دیکھ کر کوئی شہدہ الٹی سیدھی حرکت کرے۔"

یہ بات اس نے کچھ اس طرح کہی کہ نسیمہ کو اس کی شرافت کا اعتبار کرنا ہی پڑا اور دھیرے سے بولی۔

"بڑی مہربانی آپ کی۔"

دونوں ساتھ چلنے لگے مگر درمیان میں مناسب فاصلہ حائل رہا۔

"آپ تو غالباً گولیمار جائیں گی؟" نوجوان نے پوچھا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" نسیمہ کا لہجہ اس کی گھبراہٹ کو پنہاں نہ رکھ سکا۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس جواب نے اس کی تشفّی کردی کہ "میں نے آپ کو اکثر گولیمار کے اسٹاپ سے بس میں سوار ہوتے دیکھا ہے۔"

"آپ...... آپ کہاں رہتے ہیں؟" نسیمہ نے سوال کیا۔

"لالو کھیت، سندھی ہوٹل!" جواب ملا۔

بس اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے نسیمہ اس کے بارے میں اتنا جان چکی تھی کہ اس کا نام اصغر تھا اور وہ نان میٹرک تھا اس کی بیوہ ماں اور دو بہنیں پنجاب کے کسی دور افتادہ گاؤں میں مقیم تھیں۔ اور وہ ملازمت کی تلاش میں شہر آنے کے بعد گزشتہ تین ماہ سے نسیمہ کی فیکٹری سے ملحق اسپننگ مل میں کام کر رہا تھا۔ راستے بھر اس نے نسیمہ سے جس انداز میں باتیں کیں ان سے نسیمہ خاصی متاثر ہوئی تھی اور فیکٹری سے بس اسٹاپ تک کا وہ طویل فاصلہ جو اسے ہراساں کئے دے رہا تھا بڑے اطمینان سے کٹ گیا اپنی گفتگو کے دوران وہ بار بار کہتا رہا زمانہ بڑا خراب ہے اور لڑکیوں کے لئے گھر سے باہر نکل کر تلاشِ معاش میں سرگرداں رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔

پھر بس اسٹاپ آگیا۔ وہ دونوں خاصی دیر ساتھ کھڑے بس کا انتظار کرتے رہے بس اسٹاپ پر چند لوگ اور بھی تھے لیکن سب کے سب مرد۔ ایسے میں نسیمہ کو اصغر کا ساتھ بڑا غنیمت محسوس ہوا وہ بار بار سوچتی رہی کہ اس وقت اصغر ساتھ نہ ہوتا تو اس بس اسٹاف پر اس کے لئے تنہا اتنے مردوں کے ساتھ کھڑے رہنا کیسی کٹھن آزمائش ہوتی دور سے بس آتی نظر آئی تو اصغر نے سرگوشی میں کہا۔

"آپ ذرا سویرے فیکٹری سے نکلنے کی کوشش کیا کریں۔"

"کام زیادہ ہے اس لئے......"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......" اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔ مگر نسیمہ کی طرح اس کی بات بھی ادھوری رہ گئی۔ اور بس اسٹاپ پر آپہنچی۔

"شکریہ" نسیمہ نے دھیرے سے کہا اور بس میں چڑھ گئی۔ زنانہ حصے میں ایک مسافر عورت بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ نسیمہ زنانہ اور مردانہ حصوں کو علیحدہ کرنے والی جالی سے ٹیک

لگا کر بیٹھ گئی۔

بس چل پڑی۔

تین چار اسٹاپ گزرنے کے بعد کنڈیکٹر نے زنانہ حصے کی طرف جالیوں کے اوپر سے ہاتھ بڑھایا تو نسیمہ نے ٹکٹ کے پیسے نکال کر کنڈیکٹر کی جانب بڑھا دیئے۔

"ٹکٹ ہو گیا ہے ان کا۔" اس کے عقب سے جانی پہچانی آواز سنائی دی بلاشبہ وہ اصغر ہی تھا۔ کنڈیکٹر اونگھتی ہوئی عورت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

بقیہ راستہ نسیمہ نے اصغر کے شریفانہ رویے کی بابت سوچتے ہوئے گزارا۔ بس جانے کتنے اسٹاپ پیچھے چھوڑ آئی یہاں تک کہ گولیمار کا اسٹاپ آگیا۔ بس رکی اور وہ نیچے اتری، تو چند ثانیوں بعد ہی اصغر اس کے سامنے آموجود ہوا۔

"آپ........؟"

"چلیئے آپ کو آپ کے دروازے تک چھوڑ آؤں۔"

"میں........ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں، رات کافی تاریک ہے، آپ کہاں تاریک گلیوں سے گزریں گی؟"

سوچنے سمجھنے کی مہلت ہوتی تو شاید وہ اصغر سے پوچھتی، تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے تاریک گلیوں سے گزرنا ہوگا مگر فوری طور پر وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مصر رہا۔

"بڑی مہربانی آپ کی، اب میں خود چلی جاؤں گی یہ گلیاں میری اپنی ہیں۔"

"گویا آپ کی گلیوں میں غیروں کا داخلہ ممنوع ہے!" اصغر کا لہجہ اسے پہلی بار شوخ محسوس ہوا اس کے اصرار پر اسے کہنا پڑا۔

"محلے والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو........ اور پھر اماں یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوں گی انہوں نے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچیں گی ــــ؟"

"ٹھیک........ اچھی بات تو پھر خدا حافظ!"

"شکریہ!" نسیمہ نے پھر کہا۔

وہ بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا اور نسیمہ ان جانے پہچانے راستوں پر چل پڑی جو اس کے اپنے تھے لیکن نیم تاریک اور تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک پل کو بھی اس کا خیال ذہن سے نہ جھٹک سکی گھر پہنچی تو اماں اس کی منتظر تھیں۔

"آج اتنی دیر ــــ؟"

"اماں کام زیادہ تھا اس لئے دیر ہو گئی۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ اور برقعے کے بٹن کھولتی صحن سے کمرے میں آ گئی کھانا کھا کر وہ بستر پر لیٹی تو بدن تھکان سے چور تھا۔ اماں سوچتی رہیں میری بچی پر کیسا وقت پڑ گیا اور نسیمہ کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔

'کیسا شریف آدمی تھا؟'

اس سے اپنی پہلی ملاقات کو ابھی وہ ذہن سے پورے طور پر محو بھی نہ کر پائی تھی کہ وہ ایک بار پھر ٹکرا گیا اس بار رات کی تاریکی کی بجائے دن کے اجالے ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ نسیمہ فیکٹری سے گھر نہیں بلکہ گھر سے فیکٹری جا رہی تھی جوں ہی وہ سڑک عبور کر کے فیکٹری کی جانب جانے والے راستے پر مڑی، عقب سے آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم!"

"نسیمہ نے کن انکھیوں سے دیکھا اور چونک گئی یہ تو وہی تھا ــــ

بلا ارادہ نسیمہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"خدا کا شکر ہے!"

"بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔"

"جی ہاں ــــ" یہ کہتے ہوئے نسیمہ نے نقاب گرا لی وہ کسی صورت یہ نہیں چاہتی تھی کہ دن کے اجالوں میں کسی نوجوان کے ہمراہ چلتے اور اس سے باتیں کرتے اس کا کوئی شناسا دیکھ لے

"ایک بات بتائیں گی۔ نوکری آپ کی مجبوری ہے یا فیشن سمجھ کر کر رہی ہیں؟" اصغر نے بڑا عجیب سا سوال کیا۔

"مجبوری!" وہ بلا تردد بولی۔

"فیکٹری والے دیتے کیا ہیں؟"

"گزارا ہو جاتا ہے۔"

"معاف کیجئے! ذاتی سا سوال ہے والد صاحب حیات ہیں آپ کے؟"

"بہت عرصے سے بیمار ہیں۔"

"کوئی بڑا بھائی؟"

"جی نہیں ــــ بہت چھوٹا ہے۔"

اصغر نے ایک گہری سانس لی ڈیڑھ دو منٹ کا بقیہ راستہ خاموشی سے کٹا اپنی فیکٹری کا رخ کرنے سے قبل اس نے آہستہ سے کہا۔

"کبھی آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

نسیمہ کچھ نہیں بولی۔ اصغر اپنی فیکٹری کے صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اور نسیمہ کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجتی رہیں۔

کبھی آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے!

کبھی آپ سے بہت سی........!

کبھی آپ سے........!

کیسا سحر تھا اس جملے میں؟

پھر بہت سے دن گزر گئے!

اور پھر اچانک وہ دونوں ٹکرا گئے۔ ساتھ قدم اٹھتے رہے باتیں ہوتی رہیں پھر اپنی اپنی راہ پر چل پڑے۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز نسیمہ نے کنڈیکٹر کو ٹکٹ کے پیسے دیئے تو کنڈیکٹر نے کہا پیچھے ٹکٹ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ آئے دن کا معمول بن گیا بس اسٹاپ سے فیکٹری تک اور فیکٹری سے بس اسٹاپ تک راستہ اکٹھے طے ہوتا رہا۔ نسیمہ نے بارہا اسے ٹکٹ لینے سے منع کیا اور ہر بار اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، کیا فرق پڑتا ہے!"

نسیمہ فیکٹری سے نکلتی تو وہ یوں اس سے آملتا جیسے اسی کا منتظر تھا۔.. خود نسیمہ نے بھی فیکٹری سے واپسی پر اس کا راستے میں مل جانا ایک معمول سمجھ لیا اور جس روز وہ نظر نہ آتا نسیمہ کی نگاہیں نقاب کے پیچھے سے اسے ڈھونڈتی رہتیں۔ نسیمہ کے ساتھیوں میں چرچا ہونے لگا مگر نسیمہ ان چرچوں سے بے نیاز اصغر کے ساتھ آتی جاتی اور باتیں کرتی رہی۔

دو ڈھائی ماہ کے مختصر عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی قریبی دوستوں کی طرح بہت کچھ جان چکے تھے نسیمہ اس سے بلا تکلف فیکٹری کے قصوں سے لے کر ابا کی بیماری اور منو کی شرارتوں تک کا احوال بیان کرتی اور وہ اسے اپنی دور بیٹھی ماں اور بہنوں سے اس حد تک ــــ متعارف کرا چکا تھا کہ شاہدہ اور رشیدہ اور ماں جی اسے اپنے ہی کنبے کے افراد محسوس ہوتے اصغر اسے ماں کی طرف سے آنے والے خطوں کی تفصیل سناتا اور نسیمہ گھر میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی بات اصغر کو سنانے کے لئے سنبھال کر رکھتی۔ اسے یوں لگتا جیسے جہان بھر میں اس کا سب سے بڑا ہمدرد اور غمگسار اصغر ہی تو ہے جو ابا کی دن بدن بگڑتی ہوئی حالت کا سن کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا تو منو کی شرارتوں کے قصے سن کر مسکرائے جاتا۔

رفتہ رفتہ اصغر اس سے ایسی باتیں بھی کرنے لگا جن کا محور صرف اور صرف وہی ہوتی۔ فاصلے گھٹے قربتیں بڑھیں اور قربتوں نے اس لطیف جذبے کا روپ دھار لیا جسے محبت کہتے ہیں۔

نسیمہ حالات کی ماری مصائب کا مقابلہ کرتی ہوئی ایک کمزور سی لڑکی تھی لیکن محبت نے دل میں گھر کیا تو اسے اپنے کمزور جسم میں انوکھی توانائیاں محسوس ہونے لگیں ایسی توانائیاں جن پر نہ اس کی ساتھیوں کی عجیب نگاہوں کا کوئی اثر تھا، نہ زمانے کا خوف۔ بے خطر، نڈر اور بے باک ہو کر وہ اصغر کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ اب وہ وقت گھر میں کتنا گراں گزرتا۔ چھٹی کا دن پہاڑ بن کر گزرتا وہ چاہتی بس اسٹاپ اور فیکٹری کا درمیانی راستہ اتنا لمبا ہو جائے کہ وہ تمام عمر اصغر کے ساتھ باتیں کرتی چلتی رہے عمر تمام ہو جائے۔ اور راستہ تمام نہ ہو۔ غیر شعوری طور پر اس کے چہرے پر بکھری مدقوق زردی نے گلابوں کی گلابی سی رنگت چرا لی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خمار اور مستی کے ڈورے دوڑنے لگے۔ لبوں پر بکھری موت کی سی خاموشی اور چہرے پر چھائے حزن و ملال نے خمار آلود مسکان کا روپ دھار لیا اپنا وجود اسے ہواؤں کے دوش پر اڑتا محسوس ہونے لگا رات آتی تو ان گنت سہانے سپنے اس کی آنکھوں میں سمٹ آتے صبح بیدار ہوتی تو انگ انگ سرشار ہوتا وہ دنیا جس میں ان دنوں وہ رہ رہی تھی بلاشبہ مستی اور لطافت میں رچی بسی تھی اصغر نے بارہا اس سے اس کے گھر چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن وہ ہر بار ٹال گئی تھی ایک روز جب وہ سر شام واپس لوٹ رہے تھے اصغر نے کسی قدر خفگی سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے تم چاہتی ہی نہیں کہ میں تمہارے والدین سے کوئی بات کروں۔"

"یہ بات نہیں ہے اصغر تمہیں معلوم ہے میرے گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں ابا بستر پر پڑے ہیں چھوٹے چھوٹے بہن بھائی اور اماں کا کوئی سہارا نہیں سوائے اللہ کے، میں نہیں چاہتی کہ اس کٹھن منزل میں........ اماں کو کسی طرح بھی یہ احساس ہو کہ مجھے ان سے زیادہ اپنی شادی کی فکر ہے۔"

"تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت؟ بات تو میں کروں گا۔"

"بے شک........ مگر بات تم کرو یا کسی کی وساطت سے کروائی جائے اماں بچی تو نہیں کہ اصل قصہ نہ سمجھ سکیں گی۔"

"پھر؟" اصغر نے بے تابی سے کہا۔

"پھر کیا........؟ بس مناسب وقت کا انتظار کرو۔"

"ناممکن........ اب انتظار قیامت ہے بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ایک لڑکی جسے میں اپنی روح کی گہرائیوں اور سچائیوں سے پیار کرتا ہوں اسی شہر میں ہو روز مجھ سے ملے اور اس کے باوجود جب میں گھر واپس لوٹوں تو اندھیرا میرا استقبال کرے........ نسیمہ اب خواہش ہونے لگی ہے کہ جب میں گھر واپس لوٹوں تو تم ہنستی مسکراتی میرے گھر میں

روشنیوں کے ساتھ میرا استقبال کرو۔"

"حالات ذرا سازگار ہو جائیں۔" نسیمہ نے رسانیت سے کہا۔

"حالات کبھی سازگار نہیں ہوں گے تم کیا سمجھتی ہو تمہارے ابا صحت یاب ہو جائیں گے؟"

"اصغر......!" نسیمہ نے خفگی سے کہا۔

"معاف کرنا مجھے افسوس ہے۔ مگر تم نہیں جانتیں نسیمہ محبت بڑی خودغرض ہوتی ہے۔"

"اب اتنی بھی خودغرضی مت دکھاؤ خدا نے چاہا تو ابا کی طبیعت ضرور سنبھل جائے گی۔"

"مگر تمہارے ابا کی طبیعت سنبھلنے تک میرا کام تمام ہو جائے گا۔"

"خدا نہ کرے۔" نسیمہ نے ہول کر کہا۔

نومبر میں پھر فیکٹری میں کام بڑھ گیا لڑکیاں اور عورتیں اوور ٹائم کرنے لگیں اب نسیمہ کو کتنی بھی دیر ہو جاتی اسے قطعًا کوئی فکر نہ ہوتی بلکہ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ رات خوب پھیل جائے اصغر فیکٹری سے باہر اس کا منتظر ہوتا اب رات کی تاریکی میں جب وہ اکٹھے بس اسٹاپ کی طرف رواں ہوتے تو اصغر چپکے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا اور نسیمہ خود کو ہواؤں میں ڈولتا محسوس کرتی۔

انہی دنوں ایک رات جب نسیمہ اصغر کے ساتھ فیکٹری سے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی اس نے پھر اپنا مطالبہ دُہرایا نسیمہ نے انتظار کرنے کا مشورہ دیا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

"خدا کی قسم اب تو گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ جاتا ہوں تو تاریکی منتظر ملتی ہے اور جب روشنی کرتا ہوں تو ہر سمت تم ہی تم نظر آتی ہو۔"

"اسی لئے آپ ڈر جاتے ہیں۔" نسیمہ نے ہنس کر کہا۔

"مذاق میں مت ٹالو، یقین کرو ساری رات تمہارے تصور کے پیچھے لپکتا رہتا ہوں اور تم ہو کہ میرے قریب پہنچنے پر آگے لپک جاتی ہو۔"

"خوب!" نسیمہ ہنس دی۔

اگلی رات نسیمہ کو فیکٹری سے قدرے جلدی فراغت ہو گئی باہر نکلی تو اصغر حسبِ معمول اسے اپنا منتظر ملا اس نے راستہ طے کرتے ہوئے پھر اپنا مطالبہ دہرایا اور جب نسیمہ نے ٹالنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔

"اچھا سنو! تم اپنے گھر تو مجھے لے کر جاتی نہیں ہو، مگر میرے گھر چل کر وہاں کی بدحالی تو دیکھ سکتی ہو؟"

"نہیں بھئی!" نسیمہ نے بلا تردد کہا۔

"کیوں ـــ؟"

"کسی نے دیکھ لیا تو ـــ؟"

"تو کیا ہوگا......؟ اور اگر دنیا والوں کا مجھ سے زیادہ ہی خیال ہے تو رات کے وقت چلو۔"

"اونہوں۔" نسیمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"گویا میرے گھر چلنا پسند نہیں تم کو؟"

"ایسے نہیں ـــ" نسیمہ ذومعنی بات کہہ کر مسکرائی۔

"اعتماد نہیں مجھ پر؟"

"ہے بہت زیادہ۔"

"تو پھر ـــ؟"

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اصغر کا اصرار اتنا بڑھا کہ اسے بادلِ نخواستہ ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ لرزتی ٹانگوں سے وہ ایک جرأتِ رندانہ کے ساتھ اصغر کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ گئی۔

رکشہ سرپٹ دوڑتا رہا تھا اور نسیمہ اس شخص کے پہلو میں بیٹھی جس کی شرافت کی وہ آنکھیں بند کر کے قسم کھا سکتی تھی جس کے سپنوں سے اس کی راتیں بھی بھیں انجانا خوف محسوس کر رہی تھی اس کے ذہن میں اب عجیب عجیب خدشے سر اٹھا رہے تھے مگر ہر خدشے کا سر اس جواز کے تحت کہ گزشتہ کئی ماہ سے وہ اس کے ساتھ آ جا رہا تھا اور رات کی تاریکی میں اسے سنسان راستوں پر ملتا رہا تھا ایک بار بھی اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کی تھی۔ وہ آپ ہی آپ کچلتی جا رہی تھی۔

لالوکھیت آ پہنچا۔ رکشہ اب سندھی ہوٹل کو جانے والی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور نسیمہ کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا بالآخر ایک جگہ رکشہ دھچکے سے رک گیا۔ رات ہو رہی تھی۔ پہلے اصغر اترا پھر نسیمہ رکشے والے کو اصغر نے ادائیگی کی اور نسیمہ سے بولا۔

"آؤ ـــ"

اصغر آگے اور نسیمہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک تاریک سی گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے نسیمہ کا ہاتھ تھام لیا اور پھر اچانک ہی چونک کر بولا۔

"ارے! تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں؟"

"اماں پریشان ہوں گی۔" نسیمہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"باتیں مت بناؤ کل تم ساڑھے گیارہ بجے فیکٹری سے نکلی تھیں جبکہ ابھی شاید آٹھ ہی بجے ہوں گے۔"

دلیل معقول تھی نسیمہ احتجاج نہ کر سکی۔ چھوٹی سی گلی سے

گزرتے ہوئے وہ ایک دروازے کے آگے آ رکے۔ اصغر نے جلدی سے قفل کھولا اور نسیمہ کا ہاتھ تھام کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر ہُو کا عالم تھا۔

"دیکھا یہ تاریکی استقبال کرتی ہے تمہارے نام لیوا کا۔"

نسیمہ کا حلق خشک ہو رہا تھا وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے اصغر کے ساتھ یہاں آنے کی ہامی بھر لی تھی۔ تاریکی میں پہلے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر چند ثانیوں کے توقف سے ماچس کی ڈبیا کے اندر تیلیوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ اصغر نے ایک تیلی سلگائی اور مدھم روشنی میں کمرے کا جائزہ لے کر سمت کا تعین کرنے کے بعد وہ ایک کونے میں بڑی میز پر رکھے لیمپ کے نزدیک جا پہنچا۔ بجھتی ہوئی تیلی زمین پر پھینک کر اس نے دوسری تیلی سلگائی۔ اور لیمپ روشن کر دیا۔ تاریک کمرے میں ملگجی روشنی بکھر گئی۔

"بیٹھو!" اصغر نے نسیمہ سے کہا۔

"بس دیکھ لیا گھر آپ کا، اب واپس جاؤں گی۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے آئی ہو جانے ہی کے لئے، مگر کچھ دیر تو ٹھہرو!"

"اماں......" لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اصغر آگے بڑھا اس کے برقعے کے اوپری حصے کا بند کھولا اور پھر نچلے حصے کے بٹن بھی ایک ایک کر کے کھول دیئے اور پھر برقعہ پلنگ کی جانب اچھالتے ہوئے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر پلنگ پر جا بٹھایا۔ نسیمہ کا دل ہی نہیں ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں اب اسے احساس ہو رہا تھا رات کے وقت اصغر کے ساتھ تنہا آ کر اس نے اچھا نہیں کیا تھا لیکن ذرا ہی دیر بعد اسے اصغر کی نیک نیتی پر یقین لانا پڑا۔ جب اس نے نسیمہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ مت......میں کوئی خراب آدمی نہیں۔ خدانخواستہ تمہیں اغوا کر کے نہیں لایا۔ تمہاری رضا سے لایا ہوں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں اپنے آپ کو تمہاری نظروں میں رسوا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔" پھر اس نے پوچھا "کھانا کھاؤ گی؟"

نسیمہ نے نفی میں سر ہلایا مگر اصغر یہ کہتے ہوئے "اماں سید عابد مزہ کھانا ہوگا دراصل میں صبح ہی پکا لیتا ہوں دونوں وقت کا۔" اپنی جگہ سے اٹھا اور اس تنگ کوٹھری نما کمرے کے ایک کونے میں پڑی چھوٹی سی چوکی پر سے روٹی کی چنگیر اور دیگچی میں سے ایک پلیٹ میں سالن نکال لایا اور بہت اصرار کر کے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے کھلانا شروع کر دیا۔

کھانے کے دوران ہی اصغر اچانک اٹھا اور ایک کونے میں موجود طاق کے نزدیک جا کر نسیمہ کے نزدیک واپس آیا تو نسیمہ نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں قرآنِ مجید تھا۔ یہ صورتِ حال نسیمہ کے لئے انتہائی حیران کن تھی اتنی کہ وہ نوالہ چبانا بھول گئی۔ سوالیہ نگاہوں سے اس نے اصغر کی طرف دیکھا تو وہ بے حد سنجیدہ نظر آتا تھا اس نے جزدان کھولا قرآن مجید نکالا اور اسے چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے نسیمہ کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"خدا کی اس پاک کتاب کے سامنے اقرار کرو کہ تم میری ہو؟"

اس غیر متوقع صورتِ حال سے ہچکچا کر وہ پیچھے ہٹی تو اس نے دائیں ہاتھ سے قرآنِ مجید بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے نسیمہ کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"خدا کے حضور اقرار کرو کہ تم میری ہو۔"

"اصغر......" وہ ہراساں ہو رہی تھی۔

"دیکھو نسیمہ یہ شادی بیاہ، نکاح، رخصتی سب دنیا کے دکھاوے کی باتیں ہیں، رسمیں ہیں۔ اصل اہمیت فریقین کے اقرار کی ہے۔ میں خدا کے حضور دل و جان سے تمہیں اپنا بنانے کا اقرار کرتا ہوں تم بھی اقرار کرو کہ......"

"اس طرح کیسے اصغر......؟" نسیمہ جھجکی۔

"اس کا مطلب ہے تمہارا دل صاف نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"یہ بات نہیں ـــ" نسیمہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"تو پھر اس کلامِ پاک کے روبرو اقرار کرو کہ تم دل و جان سے میری ہو۔"

"میں......میں......اقرار کرتی ہوں۔" نسیمہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

اصغر نے قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹا پھر چوم کر نسیمہ کی جانب بڑھا دیا۔ دل کی تمام صداقتوں سمیت نسیمہ نے اپنا سر جھکاتے ہوئے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کرتے ہوئے... قرآنِ مجید کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا۔

"ایک بار پھر ـــ" اصغر نے کہا۔

"میں اقرار کرتی ہوں ـــ" نسیمہ نے پھر کہا۔

اصغر آگے بڑھا قرآنِ مجید کو بڑی احتیاط سے اس نے طاق میں رکھا اور پھر نسیمہ کے نزدیک آ کر اس کے شانے تھامتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اب کوئی رسم ہو یا نہ ہو، خدا کی نظر میں ہم دونوں ایک ہو چکے ہیں اب تم میری بیوی ہو۔"

نسیمہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا وہ جھکا۔ روشنی گل ہوئی اور نسیمہ انگوروں سے لدی شاخ کی مانند جھکتی چلی گئی۔

جو کچھ ہو گیا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا مگر یہ یقین تھا کہ جو کچھ ہوا وہ گناہ نہ تھا۔ خدا کے حضور ایک مقدس اقرار کا نتیجہ تھا اسے حوصلہ دلا رہا تھا۔

رات گئے جب وہ چوروں کی طرح گھر واپس ہوئی تو اماں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں گھر کا دروازہ یوں کھلا تھا۔ جیسے اسی کا منتظر ہو۔ اصغر اسے ہزاروں تسلیاں اور دلاسے دینے کے بعد اس کی گلی کے نکڑ تک چھوڑ گیا تھا۔ نسیمہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی اماں بے تابانہ اس کی طرف لپک آئیں۔

"بیٹی! آج تو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں اماں کام بہت زیادہ تھا۔" اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ یہ کھلا جھوٹ وہ اماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر بول سکتی۔

"واہ میرے مولا! لوگوں کی بیٹیاں اس عمر میں ٹھاٹھ کی نیند سوتی ہیں اور میری بچی......" اماں کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا غالباً انہیں یقین تھا مولا بن کہے ان کی ادھوری بات سمجھ گیا ہو گا۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے برقعہ اتارا ہی تھا کہ اماں پیچھے پیچھے آ گئیں۔

"کھانا لاؤں؟" انہوں نے بے پناہ شفقت سے پوچھا۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے اماں کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں دن بھر کی خشک آنتوں کو اب بھوک کہاں لگے گی مگر بیٹی زبردستی کھا لو۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے کروٹ سے لیٹتے ہوئے کہا۔

اماں نے بہت اصرار کیا مگر وہ بدستور کروٹ لئے پڑی انکار کرتی رہی۔ بالآخر اماں کو ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے لوٹنا پڑا۔

باقی رات نسیمہ نے جاگتی آنکھوں گزاری۔ جو ہو گیا تھا اس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی یہ ہو چکنے والی بات دل گداز بھی تھی اور روح فرسا بھی۔

اگلے دن جب اصغر سے ملاقات ہوئی تو نسیمہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھی مگر اصغر اسے تسلیاں دیتا رہا۔ قسمیں کھا کھا کر کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑنے کے وعدے کرتا رہا۔

اگلے چند روز اس نے خاصے شش و پنج میں گزارے۔ اصغر اس دوران اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ دونوں اس قسم کے فیصلے کا پورا اختیار رکھتے تھے اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔

اور اگلے ہی ہفتے ایک شام فیکٹری سے واپسی پر برقعے کی دونوں نقابیں گرائے وہ پھر اصغر کے گھر جا رہی تھی۔ اصغر اسے یہ باور کرا چکا تھا کہ وہ گھر اب اسی کا ہے اور وہ دونوں اب راستی پر ہیں۔

تیسری بار اصغر نے اسے پھر گھر چلنے کی دعوت دی تو وہ سہم کر بولی "کسی نے دیکھ لیا تو ——؟"

"تو کیا......؟ میں مرد ہوں تمہاری طرح کمزور اور بزدل نہیں۔ میں نے تمہیں اپنا کہا ہے اور مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں نسیمہ میری ہے ——"

"نسیمہ میری ہے!" ان لفظوں میں جانے کیسا سحر تھا، کہ نسیمہ کشاں کشاں چپ چاپ بغیر کسی حیل و حجت کے پھر اس کے ساتھ ہو لی۔

حسب سابق رات کی تاریکی میں اصغر اسے اس کی گلی تک چھوڑ آیا۔ اس بار گھر میں داخل ہوتے ہوئے نسیمہ ہراساں اور خائف نہ تھی اور اماں سمجھ رہی تھیں آج پھر اوور ٹائم لگا کر آئی ہے۔

پھر تو یہ آئے دن کا معمول بن گیا۔

اب اصغر نے نسیمہ سے اس کے گھر آنے اور اس کے والدین سے بات کرنے کا اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ نسیمہ اکثر ہول کر کہتی۔

"ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔"

"غلطی کیا ہم خدا کے حضور ایک دوسرے کو اپنا چکے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کیا ہو گا؟ میرا مطلب ہے اس طرح کب تک......؟" اس کا چہرہ فکروں میں ڈوب جاتا۔

"بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہم نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔"

"ہاں واقعی —" نسیمہ سوچتی "ہم نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔"

لیکن جو کچھ ہوا وہ کس قدر غیر دانشمندانہ تھا اس کا اندازہ نسیمہ کو اس وقت ہوا جب اصغر کئی دنوں تک اس سے نہ ملا اور جب وہ پریشان ہو کر ایک روز خود ہی اس کے گھر پہنچی، تو کوٹھری کے دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا اور دروازے پر چاک سے لکھا تھا۔

"کرائے کے لئے خالی ہے!"

نسیمہ سن رہ گئی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کیا کرے.... قرب و جوار میں بسنے والوں سے کسی قسم کا استفسار اسے مشکوک بنا دینے کو کافی ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے.... نقاب گرائے وہ اس گلی سے سر جھکائے اس جواری کی طرح نکلی جو ساری پونجی ہار کر جا رہا ہو۔

اگلے چند روز قیامت بن کر گزرے اصغر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ دو تین بار وہ فیکٹری سے واپسی پر اسی محلے بھی گئی — مگر

کوٹھری کے دروازے پر تالا پڑا پایا۔ چاک سے لکھے جانے والے "کرائے کے لئے خالی ہے" کے الفاظ دھندلانے لگے تھے۔ تیسری مرتبہ اس نے جرأت کر کے گلی میں کھیلنے والے لڑکوں سے اصغر کی بابت پوچھ ہی لیا۔

"پتہ نہیں جی چلے گئے ہیں اصغر بھائی، اب تو یہ کمرہ کرائے کے لئے خالی ہے۔" جواب ملا۔

اور اس جواب نے اسے تاریکیوں میں دھکیل دیا۔

فیکٹری سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے وہ اصغر کی تلاش میں نقاب کے پیچھے سے ہر مرد کو گھورتی چلتی۔ بس میں سوار ہوتی تو اس کی آنکھیں نقاب کے پیچھے سے مردانے حصے پر ٹکی رہتیں اس کے کان ٹکٹ ہو گیا ہے ان کا، کی صدا کے منتظر رہتے۔

مگر یہ ساری تگ و دو، تلاش اور جستجو ناکام رہی وہ نہ ملنا تھا نہ ملا اسے ملنا ہوتا تو ماضی کی طرح گم کیوں ہوتا۔ کبھی جی ہی جی میں وہ اسے برا بھلا کہنے لگتی اور کبھی وہ اسے اس قدر ٹوٹ کر یاد آتا کہ وہ مضطرب ہو جاتی۔ رات کے کسی سمے آنکھ کھل جاتی تو بقیہ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ وہ بے وفا جب یاد آتا، تو نسیمہ اس باوفا عورت کی طرح جو ایک مرد کی خاطر ساری رسوائیاں اور بدنامیاں مول لینے پر تیار نظر آتی ہے سوچتی......

"خدا نہ کرے کچھ ہو نہ گیا ہو!"

"ایسے بے مروت تو وہ ہو نہیں سکتے۔" اسے اصغر کی قسمیں اور وعدے یاد آتے۔

"خدایا! وہ جہاں بھی ہوں اپنی امان میں رکھنا ——" وہ سچے دل سے کسی سہاگن کی طرح اپنے سہاگ کی سلامتی کے لئے دعا گو ہو جاتی۔

اسے یقین تھا ایک روز وہ پھر اسے فیکٹری سے بس اسٹاپ کو جانے والے راستے پر اسی کھمبے کے نزدیک کھڑا مسکراتا ہوا نظر آ جائے گا۔ وہ شکوے کرے گی اور وہ مسکرا کر کہے گا۔

"ماں بہنوں سے ملنے چلا گیا تھا۔"

تصور ہی تصور میں اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔

"پگلی! میں نے تمہیں اپنا کہا ہے اور مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں، نسیمہ میری ہے۔"

کانوں میں جلترنگ سی بجتی۔

لیکن تصورات کا یہ رنگین سلسلہ ٹوٹتا تو وہ بے کل سی ہو جاتی۔

دنوں خوش فہمیوں میں مبتلا وہ داسی بن کر اس کے خیال کی پوجا کرتی رہی اس کے چرنوں میں پھول بکھیرتی رہی اور اس کے نام کی مالا جپتی رہی۔ اسے اپنی روح و تن کا مالک اپنے جسم و روح

طلاق

کے ایک مقدمے میں جج نے شوہر سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں شکایت ہے کہ روزانہ رات کو جب تم اپنے کاروبار سے نمٹ کر گھر آتے تھے تو گھر پر اپنی بیوی کو تنہا پانے کے بجائے تمہیں ہر مرتبہ کوئی شخص کپڑوں کی الماری میں چھپا ہوا ملتا تھا۔"

"جی ہاں جناب عالی" شوہر نے جواب دیا۔

"اور غالباً یہی وجہ ہے کہ گھر میں لڑائی جھگڑے کی ناخوشگوار ابتدا ہوئی۔؟"

"بیشک!" شوہر بولا "اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا جناب عالی! کہ میں دن بھر کا تھکا ہارا گھر واپس آؤں اور مجھے کپڑوں کی الماری میں اپنے کپڑے تک لٹکانے کی جگہ نہ ملے۔"

کو اس کی امانت سمجھتی رہی لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ یوں جانے والے بھی بھلا آیا کرتے ہیں۔ انہیں آنا ہو تو جائیں ہی کیوں؟

خام خیالیوں اور خوش فہمیوں نے اسے کچھ نہ دیا سوائے اس کے کہ اس کی طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ طبیعت گری گری رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے۔ اس نئی زندگی کے استقبال کو تیار ہو جائے یا اس کا رہیں سر کچل ڈالے۔ خودکشی کا ارادہ وہ ضرور کر سکتی تھی مگر اسے عملی جامہ پہنانے سے یکسر قاصر تھی۔ موت سے اسے ہمیشہ خوف آیا کرتا تھا۔ وہ تو کسی کے مرنے کی خبر سن کر ہی زرد پڑ جایا کرتی تھی، کجا اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ!

تمام راہیں مسدود پا کر ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے ایک خستہ حال مطب میں بیٹھنے والی لیڈی ڈاکٹر کا رخ کیا۔ مگر دروازے تک جا کر لوٹ آئی۔ بدنامی کے خوف نے اسے سر تا پا پسینے میں نہلا دیا۔

یوں طبیعت تو اس کی گری گری رہتی ہی تھی مگر ایک روز شام کے وقت جب وہ گھر پہنچی تو اس بری طرح طبیعت بگڑی کہ اماں اس کے ہزار انکار کے باوجود زبردستی ڈاکٹر کے ہاں کھینچ لے گئیں۔ معائنے کے بعد جب ڈاکٹر نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ماں بننے والی ہے!"

تو اماں کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ نسیمہ غیرت اور شرم کے مارے اماں سے نظریں نہ ملا سکی۔ غنیمت ہوا کہ ڈاکٹر نسخہ لکھنے میں مصروف تھا ورنہ ان دونوں کے چہروں کے تاثرات اس کے لئے

خاصے معنی خیز ہوتے۔ نسیمہ کا جی چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اسی وقت اس میں گڑ جائے۔ اب اسے یہ کون بتاتا کہ زمین بھی آسانی سے نہیں پھٹتی۔ دونوں نقابیں گرائے وہ امّاں کے ساتھ مطب سے باہر نکلی تو امّاں کسی پتھر کی طرح خاموش نظر آتی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی نسیمہ نے چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں منہ دبکایا اور دم سادھ کر پڑ گئی۔ امّاں سے نظریں ملانے کی نہ تاب تھی نہ جرأت، رات گہری پڑ جانے کے بعد جب سب سو گئے تو امّاں کمرے میں آئیں اور دبی دبی آواز میں بولیں۔

"غربت میں یہ کیسا کلنک کا ٹیکا لگایا ہے تو نے ہمارے منہ پر؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"کم سے کم بیمار باپ کا ہی خیال کیا ہوتا"، امّاں کی آواز میں لرزش بھی تھی بے بسی بھی۔ یوں لگتا تھا وہ رو دینے کو تھیں۔

"دنیا کیا تھوکے گی ہمارے جنم میں؟" وہ اپنی آواز کو حلق میں گھونٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"نوکری تو نے ہی تو نہیں کی سینکڑوں لڑکیاں کر رہی ہیں سب یہ گل کھلانے لگیں تو ماں باپ........"

امّاں کی بات ادھوری رہ گئی اور ان کی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا کو بوجھل سے بوجھل تر بناتی چلی گئیں: وہ گٹھڑی بنی پڑی رہی اسے کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بے بسی سے روتی ہوئی ماں کو دلاسہ دے، یا جرأتِ رندانہ سے کام لے کر انہیں بتلا دے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا قرآنِ مجید میرا گواہ ہے۔

امّاں دیر تک گھٹی گھٹی سسکیاں لیتی رہیں اسے کوستی رہیں دبی دبی آواز میں اس کے مر جانے کی دعائیں مانگتی رہیں اور وہ کسی مجرم کی طرح لب سر بہ مہر کئے پڑی رہی۔

وہ رات امّاں اور نسیمہ کے درمیان وہ خلیج حائل کر گئی جو پھر کبھی نہ پٹ سکی۔ اس رات کے بعد سے امّاں اس سے یوں اجنبی اجنبی اور اکھڑی اکھڑی سی نظر آتیں جیسے اپنی کوکھ سے اس کا نشان اور اپنے دل سے اس کا نام کھرچ پھینکا ہو۔

چند دن بعد ہی ممانی دلہن نے مسکراتے ہوئے نسیمہ کو یہ خبر سنائی کہ اس کے ہاں کوئی ننھا بھائی بہن آنے والا تھا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر جلد ہی اپنے پرایوں میں پھیلتی چلی گئی۔ اسے حیرت ہوئی۔ امّاں خود اس خبر کے چرچے میں پیش پیش تھیں گھر میں کوئی عزیز رشتہ دار آتیں یا کوئی محلے والی، امّاں یہ خبر ہر آنے جانے والی کو۔ یوں سناتیں جیسے وہ برس بھر کی بیاہی دلہن ہوں جو پہلی بار ماں بننے والی ہو۔ نسیمہ کے لئے یہ صورتِ حال خاصی حیرت افزا تھی۔

یہ بھی قدرت کا کرم ہوا کہ اس کی جسمانی ہیئت کچھ زیادہ بگڑی نظر نہیں آئی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ خود کو طرار نگاہوں کی زد میں آنے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتی۔ جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ وہ بڑی سی شال میں اپنا جسم لپیٹے رہتی۔ امّاں پر بھید کھلنے کے بعد وہ اپنے ہی گھر میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کونوں کھدروں میں دبکی پھرتی۔ فیکٹری سے واپسی کے بعد اور چھٹی والے دن اس کا زیادہ تر وقت کمرے ہی میں گزرتا۔ گھر آئے مہمانوں کے سامنے وہ شاذ و نادر ہی پڑتی۔ فیکٹری جاتی تو ڈھیلے ڈھالے برقعے میں اور برقعہ اتارتے ہی جلدی سے شال لپیٹ لیتی۔

پانچویں ماہ اچانک ہی امّاں نے ابا کے معالج کی اس ہدایت پر عمل کرنے کی تیاری شروع کر دی جو وہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے دیتا آ رہا تھا۔ نسیمہ کو پتہ ہوتا کہ اس کی ان پڑھ ماں کا ذہن کس منصوبے پر عمل کر رہا تھا تو وہ یقیناً ششدر رہ جاتی فی الحال تو اسے سارے کام فطری انداز میں ہوتے نظر آ رہے تھے ماسوائے اس کے کہ امّاں کے بارے میں جو خبر گرم تھی بظاہر تو اس کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

ابا کی تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے امّاں نے رختِ سفر باندھا شبیہ اور معینہ کو خالا۔ امّاں کی عاجزانہ درخواست پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اپنے پاس رکھنے پر رضامند ہو گئیں۔ نسیمہ اس مختصر قافلے میں کیوں شامل تھی اس کا جواز امّاں کے پاس انتہائی معقول تھا جوان بیٹوں والی بہن یا بھاوجوں کے پاس بھلا وہ جوان بیٹی کو کیسے چھوڑ جاتیں۔

کھانستے، کراہتے، سل کے مارے ابا، امّاں اور پتھر کی مانند خاموش، کسی سہمی ہوئی چڑیا کی مانند جس کے پر صیاد نے کاٹ دیئے ہوں نسیمہ اور منو پر مشتمل یہ کارواں کوئٹہ کی جانب رواں ہو گیا۔ جہاں ایک پسماندہ علاقے میں نسیمہ کی نانی رہتی تھیں جن کی آنکھوں میں برسوں پہلے موتیا بند اتر آیا تھا۔ دورانِ سفر تمام وقت نسیمہ چادر لپیٹے ڈبے کے ایک کونے میں دبکی خود کو ابا کی نظروں سے چراتی بہت آزردگی سے اپنے اس ماضی سے زیادہ جس نے اس سے بے وفائی کی تھی، دغا دی تھی۔ اس مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی جو جنگل کی شام کی طرح مہیب اداس اور دل دکھانے والا تھا۔

کوئٹہ پہنچتے ہی ابا نے پلنگ سنبھالا۔ امّاں نے اپنی بوڑھی ماں کو گزرے دنوں کی داستان، بہن، بہنوئی، بھائیوں، بھاوجوں ان کے بچوں اور دیگر عزیز رشتہ داروں کا احوال سنانا شروع کر دیا۔ کوئٹہ میں دور پار کے رشتہ داروں کے سوا قریبی عزیز کوئی بھی نہ تھا۔ نسیمہ کے ماموؤں، خالا اور خود امّاں نے ماں کو

کسی زمانے میں کوئٹہ سے کراچی لے جانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر پرانے وقتوں کی اس باوفا عورت نے زمین کے اس ٹکڑے سے دور جانے سے صاف انکار کر دیا تھا جہاں اس شخص کی قبر تھی جو کبھی اس کی مانگ کی افشاں بن کر رہا ہوگا۔

نانی نے جن کی آنکھوں کے دیئے بجھ چکے تھے اپنی بیٹی اور نواسی کے جسموں پر ہاتھ پھیر پھیر کر آنکھوں کی پیاس بجھائی بوڑھے جھریوں بھرے ہاتھ کپکپاتے ہوئے نسیمہ کے بدن پر رینگتے چلے جاتے اسے یوں لگتا جیسے نانی اپنی انگلیوں کی پوروں سے کسی رمز وہ راز دریافت کر لیں گی چنانچہ وہ ان سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی۔ نانی کے آس پڑوس کی نئی ملنے والیاں ان لوگوں کے آنے کی خبر سن کر ملنے آئیں تو نسیمہ گارے مٹی کے بنے تین کمروں والے اس مکان کی اس کوٹھری میں دبک گئی جو کسی زمانے میں اسٹور کا کام دیتا ہوگا ان ملنے والیوں سے اماں اس رکھائی سے پیش آئیں کہ جو ایک بار آیا وہ پلٹ کر نہ آیا۔ اور بہت جلد یہ سلسلہ رک گیا نسیمہ کو امّاں نے اشاروں کنایوں سے بتا دیا تھا کہ اسے زیادہ تر وقت کوٹھری ہی میں گزارنا ہوگا۔

مہینہ بھر بعد ہی خالا کی طرف سے خط آنے لگے جن میں خیر و عافیت کم اور شبیہ اور معینہ کی بدتمیزیوں اور شکایتوں کا احوال زیادہ ہوتا حالات نے نسیمہ اور امّاں کے درمیان خلیج حائل نہ کر دی ہوتی تو وہ ایسا پہلا خط ملتے ہی امّاں کو واپس چلنے پر مجبور کر دیتی اسے ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی اس کے بھائی بہنوں میں عیب جوئی کرے شبیہ اور معینہ کے بارے میں خالا جو کچھ لکھتی تھیں ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تمام شکایات خود ساختہ تھیں نسیمہ کو یقین تھا اس کی بہنیں اتنی بدتمیز نہیں ہو سکتیں کہ خالا کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیتیں کہ انہوں نے گھر بھر کو سنجا رکھا ہے کسی کی نہیں سنتیں۔

یوں ہی خط آتے رہے نسیمہ آپ ہی آپ جلتی رہی اور امّاں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی رہیں۔ انہیں پتہ تھا اس نازک موقعے پر ان کی ذراسی لغزش ان سب کو بدنامی کی عمیق کھائیوں میں دھکیل سکتی تھی۔ عزت کی خاطر انسان کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے کیسے سوانگ رچاتا ہے کاش کوئی امّاں سے پوچھتا۔

بالآخر وہ نازک گھڑی بھی آ پہنچی۔ یوں طبیعت تو اس کی صبح ہی سے خراب تھی اور وہ کوٹھری میں دم سادھے پڑی تھی مگر شام تک طبیعت ان کہی ہو گئی۔ امّاں ہراساں تھیں بار بار آتیں چوروں کی طرح بند کوٹھری کا دروازہ کھولتیں ایک نظر اس پر ڈالتیں اور چلی جاتیں۔ بڑے کمرے میں جو کوٹھری سے کافی فاصلے پر تھا ابا امّاں اور نانی کی چارپائیاں بچھی تھیں۔ نانی بڑے فخر سے بتلایا کرتی تھیں یہ چارپائیاں اور گھر کا سارا سامان نانا کے زمانے کا ہے۔ اب

تو بے چاری ان دو دکانوں کے کرائے پر بسر کرتی تھیں جو نانا چھوڑ کر مرے تھے۔

امّاں نے جو اس نازک گھڑی کی قربت سے ہراساں ہو رہی تھیں سرِ شام ہی نانی کو کھانا کھلا کر ان کا بستر بچھا دیا تھا۔ پلنگ پر لیٹنے سے قبل نانی نے جو صبح سے کئی بار نسیمہ کی بابت پوچھ چکی تھیں ایک بار پھر استفسار کیا۔ ان کے استفسار پر اماں نے وہ بہانہ تراشا جو خود ان کی آنکھوں کے گوشے بھی نم کر گیا۔ انہوں نے کہا تھا۔

"وہ دن بھر اپنے جہیز کی چادر کاڑھتی رہی ہے اب تھک کر لیٹ گئی ہے۔"

پھر انہوں نے دکھے دل سے سوچا کاش ایسا ہی ہوتا۔

کوٹھری کی خاموش فضا، نسیمہ کی گھٹی گھٹی سسکیوں اور حلق میں ہی گھٹ کر رہ جانے والی آہوں سے بوجھل تھی — یہ کوٹھریاں بھی کیسے کیسے رازوں کی امین ہوتی ہیں!

دھندلکا چھایا اماں نے شکر ادا کیا اور کڑوے تیل کا ایک چراغ جلا کر کوٹھری میں رکھ آئیں۔ امّاں کی بے رخی اور اجنبیت پر اس کا جی کٹ کے رہ گیا۔ کٹھن لمحوں میں جبکہ وہ تسلّی کے دو بولوں کو ترس رہی تھی کوئی نہ تھا جو اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مشکل گھڑیاں آسان ہو جانے کا دلاسہ دیتا۔

تاریکی بڑھی۔

رات گہری ہوئی اور امّاں کی جان میں جان آئی۔ زندگی کے اب تک کے سفر میں بیسیوں کٹھنائیاں آئی تھیں کتنے ہی آزمائشی مقام آئے تھے مگر یہ واحد آزمائش تھی جو اماں کو خون کے آنسو رلا رہی تھی شرافت بڑی ظالم شے ہے — جو غربت سے مل جائے تو بڑا ستم ڈھاتی ہے۔

اس رات کوئٹہ کی اس بستی میں جب شرافت اور مفلسی نے سر جوڑا تو ایسی سازش کی کہ رات کی تاریکی میں امّاں کی ممتا کو بچھاڑ ڈالا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس وقت وہ نسیمہ جس کی ذرا سی تکلیف انہیں مضطرب کر دیا کرتی تھی نیم تاریک کوٹھری میں تنہا ماہیِ بے آب کی مانند تڑپ رہی ہے رات گہری پڑتے ہی وہ کوٹھری کے دروازے کی زنگ آلود کنڈی چڑھا کر اسے مقفل کر برقعہ سر پر لے دبے پاؤں اس اندھی دایہ کی جھونپڑی کی سمت روانہ ہو گئیں جو سڑک پار خانہ بدوشوں کے ڈیرے کے پیچھے رہتی تھی۔ اور جس کے بارے میں انہوں نے نہ صرف خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ ایک بار جا کر اس کا گھر بھی باہر سے دیکھ آئی تھیں تاکہ وقت پڑنے پر دوڑ سکیں اس وقت لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ ستایا پسینے میں نہائے جا رہی تھیں نسیمہ کی جان اور سوتی

سے زیادہ انہیں یہ فکر تھی کہ عزت بچ جائے۔ خاندان کے دامن پر کوئی دھبہ نہ لگے۔ آزمائش کی جس بھٹی میں وہ کئی ماہ سے تپ رہی تھیں بخیر و خوبی ٹھنڈی پڑ جائے اور وہ پیچیدہ منصوبہ، جو عزت بچانے کی خاطر ان کے ذہن نے بنایا تھا کامیاب ہو جائے یقیناً خدا کو عزت بچانا منظور ہی تھا تب ہی تو ٹاٹ کے بھاری پردے کے پیچھے بوڑھی دایہ جاگتی ہوئی ملی اس کا بیٹا کام پر سے واپس نہ آیا تھا اور وہ رات کے وقت کسی صورت جانے کو تیار نہ تھی مگر اماں نے ہاتھ پاؤں جوڑے واسطے دیئے تو وہ ان کا ہاتھ تھامے چل دی۔ پہلے کچا راستہ پھر خانہ بدوشوں کا ڈیرا اور اس سے آگے چوڑی سڑک پار کرنے کے بعد کئی تاریک گلیوں سے گزرتی وہ گھر پہنچیں تو وہ کمرہ جہاں نانی کے خراٹے گونج رہے تھے اور ابا کے ساتھ منو بھی سو رہا تھا نیم تاریکی میں انتہائی پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ آہستگی سے پہلے قفل کھول کر اماں نے دروازہ کھولا اور دایہ کے اندر ہونے پر صد شکر ادا کیا پھر اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو گئیں۔ انہیں دیکھ کر نسیمہ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں امید کی.... روشنیاں لہرائیں۔ تخلیق کا یہ تجربہ، یہ عمل نسیمہ کے لئے جاں گداز بھی تھا اور کرب انگیز بھی۔

رات کے پچھلے پہر اس کوٹھری میں اپنی تخلیق کی وہ پہلی صدا نسیمہ کے کانوں میں پڑی تو اس کے دل کے سارے تار بیک وقت جھنجھنا اٹھے۔ یہ کیسی ان کہی کیفیت تھی کیسا گداز اور سحر تھا اس دبی دبی صدا میں کہ وہ سرتاپا اس نشے میں ڈوب کر رہ گئی۔ ساری تکلیف، تمام آلام و مصائب بھول گئی۔ عورت بھی دیوانی ہوتی ہے۔ ماں بن جائے تو ماضی کے دکھ، حال اور مستقبل کے خدشوں سب سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

"مبارک ہو بیٹا ہے۔" بڑھیا نے ہاتھوں سے ٹٹول کر کہا تو نسیمہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کانوں میں جلترنگ سی بج اٹھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات اسے مبارک باد دے رہی ہو مسرت کا پیغام سنا رہی ہو۔

کوٹھری ہی میں اسے نہلا دھلا کر ایک پرانے سے کپڑے میں لپیٹنے کے بعد بڑی بی نے...... پلنگ ٹٹول کر اسے نسیمہ کی آغوش میں لا لٹایا۔

بڑی بی کو آٹا، گڑ اور پندرہ روپوں کے ساتھ اماں واپس چھوڑنے گئیں تو جاتے جاتے کوٹھری کو پھر باہر سے مقفل کر گئیں۔ اب نسیمہ کو کوئی فکر نہ تھی۔ شاید ہر طرح کے احساسات ہمارے اپنے اندر سے جنم لیتے ہیں۔ اندر مسرتوں کی روشنی ہو تو مہتاب آپ ہی آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ اس وقت چراغ کی برائے نام روشنی بھی نسیمہ کو پورے چاند کی طرح کھلی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ روشنیوں اور مسرتوں میں نہائی کھڑی ہے۔ اس کے ارد گرد اندر باہر ایک گداز سا احساس تھا۔ روح ایک نئے جذبے سے سرشار تھی۔ کچھ ایسی کیفیت جو ایک مصور اپنی تخلیق کے مکمل ہو جانے پر محسوس کرتا ہے۔

کوٹھری کا دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے اپنے پہلو میں لیٹے اس گوشت پوست کے گڈے کو دیکھا جو آنکھیں بند کئے پڑا تھا آپ ہی آپ نسیمہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ چور نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے ہاتھ کو خم دے کر اس کے گلابی گلابی گال کو چھوا تو اسے یوں لگا جیسے وہ آسمان کو چھو آئی ہو۔ روئی کے گالے کی طرح یہ نرم نرم سا گال اس کے اپنے جگر گوشے کا تھا۔ ننھے ننھے گلابی ہونٹ، سیاہ ریشم کے سے بال۔ اچانک اس نے ننھی ننھی سی سیاہ آنکھیں کھولیں تو نسیمہ کو یوں لگا جیسے تاریک راستوں میں چراغ جل اٹھے ہوں۔ منہ کھول کر اس نے رونے کی تیاری کی تو نسیمہ نے اپنی دو انگلیوں سے اس کا ننھا سا کھلا ہوا منہ دھیرے دھیرے تھپتھپانے کی کوشش کی مگر وہ دو تین ننھی ننھی صدائیں لگا کر ہی رہا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اماں اندر داخل ہوئیں۔ بدستور اسی اجنبیت اور غیریت کے تاثرات کے ساتھ صبح ہونے میں اب ذرا ہی دیر باقی تھی۔ اماں کے چہرے پر اب ٹھہراؤ اور سکون کی سی کیفیت تھی مگر نسیمہ سے وہ اب بھی خفا نظر آتی تھیں۔ اس کے پلنگ کے نزدیک آ کر انہوں نے نسیمہ کی جانب دیکھے بغیر اس کے پہلو میں لیٹے جیتے جاگتے گڈے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس کا دل ہول اٹھا اس خوف سے کہ کہیں اماں اس زندگی کو اس کی اس اولین تخلیق کو عزت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں وہ کانپ اٹھی اس سے پہلے کہ اس کے لب وا ہوتے اماں حکمیہ لہجہ میں بولیں۔

"سب کو یہی بتانا ہے کہ یہ بھائی ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتی رہ گئی۔ زبان بے صدا رہی مگر رواں رواں پکارا دل کی ہر دھڑکن نے التجا کی۔

"خدا کے واسطے اسے مجھ سے نہ چھینو میری آغوش تو گرم ہو لینے دو۔"

اب اس کی سمجھ میں سب کچھ آ چکا تھا اپنی آنکھوں پر بازو پھیلا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو قطار اندر قطار اس کے تکیے کو بھگوتے چلے گئے۔

پو پھٹنے تک وہ انگاروں پر کروٹیں لیتی رہی۔

پھر نانی راستہ ٹٹولتی اسے آوازیں دیتی کوٹھری تک آ پہنچیں۔

"اری بچی! رات کو تو اکیلی لینے گئی دائی کو، مجھ کو اٹھا لیا ہوتا۔ لئے مجھ دیدوں پھوٹی کی ایسی نیند کہ سرہانے ڈھول بجیں اور آنکھ ہی نہ کھلے خیر بھائی مبارک ہو۔"

وہ صورت حال بخوبی سمجھ گئی۔ کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ نانی بینا ہوتیں تو چہرے پر بکھری زردیاں گواہی دیتیں کہ وہ اس نئی زندگی کی بہن نہیں ماں تھی۔

بڑی ہمت کر کے وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نانی کے ہمراہ کوٹھری سے ملحق کمرے میں آ گئی اور جو کچھ اس نے دیکھا اسے دیکھ کر اس کے اندر قیامت سی مچ گئی۔ کمرے میں پڑے نواڑی پلنگ پر اماں لیٹی تھیں۔ ان کے پہلو میں اس کا جگر گوشہ سو رہا تھا۔ ابا پلنگ کے ایک کنارے پر بیٹھے کھانس رہے تھے اس کا جی چاہا اس ننھے منے نرم نرم وجود کو اپنی آغوش میں بھینچ کر خوب پیار کرے سینے میں چھپا لے چور نگاہوں سے اس نے اماں کی طرف دیکھا تو وہ بھی کن انکھیوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پندرھویں دن جب اماں کو طوفان بلا ٹل جانے کا یقین ہو گیا اور نسیمہ کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تو انہوں نے واپسی کے لئے سامان باندھنا شروع کر دیا ان کے اصرار کے باوجود نانی کسی صورت ان کے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئیں۔ یہ پندرہ دن نسیمہ پر پندرہ صدیاں بن کے گزرے تھے رات کے وقت جب اس کے رونے کی آواز نسیمہ کے کانوں سے ٹکراتی تو اس کا جی چاہتا ساری جا داری تمام رکاوٹیں توڑ تاڑ کر اماں کے پلنگ کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لے سینے میں دبکا لے۔ لیکن ایک بے نام احساس جرم اس کا احاطہ کر لیتا زمین اس کے قدم پکڑ لیتی اور وہ بے بس ہو کر سوچتی اس سے تو بہتر تھا وہ سچ مچ اماں کی کوکھ سے پیدا ہوا ہوتا وہ واقعی اس کا بھائی ہوتا تا کہ وہ اسے اپنے سینے سے تو لگا سکتی اس کی پیشانی اس کے گال اور ننھے منے ہاتھ تو چوم سکتی۔ کیسا المیہ تھا!

واپسی پر دوران سفر ابا سارے رشتے ناتے توڑ چپ چاپ چلے گئے اماں بیوہ ہو گئیں۔ کراچی پہنچنے پر شمیمہ اور نعیمہ جہاں ابا کی موت پر افسردہ ہوئیں وہیں ننھے منے بھائی کو دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ ابا کی تدفین میں شرکت کرنے والے اپنے پرایوں نے اماں کی گود میں ایک ننھا بچہ دیکھا تو انہیں قطعی حیرت نہ ہوئی اس لئے کہ اماں پہلے ہی نئے مہمان کی آمد کا چرچا کر کے گئی تھیں اور اب اماں مطمئن تھیں عزت بچ گئی تھی ورنہ کیسی جگ ہنسائی ہوتی؟

ابا کے دسویں کے بعد نسیمہ فیکٹری گئی تو بغیر اطلاع کئے پانچ ماہ غائب رہنے کی پاداش میں وہ برطرف کی جا چکی تھی اسے نئے سرے سے ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرنا پڑی لیکن اس بار اس نے پچھلی مرتبہ کی طرح دھکے نہیں کھائے۔ بہت جلد وہ دوائیں کی ایک کمپنی میں پیکنگ کے کام پر لگ گئی۔ کام نسبتاً کم محنت طلب اور تنخواہ نسبتاً بہتر تھی۔ نئی ملازمت کا آغاز اس نے اس عزم کے ساتھ کیا کہ اب اسے بھا! بہنوں کے ساتھ اپنے دل کے ٹکڑے کے لئے بھی محنت کرنی ہے جس کا نام ممانی دلہن نے آفاق تجویز کیا تھا اس کے دل کا یہ ٹکڑا اس دنیا میں بلاشبہ ایک ایسی کٹھن آزمائش کی صورت میں آیا تھا جو دن بھر اسے آزردہ رکھتی تو راتوں کو خون کے آنسو رلاتی۔

اماں بڑی محتاط نظر آتی تھیں۔ شروع شروع میں ان کی حتی الامکان کوشش یہی رہی کہ وہ آفاق کے قریب رہیں اور اسے تنہا نہ چھوڑیں شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نسیمہ اس کی قربت سے پگھل کر لوگوں کے سامنے بکھر جائے لیکن دھیرے دھیرے اس احتیاط کی شدت میں کمی آتی گئی پہلے اماں انتہائی ضرورت کے عالم ہی میں اس کے قریب سے ہٹتی تھیں اب اکثر اسے کمرے میں چھوڑ کر باورچی خانے یا گھر کے کسی اور کام میں مصروف ہو جاتیں یہ لمحے نسیمہ کے لئے آب حیات سے بڑھ کر حیات بخش اور لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی ہوتے کونے کھدروں سے، کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے ننھے ننھے خرگاؤں سے وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جانے کیا کیا پاپڑ بیلتی اور دید کے یہ لمحے اس کے اندر وہ طوفان برپا کر جاتے کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی۔ اماں شاذ و نادر ہی اسے کمرے سے باہر نکالتیں۔ شمیمہ، نعیمہ اور منو بلا تکلف اماں کے کمرے میں گھس کر اسے چومتے، اس کی ننھی ننھی ہتھیلیوں کو بوسے دیتے اور وہ لمحوں کا عذاب سہتی اندر ہی اندر کسی موم کی شمع کی مانند پگھلتی رہتی۔ اس صورت حال نے اسے ایسے ذہنی انتشار اور چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیا کہ بہن بھائیوں سے بھی اس کی بات چیت برائے نام ہی رہ گئی۔ (شاید وہ ان تینوں سے نفسیاتی طور پر حسد کرنے لگی تھی) اس لئے کہ وہ تینوں اس کے جگر گوشے کو پیار کر سکتے تھے چھو سکتے تھے اسے محسوس کر سکتے تھے جبکہ وہ صرف تڑپ ہی سکتی تھی۔

لیکن کب تک؟

کب تک آخر؟

ایک شام پیاس بہت بڑھی تو وہ جو فیکٹری سے آنے کے بعد اپنا زیادہ تر وقت کمرے ہی میں گزارتی تھی۔ اماں کو باورچی خانے کی سمت جاتا دیکھ کر پچھلے دروازے سے اماں کے کمرے کی طرف لپک گئی کمرے کا دروازہ کھلا تھا وہ بے تابانہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کا نور العین گدیلے پر پڑا سو رہا تھا۔ چوروں کی طرح اس نے دروازے

کی طرف دیکھا پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دھیرے سے اس نے گال چھوا اور اپنی انگلیاں چوم لیں۔ آپ ہی آپ...... وہ کسی داسی کی طرح نیم خم ہوتی چلی گئی۔ سر جھکا اور آنکھیں برس اٹھیں وہ سو رہا تھا کبھی اس کے لب مسکرانے لگتے اور کبھی وہ منہ بسورنے لگتا۔ وہ مسکراتا تو نسیمہ کی روتی ہوئی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں لیکن ابھی جامِ قربت لبوں تک پہنچا ہی تھا ابھی اس نے ایک گھونٹ بھی نہ لیا تھا کہ نیم وا دروازہ کھلا اور اماں کمرے میں داخل ہوئیں اس چور کی طرح جو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے پیاسی کی پیاسی وہ گھبرا کر جھل جھل سی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہوتا تو دیکھتی اماں کے چہرے پر کیسا حزن و ملال تھا، مائیں بھی خوب ہوتی ہیں۔

وہ رات نہ صرف نسیمہ پر کٹھن گزری بلکہ اماں بھی اپنے پلنگ پر لیٹی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں...... کتنی ہی مرتبہ ان کا جی چاہا اپنے پہلو میں لیٹے بچے کو اٹھائیں اور اس ماں کے پہلو میں ڈال آئیں جو خود ان کی جانِ جگر تھی۔ مگر اتنی جرأت وہ نہ کر سکیں انہیں ڈر تھا کہیں قربت پا بجولاں ماتا کو زنجیریں توڑنے پر مجبور نہ کر دے۔

○

رفتہ رفتہ اسے اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا کہ آفاق اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا تاہم دل کے معبد میں یہ یقین جاگزیں تھا کہ ایک دن وہ منزل آئے گا جب وہ اسے اپنا کہہ سکے گی۔ جی بھر کر پیار کر سکے گی اپنی پیاسی ماتا کی تشنگی کر سکے گی۔ امید ہی تھی جو اسے کئی بار کشاں کشاں سندھی ہوٹل کی ایک گلی میں واقع اس چھوٹی سی کوٹھری کے دروازے تک لے گئی جہاں کبھی اس نے جاگتی آنکھوں سہانے سپنے دیکھے تھے وقت نے اس میں اتنی جرأت پیدا کر دی تھی، کہ وہ اس دروازے پر دستک دے کر اس کوٹھری کے پرانے مکین کی بابت استفسار کر سکتی مگر جب اس نے نقاب کے پیچھے سے سوال کیا تو جواب میں مایوسی سے سر ہلا کر پرانے مکین کے نئے پتے سے قطعی لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔ گویا جو کچھ تھا اسی کو سہنا تھا۔

لیکن جو کچھ سہنا تھا وہ کس قدر آزمائش طلب تھا۔

ہر ہر لمحہ آفاق کا تصوّر، وہ جاں گداز تصوّر جو اسے جینے کی امنگ دلاتا۔ اس کے ساتھ رہتا۔ اس کا خیال گھڑی بھر کو بھی اس سے دُور نہ ہوتا۔ مشینیں چلتی رہتیں، دوائیوں کی شیشیاں آگے سرکتی جاتیں، ہر مشین، ہر شیشی، ہر کاغذ، ہر شے پر نسیمہ کو اس کا معصوم چہرہ رقصاں نظر آتا۔ سڑکوں پر، بس اسٹاپوں پر، بازاروں میں ماؤں کی گودوں میں بچے دیکھ کر دل میں ہوک سی اٹھتی۔ کھلونوں کی وہ دوکان جو ہر روز اس کے راستے میں پڑتی تھی ہر روز اسے اپنی طرف متوجہ کرتی اور ہر روز وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتی گزر جاتی۔ شوکیسوں میں ننھے ننھے خوشنما ملبوسات دیکھ کر کئی بار وہ دوکانوں میں داخل ہوئی اور ہر بار سر جھکائے پلٹ گئی۔

دھیرے دھیرے اماں نے اس سے خاموش مصالحت کر لی۔ ایک دوسرے کو مخاطب کئے بغیر کبھی کبھی نظریں جھکائے جھکائے رسمی بات چیت بھی ہو جاتی۔ کچھ اس طرح جیسے سرِ راہ چلتے دو اجنبی ایک دوسرے سے مخاطب ہوں۔ اکثر تنہائی میں نسیمہ سوچتی، اماں کو سب کچھ بتا دے بڑی مشکلوں سے وہ خود کو تیار کرتی مگر اماں کا سامنا ہوتے ہی اس کی آنکھیں جھک جاتیں، لب دغا کر جاتے گویائی پرے معافی کر جاتی۔ اب اکثر آفاق کو اماں کمرے سے باہر لے آتیں۔ شمیمہ اور نعیمہ اسے آنگن میں چھوٹی چوکی پر لا بٹھاتیں، وہ ہمکتا رہتا۔ نسیمہ دل پر جبر کئے جذبوں پر پہرے بٹھائے انجان بنی رہتی۔

وہ وقت بھی آیا جب غوں غاں سے بڑھ کر اماں تک نوبت آ پہنچی۔ کنکھیوں سے اس نے بارہا اسے ہمک کر اماں کی جانب ہاتھ بڑھا کر "اماں" کہتے سنا اور دیکھا تھا پہلی بار جب یہ لفظ اس کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ چونک پڑی وہ فیکٹری سے لوٹی ہی تھی اماں شاید کسی کام میں مصروف تھیں شمیمہ آنگن میں ٹہلتے ہوئے اسے شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی اسے روتا دیکھ کر وہ بے کل ہی تو ہو گئی۔ جی چاہا شمیمہ سے لے کر اسے اپنے سینے سے لگا لے مگر بے نام احساسِ جرم زنجیرِ پا بنا اسے آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب رہا۔ بادلِ نخواستہ وہ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ "اماں" کی صدا اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ زمین نے اس کے قدم پکڑ لئے ماہیٔ بے آب کی مانند اس نے تڑپ کر دیکھا۔

"اماں......" وہ روتے روتے دوبارہ بولا۔

"کیا بات ہے میرے لال...... میری جان......" اس کے اندر بیٹھی سہمی ہوئی ماں بےتابانہ بولی مگر بظاہر لب پتھر کی طرح خاموش ہی رہے۔

اماں کے بعد اگلا لفظ جو اس نے کہنا سیکھا، آپا تھا شمیمہ، معینہ اور منو کی زبانی آپا کی تکرار سن کر وہ اکثر آپا کی رٹ لگاتا نسیمہ تو بزدل تھی جرأت نہ کر سکی اس کی طرف بڑھنے کی مگر وہ خود اس کی طرف آنے لگا۔ ابتداء مسکرانے سے ہوئی۔ شمیمہ یا معینہ کی گود میں چڑھے ہوئے وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکراتا تو نسیمہ کی رگ رگ میں ٹھنڈک سی سرایت کر جاتی۔ آنکھیں چمک اٹھتیں۔

"آ...... آ...... پا" وہ حوصلہ پا کر کہتا۔

نسیمہ اس کے آپا کہنے پر آزردہ ہو جاتی۔

مگر یہی کیا کم تھا کہ اس کے بطن سے جنم لینے والا وہ بچہ جس کی جائز قانونی اور معاشرتی حیثیت کی کوئی سند کوئی گواہی اس کے پاس نہ تھی اماں کی گود میں بڑے دلار سے پروان چڑھ رہا تھا۔

جس دن اس نے پہلی بار اپنے لختِ جگر کو قدم اٹھاتے دیکھا اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی اس کے بس میں ہوتا، معاشرتی اقدار اجازت دیتیں تو وہ کسی اونچی سی جگہ پر کھڑی ہو کر ایک ایک کو مخاطب کر کے اپنے بیٹے کے پاؤں پاؤں چلنے کی نوید سناتی۔

اب اس کے سپنے آفاق کے دم سے سجنے لگے۔ وہ تصوّر ہی تصوّر میں اسے بہت بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھتی۔ ان خوابوں کو وہ سینت سینت کر رکھتی۔ اب وہ ان مختلف امکانات پر غور کرتی جن کے ذریعے آمدنی میں اضافہ ممکن ہو۔ بڑی سوچ بچار اور اپنی ایک ساتھی کے مشورے پر وہ موسمِ سرما میں قسطوں پر سلائی کی ایک مشین خرید لائی۔ بہت جلد کمپنی کی اکثر لڑکیاں اور عورتیں اپنے اپنے بچوں اور ملنے جلنے والیوں کے کپڑے اسے اجرت پر سلائی کے لئے دینے لگیں۔ دن بھر وہ کمپنی میں کام کرتی اور رات گئے تک مشین پر جھکی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے کمر کے ٹکڑے ہوتے محسوس ہوتے نیند اسے اپنی آغوش میں لینے کو بےقرار ہوتی مگر آفاق کو بڑا آدمی بنانے اور اسے آسائشیں فراہم کرنے کا عزم اس کے بدن کی ساری تکان چوس لیتا۔

ایک۔ دو۔ تین برس گزر گئے۔

لیکن آدمی کے اندر کوئی چور چھپا ہو تو وہ تین صدیاں بھی سہم کر گزار دیتا ہے۔ نسیمہ ان حدود کو پھلانگنے کی جرأت نہ کر سکی اس کے ذہن کے چھ گوشوں میں ہر لمحہ یہ احساس رہتا کہ آفاق کو پیار کرنے سے وہ رسوا ہو سکتی ہے۔ زندگی کی راہ پر آفاق کے معاملے میں وہ دم سادھے چوروں کی طرح دبے پاؤں چل رہی تھی اس محتاط روی نے اسے باطن ہی نہیں بظاہر بھی سہما دیا تھا خوف و ہراس اور احساسِ پشیمانی نے اسے بزدل بنا دیا تھا لیکن بڑی عجیب بات تھی جس قدر یہ خوف و ہراس اس کا احاطہ کئے جاتا بڑھتا ہی جاتی اتنا ہی آفاق کی محبت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں برگد کی جڑوں کی طرح دُور دُور تک پھیلتا محسوس کرتی تھی۔

چوتھے برس جب عید آئی تو شمیمہ اور نعیمہ نے دبی زبان سے نسیمہ سے چاند رات کو چوڑیاں پہننے کے لئے بازار چلنے کی فرمائش کی۔ شمیمہ اور معینہ کے بارے میں اماں جس قدر محتاط اور سخت گیر ہو گئی تھیں اس کے پیشِ نظر اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ اماں انہیں جانے کی اجازت دیں گی لیکن شمیمہ نے جس طرح ڈرتے ڈرتے فرمائش کی تھی نسیمہ کے لئے اس کا ٹالنا دشوار تھا اسے یاد تھا چند ہی برس پیشتر تک وہ خود بھی ایسی ہی ننھی ننھی خواہشوں کے پورے ہو جانے کی تمنا کیا کرتی تھی اس کا بھی جی چاہتا تھا۔ اپنی سہیلیوں کی طرح وہ بھی چاند رات کو چوڑیاں پہننے جائے مہندی لگائے رات بھر جاگ کر صبحِ عید کا انتظار کرے، جب تک گھر کے حالات بہتر رہے اس کی خواہشیں پوری ہوتی رہیں مگر جب حالات بگڑے تو دو تین عیدیں بالکل ہی خاموش اور سونی گزری تھی۔ چنانچہ جب شمیمہ نے فرمائش کی تو اس نے کہا۔

"جاؤ اماں سے پوچھ لو، وہ اجازت دیں تو میں لے چلوں گی۔"

شمیمہ نے یہ ذمہ داری معینہ اور معینہ نے منو پہ ڈال دی۔ منو گیا اور اماں سے بولا۔

"آپا کہہ رہی ہیں منجھلی آپا اور باجی کو چوڑیاں پہنا لائیں۔"

اماں چاہنے کے باوجود انکار نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ اس ایک لغزش سے قطع نظر نسیمہ نے جس طور اس گرتی عمارت کو سہارا دیا تھا اس کا انہیں بخوبی احساس تھا اس کنبے کو وہ بلاشبہ مرد بن کر پال رہی تھی۔ منو کی بات پر وہ ذرا دیر کو خاموش ہو رہیں۔ پھر بولیں۔ "کہنا دیر نہ ہو جلدی آ جانا۔"

آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ نسیمہ دونوں بہنوں اور منو کو لے کر گھر سے باہر نکلنے لگی تو ننھا آفاق بھی مچل گیا۔

"آپا میں بھی......"

نسیمہ نے یکبارگی پلٹ کر دیکھا وہ سوال کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "لے لیں آپا اسے بھی۔" شمیمہ نے سفارش کی۔

"ہاں آپا۔" معینہ نے بڑی گرمجوشی سے شمیمہ کی رائے سے اتفاق کیا۔

"لے چلیں آپا؟" شمیمہ نے اس بار سوال کیا تھا۔

مگر اس سوال کا جواب نسیمہ کے پاس کب تھا!

"آپا......" آفاق منمنایا۔

بالآخر اماں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"شمیمہ لے جا اسے بھی۔" انہوں نے کہا۔

گھر کے دروازے سے نکلنا محال ہو گیا۔ دل کی دھڑکنیں... بے لگام تھیں۔ پہلی بار وہ اسے لے کر کہیں جا رہی تھی۔ گلی سے باہر نکلتے ہی اس نے اسے شمیمہ کی گود سے لے لیا وہ سینے سے کیا لگا اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ جیسے دہکتی آگ پھول بن گئی ہو۔ روح جس نشے سے دوچار تھی۔ وہ ناقابلِ بیان تھا پہلی بار اس نے اپنے جگر گوشے کو اپنے سینے سے چمٹایا تھا نیم تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ بار بار چپکے چپکے اسے بےتابانہ چومتی رہی شمیمہ، معینہ اور منو عید کی خوشیوں میں مگن اس سے آگے آگے چلتے رہے۔ اور وہ اپنی پیاس بجھاتی رہی۔

بس میں سوار ہو کر وہ سب بازار پہنچے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک سیلاب تھا جو سڑکوں پر امڈ آیا تھا۔ ننھے ننھے بچے اپنی ماؤں اور باپوں کی انگلیاں تھامے چل رہے تھے نسیمہ کا جی چاہا اس کا بیٹا بھی اس کی انگلی تھام کر چلے بڑی احتیاط سے اس

نے نیم خم ہوتے ہوئے آفاق کو نیچے اتارا اور اپنی معصوم خواہش کی تکمیل کو اپنی انگلی اس کے ننھے منے ہاتھ کے حصار میں دے دی اس نے انگلی اپنی نرم نرم ہتھیلی اور انگلیوں کے بیچ کیا تھامی نسیمہ کو یوں لگا اس ننھے منے ہاتھ سے آبِ حیات رِس رِس کر بوند بوند اس کے جسم میں بہتی خون کی ندی میں شامل ہو کر اس کی توانائیوں میں ناقابلِ بیان اضافہ کر رہا ہو۔ مخمور مخمور سی وہ ننھے منے قدم اٹھاتے آفاق کے ساتھ رینگتی رہی۔ محبت اور پیار کی لہریں اس چھوٹے سے نرم و گداز ہاتھ سے اس کے جسم میں سرایت کر کے اسے ناقابلِ بیان مسرت بخشتی رہیں۔

آپا یہ کیا ہے ؟ آپا وہ کیا ہے ؟ آپا میں چیز لوں گا آپا میں بھی چوڑیاں پہنوں گا۔

راستے بھر وہ پیاری پیاری معصوم معصوم باتیں کرتا رہا اس کی پیاسی روح سیراب ہوتی رہی۔ لیکن جتنی بار اس نے نسیمہ کو آپا کہا اتنی ہی بلکہان دل پر چوٹ پڑی۔ اس کا جی چاہا اسے کے نزدیک جھک کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے۔

"میری جان ! آپا نہیں امی کہو ؟"

مگر کم ہمتی اور بزدلی پھر آڑے آئی۔

جان بوجھ کر اس نے بازار میں خاصا وقت یونہی گھومتے پھرتے فالتو گزارا۔ شمیمہ اور معینہ نے چوڑیاں بھی پہن لیں، ہار، بُندے بھی خرید لئے۔ منو نے ہیٹ بھی خرید لیا۔ چارس کو اس نے ٹافیاں بھی دلوا دیں مگر اس کے باوجود بھی ابھی واپسی کو جی نہ چاہ رہا تھا اس کا جی چاہتا بھی کیسے؟ یہ وہ پہلی مبارک رات تھی جو اس کی دن بدن شعلوں میں ڈوبی مامتا پر رحمت کی پھوار بن کر برسی تھی۔ بالآخر شمیمہ کو کہنا پڑا۔

"آپا اب چلیں اماں نے پہلے ہی کہا تھا جلدی آجانا آج تو ضرور ڈانٹ پڑے گی"

اس رات گھر واپس ہوتے ہوئے شمیمہ نے اس سے بڑا ٹیڑھا سوال کر ڈالا۔

"آپا ...." اس نے کہا۔ پھر قدرے توقف سے ہچکچاتے ہوئے بولی "اماں ...... آپ سے اتنا کم کیوں بولتی ہیں۔؟"

اس سوال پر لمحہ بھر کو تو وہ سن ہو گئی۔ گویا اب وہ منزلیں آرہی تھیں۔ جب اسے اس قسم کے ٹیڑھے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔ تاہم اس نے ذرا سوچ کر بڑی رسانیت سے کہا۔

"نہیں تو شمو ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل میں گھر میں رہتی ہی کم ہوں اور جب کام سے واپس آتی ہوں تو یا تو تھکی ہوتی ہوں یا پھر کچھ سینا ہوتا ہے اس لئے تمہیں ایسا لگتا ہے"

شمیمہ کچھ نہیں بولی لگتا تھا اس کے جواب نے اسے کسی حد تک مطمئن کر ہی دیا تھا۔

واپسی پر جب گلی میں داخل ہوتے ہوئے نسیمہ نے اپنے شانے سے لگے سوتے ہوئے آفاق کو بڑی احتیاط سے شمیمہ کے حوالے کیا تو کسی طور بھی شمیمہ کے ناپختہ ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اماں اور آپا کے درمیان جو سبب خلیج حائل تھی اس کا سبب وہ ننھا سا معصوم بچہ تھا جو ہر فکر سے بے نیاز بے خبر سو رہا تھا۔

دن ماہ و سال میں بدلے۔

اور ایک خوشگوار سی صبح وہ آفاق کو ایک انگریزی اسکول میں داخل کرا آئی۔ داخلے کے وقت جب فارم پُر کرتے ہوئے ولدیت کا خانہ پُر کرنا پڑا تو خالی خانہ ایک کٹھن سوال کی صورت اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ایک زبردست ذہنی کشمکش اور تناؤ کے بعد بدِقت تمام وہ خود کو اس بات کے لئے تیار کر پائی کہ اس خانے میں ابا کا نام لکھا جائے۔ کیسی عجیب بات تھی۔ قسمت نے کیسا کھیل کھیلا تھا۔

بہرحال یہ مرحلہ بھی نمٹ ہی گیا۔

لمحہ بہ لمحہ دن بدن وہ۔ مامتا کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوتی چلی گئی۔ اس کا ایمان آفاق، اس کا ایقان آفاق، اس کی زیست آفاق، اس کی کائنات آفاق۔ اب اس کی زندگی میں جتنے رنگ تھے آفاق کے دم سے، جو کچھ تھا آفاق تھا۔ اسی کے لئے جینا اسی کے لئے مرنا اس پاگل ماں کے جذبوں کی شدت کوئی دیکھتا تو جانتا کائنات کا حسن کس کے دم سے ہے؟ محبت کے چشمے کہاں سے پھوٹتے ہیں؟ وہ کون سا دل ہے جس کی سچائیوں کو ملائک بھی سلام کرتے ہیں؟

سوکھے پتے گرتے رہے نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ بہاریں آتی رہیں خزاؤں کا روپ دھارتی رہیں۔ خزائیں بہاروں کو جنم دیتی رہیں۔ آفاق بچپن سے گزر کر لڑکپن اور لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس وقت تک نسیمہ کمپنی میں سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچی تھی۔ اماں نے ماضی کے تلخ تجربے کے پیشِ نظر شمیمہ اور معینہ کو تیرہ چودہ سال کی عمروں کو پہنچتے ہی انہیں گھر بار کا کر دیا تھا۔ نسیمہ کی شبانہ مصروفیات میں سلائی کی مشین کے ساتھ موسم سرما میں نٹنگ مشین کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ منو پولی ٹیکنک سے ڈپلومہ کر رہا تھا اور آفاق میٹرک میں تھا۔ اپنے پرائے نسیمہ سے شادی کے بارے میں استفسار کرتے اسے شادی کرنے کا براہِ راست مشورہ دیتے۔ جواب میں اس کے لبوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ بکھر کر رہ جاتی۔ نسیمہ کی خالہ، ممانیاں اور دوسری رشتہ دار عورتیں اور ملنے جلنے والیاں اماں سے کہتیں۔

"بس اب بہت کرلی نسیمہ نے نوکری اب تو اس کی شادی کر ڈالو"

اماں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ ان ٹھنڈی سانسوں اور زخم خوردہ مسکراہٹ کے پیچھے کون سی کہانی چھپی تھی۔ کسی کو بھنک بھی مل جاتی تو وہ بھونچال آتا کہ الاماں —

اماں آخر کو ماں تھیں، شمیمہ اور معینہ کی شادیوں کے بعد وہ اکثر اس کی حالت پر چپکے ہی چپکے خون کے آنسو روتیں، گھنٹوں اس کی ویران زندگی کے بارے میں سوچتیں، دکھ سا دکھ تھا کہ وقت کے ساتھ باوجود مجبور ہو جانے اور چاہنے کے اماں آفاق سے یہ نہ کہہ سکیں میں تمہاری ماں نہیں تمہاری ماں تو وہ ہے جو تمہیں دیکھ کر جیتی ہے جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں دیکھا کرتی ہے جس کی آغوش ویران ہے جیسے میں نے انگاروں پر لوٹتے محسوس کیا ہے !!

دن کیسے بھی ہوں گزر ہی جاتے ہیں۔

گزرے دنوں نے نسیمہ کو جو سوغات دی وہ بلند قامت آفاق کی صورت تھی یہ صورت نسیمہ کے لئے ایسی نہ تھی۔ جسے وہ پہچان نہ پاتی۔ ہو بہو اصغر کا عکس۔ بڑی عجیب بات تھی نسیمہ کو آج بھی اس مرد کا انتظار تھا۔ اس سے پیار تھا جس نے اسے دھوکا دیا تھا، فریب کیا تھا۔ شاید آج بھی وہ بے مہر راستہ بھول کر اس کی طرف آنکلتا تو وہ سارے دکھ بھول بھال اس کے سینے سے لگ جاتی۔ کبھی کبھی وہ آپ ہی آپ سوچتی ایسا کیوں ہے ؟ میں اس سے نفرت کیوں نہیں کر پاتی ؟ یہ ایسی گتھی تھی جسے وہ کبھی نہ سلجھا پاتی شاید اس لئے کہ بعض عورتیں محبت کے معاملے میں خود غرض کم، احمق زیادہ ہوتی ہیں۔

ڈپلومہ کورس کے بعد منو جرمنی چلا گیا، وہ کیا گیا اماں کی نیندیں ان کا چین اور سکون چرا کر لے گیا۔ برس ڈیڑھ برس میں ہی وہ اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھکی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ یہی وہ راتیں تھیں جب تنہا راتوں میں منو کی خاطر رتجگے نبھاتے ہوئے انہیں نسیمہ کے کرب کا زیادہ شدت سے احساس ہوا۔ ایسے میں گزرے دنوں کی یاد انہیں حد درجہ متاسف کر دیتی وہ غیر جانبداری سے سوچتیں جو کچھ ہوا اپنی جگہ، مگر نسیمہ کی مامتا کے ساتھ واقعی ستم ہوا۔ اس سلسلے میں وہ متاسف ضرور تھیں مگر خود کو قصوروار اس لئے نہ پاتیں کہ وہ جانتی تھیں عزت کے خوف اور حد درجہ مجبوری نے یہ سب کچھ کروایا تھا حقیقت بھی یہی تھی اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا اس قدر احتیاط نہ برتی جاتی تو شمیمہ اور معینہ باعزت گھرانوں میں کب بیاہی جاتیں۔ اماں خاندان میں اٹھنے بیٹھنے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاتیں۔ ان کا سر ہمیشہ کے لئے جھک گیا ہوتا۔

وقت بڑا بے رحم، بہت ظالم حد درجہ سفاک اور جلاد ہے۔ گزرتا ہی جاتا ہے اور جب گزر جائے تو اپنے پیچھے کچھ یادیں، کچھ باتیں، چند لمحے ایسے چھوڑ جاتا ہے جن کی کسک رہ رہ کے تڑپاتی ہے۔ بدقسمتی سے نسیمہ کی زندگی میں ایسے اَن گنت لمحے تھے تاہم بے رحم وقت نے اس پر اتنی عنایت ضرور کی تھی کہ اب وہ آفاق کے نزدیک رہ سکتی تھی۔ وقت نے ان دنوں اماں کو نشانۂ ستم بنا رکھا تھا دن رات وہ منو کے فراق میں تڑپتیں۔ نسیمہ کو اماں کی حالت پر دل و جان سے افسوس ہوتا۔ اس کے اپنے دل کا بوجھ اب ہلکا تھا۔ کمپنی سے واپسی پر وہ بیشتر وقت آفاق کی سیوا میں گزار دیتی۔ اس کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتی۔ راتوں کو اٹھ کر اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا کرتی بلکہ بعض اوقات راتوں میں وہ کئی بار اس کی طرف جاتی گھنٹوں اسے اس فکر میں نیند نہ آتی کہ کہیں اس کا لحاف نہ سرک گیا ہو کہیں وہ پاؤں کھولے نہ سو رہا ہو۔ کہیں اسے سردی نہ لگ رہی ہو اس کی کتابوں، کپڑوں اور جوتوں کا وہ اپنی جان سے بڑھ کر خیال رکھتی۔ آفاق کو پلک جھپکتے ہر چیز تیار ملتی۔

"آپا! آپ نے تو مجھے بالکل ہی نکما بنا دیا ہے" آفاق کہتا۔

نسیمہ کے چہرے پر محبت سے بھرپور مسکراہٹ پھیل جاتی۔

لوگ دونوں کی بے مثال محبت پر رشک کرتے بڑی بوڑھیاں دونوں بہن بھائی کی محبت کی مثالیں دیتیں۔

اماں کے پاس اب ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا نسیمہ کے ماضی پر حسرت بھری ٹھنڈی سانسیں ...... منو کی یادیں اور ٹھنڈی سانسیں ...... یوں تو منو کی واپسی کی آس موم شمع کی ٹمٹماتی لو بن گئی تھی لیکن جب منو نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کے بعد اپنی اور اس کی تصویریں بھیجیں تو اماں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں جیسے اس کے واپس آنے کی آس ختم ہو گئی ہو۔ نسیمہ اور آفاق نے اپنے ایک نہیں بیسیوں خطوط میں منو کو اماں کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں لکھا مگر ہر بار کوئی جواز پیش کرنے کے بعد منو اماں کے نام چھوٹی سی رقم کا ایک منی آرڈر بھیج دیتا اسے شاید معلوم نہ تھا مائیں دولت کی نہیں اولاد کی پجاری ہوتی ہیں۔

بالآخر فشارِ خون اور دل کی بیماری نے اماں کو ایسا چاٹا، کہ برکھا کی ایک شام جب بادل روتے روتے تھم گئے تھے ان کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی۔ مدتوں بعد نسیمہ نے ان کے بے حد نزدیک ہو کر ان کے سرد پڑتے ہاتھ تھام لئے۔ ان کی سانس بگڑ رہی تھی۔

"مجھے ...... ظالم ...... نہ ...... سمجھنا !" انہوں نے بمشکل تمام کہا۔

"اماں ......" نسیمہ اماں کے سرد پڑتے سینے میں منہ چھپا کر کسی چھوٹی سی بچی کی طرح بلک اٹھی۔ پھر جب اس نے سر اٹھایا تو دیکھا، اماں کی آنکھیں بجھ رہی تھیں۔

"میں ...... میں ...... اپنے ...... سینے پر ...... بہت بڑا ...... بوجھ لے کر ...... جاؤں گی ...... بیٹی"

وہ بلبلا کر رو دی۔ مدتوں بعد اماں کی قربت اسے پگھلائے دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا آج اماں کے سینے میں منہ چھپا کر اتنا روئے، اتنا روئے کہ بادلوں کو مات کر دے۔ ان کے پوچھے بغیر کوئی سوال کئے بنا انہیں سب کچھ بتا دے، انہیں بتا دے کہ میں نے دھوکا ضرور کھایا مگر مجھے یقین ہے خدا کی نظر میں میں مجرم اور

گناہ گار نہیں ہوں۔

مگر کچھ سننے سے پہلے ہی اماں کی آنکھوں کے دیپ بجھ گئے سانسیں رک گئیں نبضیں ڈوب گئیں۔ نسیمہ [illegible] تڑپتی رہ گئی۔

اماں کی موت پر وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے سارے الم آنکھوں کے راستے بہا دینا چاہتی ہو۔ جیسے اگلے پچھلے سارے حساب چکا دینا چاہتی ہو۔ آفاق بے حد اداس تھا جیسے سچ مچ اس کی ماں مر گئی ہو۔

اماں کے بعد بڑے دنوں اس گھر کے در و دیوار اداس رہے وہ آنگن سُونا ہو گیا جس کی فضائیں علی الصبح اماں کی خوش الحانی سے مخمور ہو جایا کرتی تھیں۔ منو کو خبر ملی تو اپنی جرمن بیوی اور بیٹے کے ہمراہ وطن آیا مگر اب آنا بے سود تھا اس کی راہ تکنے والی آنکھیں تو خاک کے پردوں میں نہاں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اسے متاسف اور نادم واپس لوٹنا پڑا۔

✻

گھر میں اب نسیمہ تھی اور آفاق، جس کی ایک جھلک کے لئے کبھی نسیمہ کو راتوں تڑپنا پڑتا تھا۔ اب زخموں پر پھائے رکھے تھے۔ اور ٹیسوں میں کمی آ چکی تھی۔

ایم۔ کام کے بعد آفاق ایک مالیاتی ادارے میں ملازم ہو گیا۔ نسیمہ کو لگتا تھا اس کے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ احساسِ تشکر سے اس کا سر خدا کے حضور جھک جاتا۔ آنکھیں چھلک اٹھتیں۔ ماضی کی یادیں بڑی تلخ بہت دل دکھانے والی سہی مگر آفاق کی قربت نے مرہم کی طرح ان زخموں کو مندمل کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی اصغر کبھی مل جائے تو اسے دکھائے کہ تم تو اسے بے آسرا چھوڑ گئے تھے مگر میں نے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیا۔

آفاق کو ملازمت شروع کئے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ اس کی خواہش پر نسیمہ کو ابا کے زمانے کا مکان کرائے پر اٹھا کر آفاق کے ساتھ کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ ملازمت کے بعد سے آفاق مستقل بضد تھا کہ وہ اب نوکری چھوڑ دے۔

"بس آپا بہت کیا آپ نے، اب آپ کے آرام کے دن آ گئے ہیں۔" وہ اکثر کہتا۔

"بیٹھوں گی، کروں گی آرام، تیری دلہن تو گھر آ جائے۔" نسیمہ مسکرا کر کہتی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی تھک چکی تھی۔

پھر نسیمہ نے آفاق کے لئے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں شمیمہ اور معینہ کی رائے تھی کہ جب تک آفاق شاندار قسم کا گھر نہ بنائے شادی نہ کی جائے۔ مگر نسیمہ کو وقت پر اعتبار نہ رہا تھا اس کے بس میں ہوتا تو اپنے حصے کی تمام خوشیاں ایک لمحے میں جھپٹ لیتی۔

کئی لڑکیاں دیکھنے کے بعد بالآخر اسے معینہ کی بڑی نند کی بیٹی، ارم پسند آئی لیکن ابھی گفت و شنید ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ ایک شام انتہائی غیر متوقع طور پر اونچے ٹھاٹ باٹ والی ایک بیگم اپنے صاحب کے ہمراہ نسیمہ سے ملاقات کا شوق رکھنے کا بہانہ کرتی آفاق کے ساتھ چلی آئیں۔ آفاق نے بڑی سعادت مندی سے سر جھکا رکھا تھا نسیمہ کھٹک کر رہ گئی۔ آفاق نے تعارف کرایا تو اسے پتہ چلا صاحب آفاق کے باس تھے اور تین بیٹیوں کے باپ، جن میں سے دو کو وہ بیاہ چکے تھے۔ دونوں اپنے شوہروں کے ہمراہ یورپ میں مقیم تھیں اب چھوٹی بیٹی باقی تھی۔ چائے کے دوران بیگم صاحبہ بغیر کسی تمہید کے بڑی خوبصورتی سے اپنے مطلب پر آ گئیں۔ پھر جاتے وقت انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ نسیمہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور جب تک نسیمہ نے ان کی دعوت قبول نہ کر لی وہ آگے نہ بڑھیں ان کے جانے کے بعد اس نے آفاق کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دیا اور اپنا سر جھکا لیا اس مسکراہٹ پر تو وہ دل و جان نثار کر سکتی تھی۔

"کیوں یہ بات کیا ہے آخر؟" اس نے آفاق کو گھورا تو وہ ہنس کر اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب بہت اچھے آدمی ہیں آپا!"

"کبھی گھر گئے ہو ان کے؟"

"جی...... کئی بار" وہ شرما رہا تھا۔

"اور مجھ سے چھپائے رکھا" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اوہ...... آپا...... میری پیاری آپا......" اس نے اچانک ہی نسیمہ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جھلا ڈالا اور جس شدت سے اس نے اسے اپنے بازوؤں میں جھلایا اس سے اسے بخوبی اس کے ارادے کا اندازہ ہو گیا۔

چنانچہ نسیمہ کو آفاق کے ہمراہ بیگ صاحب کے ہاں جانا پڑا۔ ان کی بیٹی شیریں بلاشبہ دلنواز تھی۔

سلسلہ آگے بڑھا اور چند ہی دنوں میں منگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تن من سے وہ شادی کے انتظامات میں جت گئی اور بڑے گھر کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے کے لئے اس کے شایانِ شان استقبال کی تیاریوں میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور تو اور اس نے شادی کے موقع پر خود اپنے پہننے کے لئے کسی شاندار اور یادگار جوڑے کی تلاش میں اس مقفل ٹرنک کا منہ بھی کھول دیا جس میں اماں نے برس ہا برس پہلے جب ابا بستر سے نہ لگے تھے اور نسیمہ نوجوانی کی حدود میں داخل ہی ہوئی تھی اس کے لئے جہیز میں دینے کو کوئی جوڑے سی کر اور کئی ان سلے رکھے تھے اس ٹرنک کو اماں نے شمیمہ اور معینہ کی شادی کے موقع پر بھی نہ کھولا تھا شاید انہیں آس تھی ایک نہ ایک دن نسیمہ ضرور دلہن بنے گی اس لئے اس کا حق کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہئے۔ نسیمہ تو دلہن نہ بنی البتہ جب اس کے بیٹے کے دولہا بننے کا وقت آیا تو اس نے یہ مقفل ٹرنک کھول ڈالا

لیکن جب ٹرنک کھلا تو دس گیارہ جوڑوں میں سے اکثر گل چکے تھے باس رکھے اپنے ارمانوں کی طرح رنگ و روپ کھو چکے تھے۔

شیمہ اور معینہ کو اس نے ان کے شوہروں اور بچوں کے ساتھ کئی روز پہلے ہی گھر بلا لیا۔ جس تندہی کے ساتھ انتظامات کر رہی تھی اسے دیکھ کر دیکھنے والے کہتے۔

"شاباش ہے بہن ہو تو ایسی، حق ادا کر دیا۔"

ایسے موقعوں پر اس کی آنکھیں خاموشی سے التجا کرتیں: "خدا کے واسطے اب تو میرا حق مجھے دے دو میں آفاق کی بہن نہیں ماں ہوں۔ آفاق میرا جگر گوشہ ہے میرا لال ہے میری آنکھوں کا نور ہے۔"

مگر لب ہمیشہ کی طرح بے صدا ہی رہے۔

شادی کے موقع پر بڑی چاہت اور ارمانوں سے اس نے ساری رسمیں نبھائیں، بارات کی روانگی سے قبل بہنوں کے آنچل دولہا کے سر پر ڈالنے کی رسم ادا کروائی گئی۔ شیمہ اور معینہ کے گوٹے کناری سے مزین آنچل آفاق کے سر پر لہرا رہے تھے دونوں بہنیں بات بات پر کھلی پڑ رہی تھیں نسیمہ مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی اچانک کسی نے ٹہوکا لگائی۔ "ارے بھئی، بڑی بہن کا آنچل تو ڈالو۔"

"آئیے نسیمہ آپا۔" شیمہ کی دیورانی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"نہیں......" اس نے اپنا آنچل مٹھی میں دبوچ لیا۔

"ہائے تم نہ ڈالو گی بھائی کے سر پہ آنچل۔"

"ارے شمو اور نمو کے پیارے پیارے آنچلوں کے ساتھ میرا روکھا پھیکا آنچل کیا اچھا لگے گا۔" وہ مسکرائی۔

"ہائے یہ رسم بھی تو ادا کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں رسم کیوں نہیں ہو گی۔" وہ آگے بڑھی آفاق کا سہرا ہٹا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے دیتے ہچکیوں سے رو دی۔

"ہائے ماں ہوتیں تو اس موقع پر نثار ہوتیں۔" کسی بڑی بوڑھی نے کہا۔

شیمہ اور معینہ اماں کو یاد کر کے رو دیں۔ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے بھی لگاتار ڈھلکتے چلے گئے آگے بڑھ کر شیمہ اور معینہ کو گلے سے لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں جو ہوں تمہاری ماں۔"

پھر یہی بات کہنے کو وہ آفاق کے نزدیک آئی لیکن ہمیشہ کی طرح بزدلی آڑے آئی۔ الفاظ اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔

بڑے ارمانوں سے اس نے شیریں کو دلہن بنا کر اتارا۔ اس کا بس چلتا تو آفاق اور شیریں کو پلکوں کی مسند پر بٹھا لیتی اور پکار پکار کر دنیا والوں سے کہتی یہ میری ریاضتوں کا ثمر ہیں۔ شادی کے فوری بعد اس نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ اول روز ہی سے اس نے شیریں کا آفاق کی طرح خیال رکھا۔ اس کے آرام کا وہ ہر طرح کا خیال رکھتی شیریں بیٹھ کر گھر کی بیگم تھی بنا دی گئی۔ کئی ماہ گزر گئے لیکن اس کے باوجود اس نے باورچی خانے اور گھر کے دوسرے دھندوں سے کوئی رغبت نہ دکھائی۔ وہ پڑے پڑے آفاق کے جانے...... کے بعد بیدار ہوتی پھر بیٹھے بیٹھے ناشتہ کرتی ناشتے کے بعد اخبار اور رسالوں کا مطالعہ ہوتا پھر یا تو کہیں آنا جانا ہوتا اور نہ مسہری پر پڑی موسیقی سے لطف اندوز ہوتی رہتی نسیمہ کو اس کی یہ ادائیں بھی پیاری لگتیں۔

لیکن اس کے دل کی صداقتوں اور محبتوں سے بے نیاز شیریں کو گھونگھٹ پلٹتے ہی جو چیز اس گھر میں سب سے زیادہ گراں گزری وہ نسیمہ کی آفاق سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے یہ بات کچھ زیادہ پسند نہ آئی کہ اس کی بڑی نند اس کے شوہر سے ماؤں کا سا پیار کرے جلد ہی اس نے منہ بنا کر آفاق سے بلا تردد کہہ دیا۔

"مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تمہاری بہن تمہارے ساتھ ماں کا سا رویہ رکھیں۔ بہن اور ماں میں کچھ فرق ہونا چاہیے، تاکہ رشتے اپنی اصلیت کھو کر کھوٹے نہ نظر آنے لگیں۔ جو بہنیں ماں بننے کی کوشش کریں ان کی محبت محض اداکاری رہ جاتی ہے۔"

آفاق نے دبی زبان سے شیریں کو نسیمہ کی بے لوث قربانیوں کا احوال سنانا چاہا تو وہ اس ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے نخوت سے بولی۔

"مجھے یہ گھر بالکل پسند نہیں یہ تو گھر کم دڑبہ زیادہ لگتا ہے۔"

شروع شروع میں آفاق ہاتھ جوڑ کر منتیں سماجتیں کر کے شیریں کو مناتا رہا سمجھاتا رہا۔ بہن کی دل شکنی کرنے کی ہمت نہ رکھنے کے جواز پیش کرتا رہا۔ اس نے اسے یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ جو کچھ ہے اسی بہن کی بدولت لیکن شیریں کے نزدیک ان تمام جذبوں محبت اور خلوص کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسے نسیمہ سے چڑ سی ہونے لگی۔ اسے نسیمہ کی محبت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ بہت جلد وہ اس گھر اور اس ماحول سے اکتا گئی جو نسیمہ کی بے لوث ممتا سے معمور تھا بڑی خود غرضی سے وہ سوچتی۔

"یہ عورت آفاق کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

آفاق ہر روز دفتر جانے سے قبل حسب معمول نسیمہ کے پاس جاتا اسے خدا حافظ کہتا نسیمہ اس کا ماتھا چومتی اور آیۃ الکرسی کا دم کرتی۔ شیریں اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جل جاتی اس کا دم گھٹنے لگتا۔ حسد کے بوجھ سے اس کے دماغ کی عجیب کیفیت ہو جاتی شریانوں پر دباؤ سا پڑنے لگتا۔ بالآخر ایک روز اس نے انتہائی بدتمیزی سے نسیمہ سے کہہ ہی دیا۔

"میرا خیال ہے آپا، آپ ضرورت سے زیادہ ہی محبت کرتی ہیں ان سے۔"

"ہاں ...... اسی سے کہا، میں ...... تو تم سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔"

"معاف کیجئے گا، میرا تو اس قسم کی بناوٹی اور زبردستی کی محبت سے دم گھٹتا ہے۔"

نسیم اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

پھر ایک روز اس نے بے حد تنک مزاجی سے آفاق سے کہا۔

"آپ کے سارے خاندان والے یہی کہا کرتے ہیں کہ آپ کو جو کچھ ملا، آپ کی بہن نے، کیا آپ میں کوئی ذاتی قابلیت نہیں تھی؟"

"اوہ شیریں ...... ڈارلنگ ...... ذرا آہستہ، کہیں آپا نہ سن لیں۔"

"سن لیں ......" وہ چلائی۔ "میرے کان پک گئے ہیں یہ سنتے سنتے اس گھر میں، میری حیثیت ہی کیا ہے، جو کچھ ہیں آپا جان ...... کیا میرے بابا نے آپ کو ترقی نہیں دلوائی ۔۔؟"

اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ جب نسیم تک پہنچی تو وہ لرز کر رہ گئی ۔۔۔

برس بھر گزر گیا۔

دو برس کے بعد آفاق ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ نسیم کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ منا لمحے بہ لمحہ آفاق کی پیدائش کا عکس محسوس ہوتا۔ برسوں سے سلگتے سینے کی آگ کو اس ننھے سے بچے کو سینے سے لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، لیکن بہت جلد یہ خوشی بھی نسیم کے لئے ایک آزمائش بن گئی۔ کچھ دن تو شیریں برداشت کرتی رہی پھر اس نے، منا سو رہا ہے ڈسٹرب ہوگا ...... ابھی ابھی سویا ہے جیسے بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔ نسیم بچی نہ تھی کہ تیور دیکھ کر سمجھ نہ پاتی مگر دل کی لگی اسے مجبور کر کے شیریں کے کمرے تک لے جاتی۔ شیریں نے اپنے کمرے کا دروازہ زیادہ تر بند رکھنا شروع کر دیا۔ نسیم کتنی ہی بار اس بند دروازے کا رخ کرتی اور کتنی ہی بار مایوس لوٹتی اور جب دروازہ کھلا رہنے لگا تو ایک روز شیریں نے بلا لحاظ کہہ دیا۔

"آپ منے کے منہ پر پیار نہ کیا کریں، بچوں کی جلد بڑی حساس ہوتی ہے۔"

منا نسیم کے بازوؤں میں رو گیا۔ وہ بے بسی سے شیریں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ایک بار پھر پیاسی کی پیاسی!

لیکن اس صلیب پر لٹکنے کے باوجود نسیم رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہوئی اسے خدا جانے کیوں یقین تھا اس کی ریاضتیں اکارت نہیں جائیں گی۔ منا بڑا ہونے لگا اسے دیکھ کر نسیم کو آفاق کا بچپن یاد آتا اس کی نم آنکھوں کے پردوں پر جانے کون کون سی یادیں گھوم جاتیں اور جب بے تابانہ وہ منے کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو شیریں اسے کسی نہ کسی بہانے اس کی گود سے چھین لے جاتی۔

یونہی دل دکھانے والی ان گنت باتیں ہوتی رہیں اور نسیم اس پر کسی نہ کسی طرح آنکھ نہ ڈالتی، تو وہ نصیب ور سرے طوطے ہو کا جس کی کرنیں اس کے ٹھنڈے سترتوں کی پامپر جاکر آئیں گی سب کچھ برداشت کرتی جا رہی تھی۔ ایک سہمی سہمی سی آس جو بچے پاؤں اب تک اس کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ اب بھی کڑی آزمائشوں میں اس کا حوصلہ بڑھاتی۔ آنکھوں میں آنسو زندہ مچھلیوں کی مانند تیر رہے ہوتے، اور وہ سوچتی ۔۔۔

"کبھی تو وہ دن آئے گا جب میں آفاق کو بے خطر اپنا کہہ سکوں گی کسی دن تو اسفر آ کر گواہی دے گا کہ ......"

✽

منے نے چلنا سیکھا ہی تھا کہ بیگ صاحب پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسے۔ ان کے انتقال کے بعد شیریں زیادہ تر میکے ہی میں رہنے لگی۔ آٹھ دس روز بعد وہ ایک آدھ دن کو آتی، پھر چلی جاتی۔ جن دنوں وہ میکے میں ہوتی آفاق بھی شام کو دفتر سے واپسی پر سیدھا ادھر آتا مگر رات وہیں گزارتا۔ نسیم نے شروع شروع دو تین راتیں تو تنہا کاٹ لیں لیکن پھر اس نے دبی زبان سے آفاق سے رات کے وقت گھر آ جانے کو کہا تو پہلے وہ ٹال گیا پھر ہنس کر بولا۔

"آپا منے کے بغیر میرا دل نہیں لگتا آپ نہیں جانتیں، اولاد بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔"

"تیرے بغیر میرا بھی تو دل نہیں لگتا۔" اس کا جی بھر آیا۔

"اوہو آپا ...... آپ تو میرے ساتھ ماؤں والا رویہ رکھتی ہیں۔" وہ جملہ جو شیریں نے خلوتوں میں جانے کتنی مرتبہ آفاق کے ذہن میں ٹھونسا تھا اس نے بڑے بھونڈے پن سے نسیم کے دل پر دے مارا۔

"یہ ...... یہ بات نہیں ہے آفی۔" اس نے یوں گھبرا کر کہا، جیسے راز افشا ہو جانے کا خوف ہو۔

آفاق کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر سسکتی رہی پھر جب جذبات کی شدت میں کمی آئی تو اس نے اپنے آنچل سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا۔

"میں بھی کتنی ناشکری ہوں ......"

"نہیں! ناشکری ...... بدقسمت!" وہ کسی سودائی کی طرح بڑبڑائی۔

شیریں آتی رہی جاتی رہی پھر ایک بار جب شیریں کو میکے گئے اٹھارواں دن تھا منے کی دید کی تڑپ لئے کشاں کشاں شیریں کے میکے پہنچ گئی۔ چھٹی کا دن تھا آفاق گزشتہ شام ہی سے وہاں تھا آفاق کی پیشانی چومنے اور منے کی بلائیں لینے کے بعد جیسے ہی شیریں کی طرف بڑھی تو وہ بڑی نزاکت سے اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

"میں نے بڑی مشکل سے بال سیٹ کئے ہیں۔"

نسیم جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ اس گھر میں جہاں اس کی پذیرائی ہوئی ہر زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ تھا چلتے وقت اس نے دل کے

ہاتھوں مجبور ہو کر پھر بچے کو سینے سے چمٹا کر پیار کیا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔

"اگر اجازت ہو تو میں منے کو ساتھ لے جاؤں کل دفتر سے واپسی پر آفاق ساتھ لیتا آئے گا۔"

"منا بیسٹ کے بغیر کہیں نہیں رہتا۔" شیریں نے بڑے غرور سے کہا۔

"میں بہلا لوں گی اسے۔"

"مات کو کسی صورت نہیں رکے گا یہ۔"

"میں اپنے سینے سے لگا کر سلا لوں گی۔ تم فکر نہ کرو یہ بالکل آرام سے رہے گا۔"

"بچے اپنی ماؤں ہی کے پاس چین سے سوتے ہیں۔" شیریں نے یوں ناک چڑھائی جیسے نسیمہ سے اس کی پشت ہا پشت سے کوئی پرخاش چلی آ رہی ہو۔

نسیمہ نے بے حد آزردگی سے سوچا دنیا میں وہی بدقسمت تھی جس کی آغوش کبھی گرم نہ ہو سکی۔

"اچھے آپا! آپ کو چھوڑ آؤں۔" آفاق یوں اٹھا جیسے وہ جلد از جلد کشیدگی کی اس فضا سے باہر نکلنا چاہتا ہو۔

تنہا خاموش اور ویران در و دیوار کے بیچ نسیمہ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے آفاق نے کہا۔

"آپا! آپ شیریں کی باتوں کا.. خیال نہ کیجئے گا۔"

"اپنے پیاروں کی باتوں کا بھی کبھی برا منایا جاتا ہے۔" وہ زبردستی ہنسی پھر اس نے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صبح چلے جاتے تم۔"

"آپا....... آپ شیریں کے مزاج سے تو واقف ہیں..... اچھا...... خدا حافظ۔" اس نے آخری الفاظ عجلت میں ادا کئے اور چلا گیا۔

رات نسیمہ نے صبح کے انتظار میں گزاری اور صبح سے شام، آفاق کے انتظار میں کی۔ یونہی جانے کتنی صبحیں کتنی شامیں انتظار کے بوجھ تلے دبتی گئیں۔ شیریں اب زیادہ تر میکے ہی میں رہتی۔ آفاق البتہ ان دنوں بھی جب شیریں میکے میں ہوتی ہر شام دفتر سے واپسی پر اس کے پاس ہوتا جاتا۔ نسیمہ کے لئے جینے کا واحد جواز یہی رہ گیا تھا۔

لیکن ایک روز جب کھانے کی میز پر نسیمہ، شیریں اور آفاق کھانا کھانے میں مصروف تھے اور منا دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ آفاق نے سر جھکائے چمچہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپا! شیریں کا خیال ہے ہم لوگ ممی کے ہاں شفٹ ہو جائیں۔"

"کیوں؟" اس کے دل پر گھونسہ سا پڑا۔ بستا پارہ کانپ کر رہ گئی۔

"دراصل ممی تنہا رہ گئی ہیں۔ شیریں کو ان کی بڑی فکر رہتی ہے۔" وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

"اور میری تنہائی....... ؟ میری بے کسی....... ؟ میری بیکراں ویرانی....... ؟" اس کی آنکھوں میں یہ سارے سوال ایک دھندلاہٹ کی مانند تیر گئے۔ ایک دبی دبی سی آہ اس کے لبوں سے نکل کر سسکی فضا میں بڑی آہستگی سے گھل مل گئی۔ اس کا سر جھکنے لگا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ شدتِ جذبات سے حلق رکنے لگا۔ جمالی رنے شترتراتی ہوئی ایک کوشش کی۔

"یہ بھی تو....... تمہارا ہی گھر ہے کیا ہے۔ تب ہی وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی۔"

لیکن اس سے قبل کہ آفاق کچھ کہتا، شیریں نے رعونت سے کہا۔

"آفاق مجھے خانہ بدوشوں کی سی یہ طرز بالکل پسند نہیں۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ آدھا سامان یہاں بکھرا پڑا ہے..... تو آدھا وہاں ہے۔"

نسیمہ کا جھکا ہوا سر اٹھ نہ سکا شاید نصیب کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے اس نے۔

"آپا ہم آتے رہیں گے یہاں بھی کیوں ہے نا شیریں؟" آفاق نے نسیمہ کی آزردگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"وقت ملا تو۔" شیریں نے بڑی خود غرضی سے کہا۔

نسیمہ کو اپنے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شکست خوردہ سی وہ کھانے کی میز پر سے اٹھ گئی۔ رات کو انگاروں پر لوٹتے ہوئے اس نے بے بسی سے سوچا۔

"خدایا میرا گناہ کیا ہے؟ شیریں سے تو میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی، جس سے وہ بدظن ہو جاتی پھر....... پھر....... ایسا کیوں ہے؟"

اب یہ اسے کون بتاتا کہ اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہی تھا کہ وہ آفاق سے اور آفاق کے حوالے سے شیریں اور منے سے بھی ٹوٹ کر بے لوث محبت کرنے کے ڈھب پہ تھی۔

❁

اگلے ہی ہفتے سامان باندھا جانے لگا۔ نسیمہ بے کل بے کل سی گھر کے کونے کونے میں پھرتی رہی جدائی کا تصور محال تھا اس سے پہلے ایسی کڑی آزمائش تو کوئی نہ پڑی تھی۔ آفاق کے لئے اس نے ان گنت راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ اس کی ایک جھلک کی خاطر اس نے دروازوں اور کھڑکیوں میں درزوں اور شگافوں کی تلاش میں کتنی ہی سانسیں روک کے رکھی تھیں کسی ایسے روزنِ دیوار کی تلاش میں جو اسے اس کے جگر گوشے کی ایک جھلک دکھا سکتا وہ اپنے ہی گھر میں راتوں کو چوروں کی طرح دبے پاؤں پھری تھی اس کے رونے کی آواز سن کر اس نے لاکھوں مرتبہ خود کو صلیب پر ٹنگا محسوس کیا تھا مگر جدائی سے قبل وہ ایک رات قیامت بن کر گزر

رہی تھی کہ گئے آنگن میں دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے روتے روتے اور یہ دعا کرتے کرتے کہ یہ رات ستم نہ ہو جدائی کا لمحہ کبھی نہ آئے اس کی زبان خشک ہوئے جا رہی تھی۔

مگر لمحے بڑے جلاد ہیں۔

وہ لمحہ آ کر ہی رہا۔

اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں بدن بے جان، روح زخمی دل کے داغ لالہ کے پھول کو شرما رہے تھے اداس چہرہ اور ویران آنکھیں لئے وہ گھائل ہرنی کی مانند بے قرار اور کسی بیوہ کی طرح سوگوار پھر رہی تھی اور شیریں بے حد سفاکی سے سوچ رہی تھی۔

"بڑھاپا گزارنے کے لئے کسی سہارے کی تلاش میں یہ عورت کس قدر زبردست اداکاری کر رہی ہے بہت ہی اچھا ہوا....... اگر تمی کے کہنے کے مطابق میں نے آفاق کو قابو نہ کیا ہوتا تو وہ کبھی اس جال میں سے نہ نکل سکتے تھے۔"

سامان ٹرک پر لد کر جا چکا تھا۔ شیریں کی تمی گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ نسیم برآمدے میں کسی بیوہ کی مانند سوگوار کھڑی تھی۔ شیریں انتہائی بے مروتی سے منّے کو گود میں لئے اس سے ملے بغیر باہر نکل چکی تھی۔ منّے کی جانب نسیم کے بازو پھیلے کے پھیلے رہ گئے تھے۔

اچانک ۔

وہ مانوس سی چاپ سنائی دی جس پر وہ ہزار بار جنم لے کر ہزار بار فنا ہو سکتی تھی۔

"آپا.......؟" وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

"آ....... آ......." اس نے دیوانہ وار دونوں بازو وا کر دیئے

آفاق کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آ میرے سینے سے لگ جا..... میری زندگی...... میری جان..... میرے لال......" لب بے صدا تھے مگر رُواں رُواں...

مرغِ بسمل کی مانند تڑپ تڑپ کر پکار رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا بھی رہی تھی رو بھی رہی تھی۔ آبدار موتی اس کے دامن کو تر کرتے چلے جا رہے تھے۔

وہ قریب آیا ہی تھا نسیم پہلی اور آخری بار شاید اسے اپنے سینے سے لگانے ہی کو تھی کہ ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔

"اچھا آپا۔۔۔ خدا حافظ........ میں آتا رہوں گا آپ کے پاس۔"

وہ ان آخری لمحوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی بجلی کی سی تیزی سے موہنی کانپتے ہاتھوں کے بیچ اس نے آفاق کا چہرہ تھاما تیس برس سے اپنی ہی آگ میں تپتی ماستا کی تمام تر شدتیں لبوں میں سمیٹ کر اس نے اپنی سچی محبت کی گواہ ایک مہرِ محبت اس کی پیشانی پر ثبت کر دی۔

"آپا......." اس نے متاسف نگاہوں سے نسیم کو دیکھا ان نگاہوں میں اداسی تھی بے بسی تھی مجبوری تھی ۔اب وہ بھی رکی

ہو رہا تھا۔

نسیم نے تھکی تھکی سی نگاہیں کھلے دروازے کی جانب اٹھائیں۔

"کوئی تو ہو جو میری کلائی ہے" اس کا روم روم پکار رہا تھا۔ مگر یہیں جانے والے بھی کہیں آیا کرتے ہیں۔

"بس ایک بار....... ایک بار....... مجھے......"

مگر ہمیشہ کی طرح بزدلی نے اسے آنکھیں دکھائیں زمانے کا خوف عود کر آیا رسوائیوں کے ڈر نے اس کا دامن تھام لیا لیکن آج اس نے طے کر لیا تھا کہ اس کے منہ سے لمحے لمحہ صرف اور صرف ایک بار ماں کا لفظ سننے کے لئے وہ اس کے قدموں میں جھکنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

لیکن اب ہاں اس کے اندر دبکی ہوئی وہ زمانے کے خوف سے سہمی ہوئی ماں اپنی جرأتوں کو مجتمع کر رہی تھی کھلے ہوئے جھونکے سے دروازے کے بیچ بڑے کمرے کی وہ بیٹی آ کھڑی ہوئی جس کے گھر سے آئی ہوئی چمکدار گاڑی پیچھے کھڑی تھی۔ آفاق کا چہرہ نسیم کے رنگے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں جہان بھر کی محبتیں سمٹ آئی تھیں۔

"اب آ بھی چکو آفاق! لگتا ہے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے لیکن اس منظر کو دیکھ کر دیکھنے والوں کا بہن بھائی کے رشتے کے بارے میں بھی بدگمان ہو جانا یقینی ہے۔"

"خدا حافظ آپا......." وہ مڑ گیا اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ امیر باپ کی بیٹی کی اس بات کا کوئی جواب دے سکتا۔

"فی امان اللہ" اس نے ایک اور گھاؤ دل پر کھانے کے بعد بھی قلب کی پہنائیوں سے کہا۔

آفاق جا رہا تھا جاتے جاتے اس نے اپنے پیچھے کھلے دروازے کے پٹ یوں بند کر دیئے جیسے ہمیشہ کے لئے بند کئے جا رہا ہو۔ نسیم بے بسی سے بند دروازے کی سمت دیکھتی رہ گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بند دروازہ کھول دیتی، کھولتی بھی تو کس کے لئے؟ آج تو دل کے دروازوں پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ پورا معبد ہل کر رہ گیا تھا اس مظلوم بچے کی طرح جو بے دردی سے کھلونا چھین لئے جانے پر بلک اٹھے، وہ زخم خوردہ دل جسے غبارِ زمانہ پامال کرتی ہوئی گزر چکی تھی جو ماں ہوتے ہوئے بھی ماں کہلانے کا حق نہ رکھتی تھی بلبلا کر تیسری منزل پر واقع اس فلیٹ کی اس بالکنی کی جانب دوڑی جو سڑک کے رخ پر کھلتی تھی۔ اس بالکنی سے نیچے سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے وہ دیوار سے دیوانہ وار سر ٹکرا کر رو رہی تھی، چمکیلی کار میں بیٹھا اس کا جگر گوشہ جا رہا تھا۔

"خدایا....... خدایا....... یہ مائیں بیٹوں کے جوان ہونے کی دعائیں کیوں مانگتی ہیں؟....... کیوں مانگتی ہیں......؟......"

ماں جب آنکھ میں ٹھہری تھی ماں تھی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی اور اس کے اس سوال پر آسمان بھی ہونٹ سکیڑے رو رہا تھا۔